ہو الکل

یا معین

۷۸۶

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی

کے مشہور مضامین کا مجموعہ

سی پارۂ دل

جنوری سنہ ۱۹۲۵ء میں چوتھی بار چھپا

ملنے کا پتہ

کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی

چوتھی بار قیمت ۱۲؍

نور فائن آرٹ پریس دہلی میں صوفی ٹائٹل چھپا

ناہو جائے۔ اور فنا کو بھی ا[illegible] سے ابد۔ عدم سے نمود۔ نمود سے
عدم۔ جہاں تلاش کریں اُس کا [illegible] و بصیرت کو نظر نہ آئے اے حمد و ستائش
کے قابل خدا۔ تو خود آ۔ تاکہ ہم تیـ[illegible] تیری تعریف اور تیرے رنگ
برنگ کے ناموں کی تعریف۔ تیر[illegible] کاموں کی تعریف۔ او گاڈ! یہ
کے منکروں کا انکار اقرار سے بدل د[illegible] سے دل کو روحانی تسلی کی ایک
مگر وہ بھی نمبر وَن عنایت فرما۔

ہے پربھو پرد شو تم پرم آتما! اگر تو نر[illegible] ن بنا دے۔ نرآکار ہے تو
ہماری موہوم شکلیں بھی مٹا دے سگن بن [illegible] اور اپنی پریم شکتی کو دنیا پر
پرگھٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں تیرے [illegible]۔ اے مکہ کے سیاہ پوش
مکان پر نظر خاص رکھنے والے اے صلیب کی [illegible] پہننے والے۔ اے
ہر دوار کے دوارے پہننے والے۔ تجھ کو ہم یقین دا[illegible] ہے اور کوئی نہیں
تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور جو کچھ ہے۔ کچھ بھی نہیں [illegible] اور ہے۔ تو دیکھتا ہے
مگر ہم بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ تو سنتا ہے مگر ہم بھی سُنانا چاہتے ہیں۔ سن اور دیکھ! آ[illegible]
ڈوب رہی ہیں۔ ارمان جل رہے ہیں۔ ماتم برپا ہے۔ قوجوں کا شور مچ رہا ہے
یہ ملک ہندوستان۔ اس کو تیری امان۔ فساد و خونریزی۔ قحط و بیماری۔ کاہلی و
بیکاری سب آفتوں سے جو زمین کی ہوں یا آسمان کی۔ مشرق کی ہوں یا مغرب کی۔
دین کی ہوں یا دنیا کی۔ حفاظت دے۔

مسلمان بے یار و مددگار مسلمان۔ غریب و لاچار مسلمان۔ کسی زمانے کے تاجدار مسلمان
وہ جو بھوکے سوتے ہیں بھوکے بیدار ہوتے ہیں۔ وہ جو ٹھکرائے جاتے ہیں
رونے والے بھی ہنستے ہیں۔ خدا وہی تیرے پیارے محمد صلعم (ہم اس نام پر فدا ہو جائیں)
یا بیٹے مسلمان آج زمین و آسمان میں انکا کہیں ٹھکانا نہیں۔ نرم غالیچوں سے بیٹے خاک

پچھونے پڑے ہیں۔ مگر اب بھی گردش کو چین نہیں۔ وہ اس سے بھی گئے گزرے
ذلت کے گڑھے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ تو اُن کی حمایت کر۔ صدقہ مدینے کی گلیوں کا
صدقہ اُس خاک کے ذرّوں کا جو تیرے رسول کے قدموں سے پامال ہوئی +

اُے مشکل میں خاطر ثابت والے۔ اپنے دیوانے مستانے صوفیوں کو اپنے
اشارہ چشم سے آمادہ کر کہ وہ اپنے بیکس و بے بس مسلمانوں کی دستگیری کو کھڑے ہو جائیں
پہلے ان کے سلسلوں کو اکٹھا کر تاکہ ان کی قوت مجتمع ہو۔ اور وہ ظاہری مرحلے بھی اسی اجتماع
سے طے کریں۔ جس طرح باطن کے مقامات اجتماع حواس خیالات سے ہوتے ہیں +

الٰہی حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کو گروہ مشائخ کا۔ سچا پکا مخلص خادم
بنا۔ اور اُس کے فرائض کو پختگی سے پورا کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ آج جس میدان میں
قدم ہم نے رکھا ہے اُس کو ایسا بنا دے کہ ہم اور قدم بھی وہاں اُٹھا سکیں اور منزل
پر پہنچ جائیں۔ آمین۔ ثم آمین۔ اور پھر آمین +

آہ! یہ خط

مدت کے بعد خط آیا۔ تسلی بھی۔ تسکین بھی خشم و عتاب بھی۔ زخموں پر مرہم
بھی دیا۔ اور وہاں نمک پاشی بھی کی +

خط! اچھے اچھے حرفوں والے۔ پیارے پیارے مطلب سنانے والے آتی جاتی ہے
تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں۔ کلیجہ پر رکھوں۔ اور دل پر بھی۔ جو
جلتا ہے۔ تو کس کا نامہ ہے۔ تجھ میں کیا لکھا ہے اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ +
قاصد پر نثار۔ کیا ہی اچھا پیام لایا۔ ہاں تو یہ تاکید کر دی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب
ہے۔ ناپاک ہاتھ نہ لگیں۔ دل و جان سے منظور۔ پیارے پیارے کا خط ہے بھلا
اس کی بے ادبی ہو سکتی ہے +

لکھا ہے یہ خط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ ہاں ہاں! کچھ شک نہیں۔ بلا شبہ
نامہ ہے۔ آپ بھی سچے اور آپ کا مکتوب بھی۔ اور وہ قاصد بھی جو پیام لایا۔
آپ کی یاد میں آپ کے انتظار میں۔ از خود رفتہ دیکھ کر اکثر لوگوں نے فرضی خطوط
بنائے۔ اور کہا یہ ان کا ہے۔ جنھیں تم یاد کرتے تھے گو تم کاموں کی تعداد تھی۔ یقین نہ آتا تھا
شاید آپ کو بھی اغیار کی کارستانیوں کی خبر پہونچ گئی۔ جو لکھا کہ اس خط میں شک نہ
کرنا۔ نہیں جناب یہ تاثیر۔ یہ بجلی یہ کشش۔ اوروں میں کہاں تھی۔ دلی یقین کے ساتھ
پڑھوں گا آنکھیں ترس گئی ہیں۔ پتلیاں سیر نہیں ہوتیں۔ اور کہتی ہیں خط! ہم تیری یاد
میں روتے تھے پلکیں آنسوؤں سے بھگوتے تھے۔ تو اب آیا۔ بتا دے کیا تو آیا؟ تو ہمارے
پیارے کا پیارا خط ہے۔ قاصد نے تیرا نام قرآن بتایا ہے۔ دل یہ کہتا ہے کہ تو قرة العین
ہے۔ اب تیرے بھیجنے والے سے مخاطب ہوتا ہوں۔ بندہ نواز! آپ نے جو یہ تحریر فرمایا
کہ ہم نے اپنی امانت آسمان۔ زمین اور پہاڑوں کے پاس رکھنی چاہی تھی۔ مگر سب نے انکار
کیا۔ اور اس بھاری بوجھ کی ذمہ داری سے ڈر گئے۔ اور تو نے اس بار کو اٹھا لیا۔ میں آپ کے
لکھنے سے بہت شکر گزار ہوا۔ اس تحریر سے آپ نے میری قدر بڑھائی۔ اور چشموں میں ممتاز
کیا۔ لیکن یہ محض ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس نازک امتحان میں پورا اترتا
یہ چھیڑ خوانی کا فقرہ خوب فرمایا کہ تو بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ ہاں جناب جو مرضی
میں آئے ارشاد کیجئے۔ آپ کے دلدادہ ہیں۔ سب کچھ سننا پڑے گا ٭
تو کیا ارنشتروں کی امانت بھی دل و جگر میں رکھیں۔ اور پھر آپ کی نرم گرم باتیں بھی سنیں
ہم جاہل سہی۔ ظالم سہی۔ ناعاقبت اندیش سہی۔ پر یہ تو دیکھیے کہ جان پر کھیل گئے اور آپ کا حکم
فرمایش کو نہ ٹالا۔ اتنے بڑے ڈیل ڈول کے آسمان۔ ایسی چوڑی چکلی زمین۔ اور بھاری بھرکم
پہاڑوں نے جس بات سے منہ چھپایا۔ اور حیلہ حوالہ کرنے لگے۔ اس کا برداشت کرنا
ایک مشت خاک سے کیونکر ممکن تھا۔ مگر محض آپ کی رضامندی کی خاطر۔ اس ہولناک

منزل میں قدم رکھ دیا۔ آپ کو خبر بھی ہے؟ آپ کی امانت کے سبب ہم پر کیا گزرتی ہے آپ کی چاہت کا دم بھرنے والے میاں شیطان رات دن چوری کی فکر میں ہیں ہر وقت وہ اور ان کے یار غار خانۂ دل کے گرد منڈلایا کرتے ہیں کہ موقع بنے تو وار کر جائیں۔ اور ہم کو آپ کے سامنے خائن ثابت کر کے شرمندہ کریں +

اس بیرونی طوفان کی حفاظت کے علاوہ ذرا اندرونی مشکلات کا حال بھی سُنیئے آپ کی امانت ہے تو بالکل سربستہ اور سربمہر کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ اور اس میں کیا ہے لیکن عجب طلسمانی پڑیہ ہے۔ جہاں رکھی جائے۔ وہیں ایک طرح کا سوز بے کلی اور اضطراب پیدا کر دیتی ہے۔ اُلجھن ہوتی ہے۔ شہر میں جی گھبراتا ہے جنگل ویرانے میں نکل جانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ دُنیا کی شان و شوکت زیب و زینت۔ عیش و راحت۔ سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ آنکھیں سونا کم کر دیتی ہیں۔ زبان اپنا مزہ بھول جاتی ہے۔ بات چیت میں بھی زیادہ چلنا پسند نہیں کرتی۔ پیٹ مُنہ بھاتی غذائیں نہیں مانگتا۔ جو دے وہ لیتا ہے اور وہ بھی بار بار نہیں کئی کئی وقت کے بعد۔ اپنے بیگانے۔ غیر اور بیگانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنا تن و مَن بے حقیقت و بے کار نظر آنے لگتا ہے۔ تو جناب امانت کیا ہے ایک بلائے بے درماں ہے۔ تاہم ~ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست +

سبحان اللہ۔ آپ کی تحریر کی آن بان کے قربان۔ نوازش کا اظہار ہوتا ہے۔ قہر و غضب کی شان کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ وعدۂ وصل سے ڈھارس بندھائی جاتی ہے تو فرقت و جدائی کی دھمکی بھی ساتھ ملتی ہے۔ جناب! کون کہتا ہے کہ آپ رحیم نہیں۔ کریم نہیں۔ دلنوازی نہیں کرتے۔ چارہ سازی نہیں فرماتے۔ آپ کی ذات سے اس سے بڑھ کر اُمیدیں ہیں۔ لیکن ان دھمکیوں سے کیا حاصل۔ ہم پہلے ہی ڈرتے ہیں اور حضرت کی بے نیازی اور کبریائی سے خوف کھاتے ہیں +

اس خط میں سرکار نے سب کچھ تو لکھا ہے۔ گر یہ نہ بتلایا کہ اب آپ کا دیدار کس دن

میسر آئے گا۔ اس وعدے سے اطمینان نہیں ہوتا کہ عنقریب ہم تم سے ملیں گے۔ وقت بتلایئے منٹ اور ساعت مقرر کیجیئے۔ اور ملاقات کے پروگرام سے آگاہی بخشیئے ایسی گول مول بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہے گا اور ہر وقت انتظار کا سامنا ہوگا۔ جو موت سے زیادہ سخت چیز ہے ؏

برفگن پردہ از رُخ بے محابا　　یکے کن وعدۂ امروز فردا

آ

(از نظام المشائخ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

خوشی بنکر آ غم میں سما کر آ مگر آ عید کے چاند میں آ محرم کے ہلال میں نظر آ چکا ہے جھلک تاریکی میں لہریں لے کر کڑک سے دل ہلا۔ لیکن اے آنے کے قابل آ +

رمضان کے سناٹے میں آیا۔ تراویح کے قرآن کی خوش لحنی میں جلوہ دکھایا۔ افطاری کے وقت تیری مزیدار آہٹ سنائی دی اب بھی آ جس طرح چاہے آ۔ لیکن آ +

کہتے ہیں تو ہر چیز میں سکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آ کے بغیر جو آجائے۔ بلا حرکت متحرک ہو وہ تو ہے۔ تو بس اسی طلسماتی غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا۔ سن آجا۔ سمجھ آجا +

ہم کو وہ دیدار دے۔ جو دیدۂ دیدار طلب کے شایاں ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا۔ طور کو خاک سیاہ بنانے والا نہیں +

ہلالِ عید

آسمان کے کونے میں منہ نکالے ہم کو دیکھ رہا ہے۔ ہم اسکو دیکھ رہے ہیں پارۂ نور ہے جو ہر ماہ کے ختم پر چھپکر نکلتا ہے۔ مگر کبھی آج کی سی خوشی۔ اُمنگ کیفیہ

نہیں ہوئی۔ یہ کیوں ہے؟ کیا تو اس کے پردہ میں اپنی ابرو دکھا رہا ہے۔ ہاں تو ہی ہوگا نہیں۔ تو ہی ہے +

ایسے عالم بے شمار ہیں۔ ایسے فلک لاتعداد ہیں۔ چاند بھی بہت سے ہوں گے اور دیکھنے والے بھی۔ پھر تو کہاں کہاں چشم نمائیاں کرنے جائے گا آ تجھے اپنی آنکھ میں چرا کر۔ چھپا کر رکھ لیں۔ اپنے لیے اور اپنے بیقرار دل کے لیے بڑی سیر ہوگی۔ تو ذرا ہم میں چھپ کے تو دیکھ۔ لوگ تجھے ڈھونڈھتے پھریں گے۔ عرش و کرسی پریشان ہوں گے فرشتوں کو تلاش ہوگی۔ دوسری دنیا کے باشندے عید کی بہار چھوڑ کر تیری جستجو کی سرگردانی میں پھنس جائیں گے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہماری آنکھ کا خانہ چھوٹا ہے۔ اس میں تیری گنجایش نہ نکلے گی۔ نہیں دریا حباب میں آ سکتا ہے۔ انجن کی وہ بھاپ جو ریل کی لمبی قطار کو کھینچ کرلے جاتی ہے اور خود انجن کی حرکت اس کے دم سے ہے۔ کہاں رہتی ہے؟ انجن کے ایک چھوٹے سے ظرف میں +

اچھا یوں نہیں تو پھول کی خوشبو کی طرح دل کے گل میں سما جا۔ یہ مدلل مطالبہ قبول کر

چاند رات

چاند تو چھپ گیا مگر چاند رات موجود ہے۔ ہر طرف اندھیرا۔ اور وہی رات جو روز آیا کرتی ہے۔ پھر یہ چہل پہل۔ گہما گہمی کیسی؟ ہو نہ ہو یہاں بھی تیرے گیسوؤں کی شرکت ہے۔ بیشک۔ یہی بات ہے۔ قسم لے لے۔ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ +

صبح عید

آنکھ کھلنے سے پہلے۔ سورج نکلنے کے اول افکار کو شکست ہوئی۔ اسرار نے سرور کے کپڑے پہن لیے۔ اور فتحیابی کا جشن تیار ہوگیا عید گاہ میں چھوٹے بڑے۔ اچھے

بڑے سب تیرے لیے جمع ہوئے ہیں۔ کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں۔ جھک کر دیکھتے ہیں۔ اور عاجز ہو کر سر خاک پر رکھ دیتے ہیں۔ اب تو آجا اور گلے مل جا۔

سُنا تھا کہ تو دلوں میں رہتا ہے۔ اس لیے ہر شخص سینے سے سینہ ملا کر معانقہ کرتا ہے کہ شاید کسی دل میں تو مل جائے۔ مگر تو کیوں حجاب کرتا ہے اور ملنے سے گریز کرتا ہے آج کے دن بھی نہ ملا تو کب ملیگا۔

دیکھ آ۔ اب صبر نہیں ہو سکتا۔ دامن قرار ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ تو نے کہا تھا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔ سو تجھ ہی سے مانگتے ہیں اور تجھ ہی کو مانگتے ہیں۔

وعدہ پورا کر اور آ۔ یہ عید ہے۔ وعید کا خیال چھوڑ دے۔ اگر آج تو من جائے تو ہماری عید بھی من جائے گی۔

دُعائے بیقراری

اور

دلِ آشفتہ کی بکا و زاری

رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۰ ہجری کی اکیسویں تاریخ کو منزل گاہ حلقۃ المشائخ میں امیر المؤمنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا سالانہ عرس تھا۔ یہ دعا چند گرم فقروں کے اضافہ کے ساتھ اسی موقع پر خواجہ صاحب مدظلہ نے پڑھی تھی:۔

الٰہی تجھ سے کیونکر مانگیں۔ دل کو قرار نہیں طبیعت کو یکسوئی نہیں۔ زبان میں گویائی نہیں پہلے قرار دے۔ اطمینان عطا فرما۔ بولنے اور مانگنے کی طاقت مرحمت کر تا کہ کہیں سانس کی خبر

آس کی خبر۔ اور اُس کی خبر جس کی دم شماری کا وقت آگیا۔ دل کی حرکت بند ہو جائے تو انسانی مشین رُک جائے۔ مگر ایسی حرکت سے بچا جو درجۂ اختلاج کو پہونچ گئی ہے جب دل ذرا صحت پر آئیگا تو پکارینگے اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّنَا۔ اے پروردگار۔ اے ہر جگہ حاضر! آج کی رات کا صدقہ۔ ہماری دُعا کو سُن۔ یہ وہ شب ہے جس میں تیرے شیر۔ تیری تیغ اور تیرے کلمہ علی مرتضیٰؑ کی یادگاری کا سالانہ جلسہ منانے کے لیئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں۔ برادر رسولؐ۔ زوج بتولؑ۔ پدر فرزندان ملول۔ رموز و اسرار کے خرقہ پوش۔ عیب کے رازوں کے پردہ دار۔ حیدر کرار۔ شہسوار کارزار۔ آن داتا۔ مَن داتا۔ تجھ پر سلام اور اس برکت والی روح پر سلام۔ جس کے وسیلے سے دُنیا کی اس شب تار میں خدائے برتر سے دل و جان کا اُجالا مانگا جاتا ہے ۔

اللہ میاں! تم دیکھتے ہو۔ بجلیوں کی روشنیوں سے آنکھوں پر۔ انجن کی چیخوں اور توپ کی گرجوں سے کانوں پر۔ الحادی فلسفہ کی دلیلوں سے عقل و حواس پر حملے ہوئے ہیں۔ نور علوی کو ظاہر کر۔ تاکہ برقی رو ماند ہو۔ حیدری نعرے کو بلندی دے۔ جس سے عارضی آوازیں پست ہوں۔ علوم ربانی کے باب کھول۔ جو عقل و حواس اپنی ہستی کو بچائیں۔ آمین اے رب العٰلمین آمین۔ اے قبول کر سکنے والے! یہ کون ہے جو پوچھتا ہے کہ علی مرتضیٰ کی روح یہاں کہاں؟ جس پر سلام بھیجتے ہو۔ بے تار کے برقی اشارات کی طاقت کو نہیں دیکھا۔ اس آلہ سے بڑھ کر ہم کو ہنر یاد ہے۔ ہم جو چاہیں کہیں اور اُن کو سنائیں۔

اے بیکسوں اور لاچاروں کی پناہ! ہماری مرادوں کو پورا کرنے والے! ہم کو اپنے در کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکا۔ معاش کی طلب میں دردر کی ٹھوکریں نہ کھانے دے۔ اپنے غیب کے خزانے سے رزق عنایت کر۔ بے اولادوں کو ایسے فرزند مرحمت فرما جو دین اسلام کے سپوت ہوں ۔

خداوندا! اہل دہلی۔ حاضرین مجلس۔ اور حلقۂ نظام المشائخ کے تمام ممبران کی دلی مرادیں

پوری کر۔ خاصکران کے مقاصد برلا۔ جنھوں نے حلقہ کے دُعا خانہ میں اپنی مختلف ضروریات کے لیے دُعا کی خواستگاریاں بھیجی ہیں۔ الٰہی ان سب کے ارمان برآئیں۔ جو اس حلقے اور دُعا خانے اور اس قسم کی مجالس کے معین و مددگار ہیں +

اور مجھ موجود بے وجود کو بھی توفیق دے کہ زمانہ کے فیشن اور نمایشی نفاق آمیز اعمال سے محفوظ رہوں۔ جو کچھ کہوں وہی کروں اور تیری رضا کی حد سے آگے نہ بڑھ جاؤں

بھگت کے بس میں آ بھگوان

(از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء)

یا رحمٰن یا سبحٰن

تیری سمرن چیتوں۔ آگے سیس دھروں۔ کیسے بھگتی کروں۔

اے بھگوان۔ اے سبحٰن اے رحمٰن

موسےٰ کے زمانہ کا چرواہا ہوتا۔ تجھ کو اپنے گھر بلاتا۔ پاؤں دباتا۔ سر دھلاتا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پلاتا۔ تو سوتا تو پنکھا جھلتا۔ تو سُنتا تو گانا گاتا۔ روتا۔ رُلاتا۔ جاتا تو روکتا۔ پیروں پڑتا۔ ہاتھ جوڑتا +

داتا تو کہاں ہے۔ میرے من کی بپتا کے دیکھن ہار۔ مولی۔ مولی۔ سُن۔ الجھنوں میں ہوں۔ گردشوں میں ہوں۔ بیقراری دیکھ۔ آہ و زاری دیکھ۔ اشکباری بھی +

آنسو دے۔ اُن میں نہاؤں۔ سوزش دے۔ تڑپوں۔ لوٹوں۔ تجھ کو پاؤں۔ بلال رضؓ کا دل دیدے۔ در آستان پر سر ٹکراؤں۔ عزت تجھ سے ہے۔ ذلت تجھ سے ہے۔ میرے پربھو بھگوان۔ اپنے بھگت کے بس میں آجا۔ دے جا۔ دلا جا +

یہ رات کیونکر کٹے۔ تریا دا آتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو درشن دے۔ روپ دکھا۔ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بہو کشش۔ اور من سنتوش ہو۔ کس کا بلقان۔ کیسا ایران۔ تیری رحمت کا چشمہ اور اُس میں اشنان۔ اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری بدلی کالی۔ رستہ بھاری۔ دشمن سر پر غفلت دل میں۔ ہاتھ پکڑ کر بھگوان۔ میں قربان۔ تجھ کو دیکھوں۔ اور نہ دیکھوں کوئی۔ سب ہوں گم۔ تو ہے گر تم +

شوکت والے۔ طاقت والے۔ توپوں اور سنگینوں والے۔ زخموں ور مرہم والے دکھ کے کرتا۔ سکھ سروپ۔ تیرے بھوکے۔ تیرے پیاسے۔ یہ ہے اچھا۔ تو ہو پاس + پھول بھی تو خار بھی تیرا۔ نور بھی تو۔ نار بھی تیری۔ آنکھیں میری۔ سب کچھ تیرا۔ اور زمین کے اندر ڈیرا تیرا۔ بس میں آ بھگوان +

سر ہے حاضر۔ کھینچے کٹاری۔ عشق کی اگنی چتا ہماری۔ ست پکاریں۔ ست بنجائیں جڑ کو تیاگیں۔ کل ہو جائیں۔ یثرب پہونچیں مکہ دیکھیں۔ بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں۔ مہدی بابو گونجیں گرجیں۔ اُن کے آگے چالکہ کڑکیں۔ تیر چلیں سب سینوں پر دشمن چھدے سنگینوں پر +

تو ہو بس میں۔ سب ہوں بس میں۔ حسن نظامی کس کا بندہ؟ وقت کٹھن ہے اٹکا پھندا۔ بھگتی اپنی من کو دے۔ بھارت سیوا سب کو دے۔ بس میں آ بھگوان + تیرے نام کے بنام یَا ذِی الْعِزَّۃِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْاِکْرَامِ ط ۵

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میرا ہو جائے　　گورسے ملکوں کے اُجالا میں اندھیرا ہو جائے

حروف کی دُعا

(اخبار توحید مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۱۳ء)

الف تو آگے بڑھ اور کن کہنے والے داتا کے سامنے ہمارا وکیل بن۔ کیونکہ تو ہی

ایک و یکتا ہے۔ نقطہ و پہلو سے پاک ہے اور ہمارا مخاطب خدا بھی وحدہٗ لاشریک اور غیریت سے پاکیزہ ہے ◆

مولیٰ ہم حروف ہیں۔ تیرے معانی کی امانت سینوں میں رکھتے ہیں۔ تو نے ہم کو ازل کے مخفی قلم سے پیدا کیا ہے اور ہمارے اجسام کو وہ روح دی ہے۔ کہ ظاہر میں بے حس و حرکت و بے جان نظر آتے ہیں مگر درحقیقت زندہ ہیں اور جو ہم کو نظر غور سے دیکھے تو اوسکو بھی زندہ کر دیتے ہیں ◆

تو نے ہمکو وہ زبان دی ہے جو خاص تیری بول چال میں کام آتی ہے۔ یعنی یہ کہ بغیر بولے اور بغیر لب ہلائے بات ادا ہو جاتی ہے اور دوسرے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ انسان روزمرہ کتابوں، اخباروں اور خطوط میں ہماری باتیں سُنتا ہے۔ مطلب سمجھتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ یہ کیا بھید ہے۔ کہ حروف منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن جہاں آنکھ کے سامنے آئے اور خود بخود ان کا مطلب ذہن میں آنے لگا۔ کانوں کو انکی آواز سُنائی نہیں دی۔ مگر دل و دماغ میں ان حروف کا مطلب چلا گیا ◆

خدایا ایسے آدمی پیدا کر، جو ہمارے پر اسرار وجود کا اصلی مطالعہ کریں۔ اور ہمارے ذریعہ تو ان کو ملجائے۔ اور جب تیرا ان کا وصال ہو تو اس خوشی میں ہماری مراد بھی پُوری فرما اور وہ یہ ہے کہ ہم کو نا اہل لوگوں کے قلم سے بچا۔ اپنے نافرمانوں کے قبضے میں نہ دے جو ہمکو تیرے وجود واحد کے انکار میں استعمال کریں ◆

پروردگار! ہم عربی حروف ہوں یا سنسکرت۔ انگریزی ہوں یا فارسی۔ چینی ہوں یا جاپانی اس لیے ہیں کہ ہم سے تیری وحدت کے مضامین لکھے جائیں۔ نہ کہ تیری دشمنی اور مخالفت کی تحریریں ہمارے پرزوں سے تیار ہوں ◆

آؤ حروفِ اخبار توحید کے قرطاسِ ابدی پر صف آرا ہوں عین کی توپ سے غین پر گولہ باری کریں۔ تاکہ غیر فنا ہو جائے۔ اور وحدت کو مقام بقا حاصل ہو۔ آمین ربنا ثم آمین ◆

موسمی دعائیں

(۱)

(از اخبار توحید مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۱۳ء)

تیرے نام سے شروع۔ اے رحمت شفقت والے سب آدمیوں اور سب کے پالنے والے۔ اے سب کے بادشاہ اے سب کے معبود پراگندہ دل کے وسوسوں اور شریر خناس کے پھندوں سے محفوظ رکھ۔ جو گمراہ کرنے کے لیے بہکاتے رہتے ہیں ٭

جی بے کل ہے۔ اس کو کل دے۔ آنکھیں خشک ہیں۔ ان کو اپنی محبت کے آنسو مرحمت فرما۔ خوش قول بنا۔ خوش عمل بنا۔ خوش وقت بنا۔ دشمن زیر ہوں۔ حاسد خوار ہوں۔ بدخواہوں کو رسوائی ہو۔ آزار دہندے زار و نزار رہیں۔ آمین ربنا آمین ٭

پاک روزی عنایت کر۔ وہ مشکلیں دور ہوں جو کسب حلال میں حارج ہیں غیب کے خزانے کھول۔ جن کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہے ان کو ہمارا بنا دے۔ آمین ربنا آمین ٭

عزت و آبرو مرحمت کر۔ اپنے سوا کسی کے آگے جھکنے نہ دے۔ مذہب۔ ملک۔ قوم خاندان سب کی لاج رکھ۔ ذلت و رسوائی سے بچا۔ آمین ربنا آمین ٭

بے گھروں کو گھر دے۔ بے زروں کو زر دے۔ شادیاں ہوں، خانہ آبادیاں ہوں، میاں بیویوں میں میل جول ہو۔ امن ہو۔ سکھ ہو۔ چین ہو۔ سب گھر بہشت بن جائیں بے اولادوں کو اولاد دے۔ نہ بجھنے والا چراغ دے۔ ماؤں کی گودیں بھر دیں۔ سنسان ویرانوں میں نیک بچوں کی رونقیں ہوں۔ آمین ربنا آمین ٭

بیماروں کو صحت ہو۔ بلائیں دور ہوں۔ وبائیں دور ہوں۔ آہ کے بدلے واہ ہو۔ غم کے بستر تہ ہو جائیں۔ درد والم کافور ہوں۔ آمین ربنا آمین ٭

مقدموں میں کامیابیاں ہوں۔ حق فتح پائے۔ بے گناہوں کو قید سے رہائی ہو۔ ٹل جائے

اگر ناگہانی آئی ہو۔ آمین ربنا آمین ⊕

(۲)

(از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء)

رَبَّنَا رَبَّنَا رَبَّنَا

نافرمان بندوں کے معبود۔ بیکسوں کے سہارے۔ لاچاروں کے چارہ کار پروردگار یہ ہاتھ تیرے آگے پھیلے ہیں۔ یہ کچھ اُمید سے دراز ہوئے ہیں۔ ان کو تجھ پر ناز ہے۔ کیونکہ تو بندہ نواز ہے۔ ان ہاتھوں کی خطا نہ تھی جو تیرے سوا غیروں کے دروازے پر دستک دیتے رہے۔ قصور نفس کا تھا۔ جو بھٹک کر دربدر کی ٹھوکریں کھلاتا پھرا۔ اب تیرا دروازہ مل گیا ہے۔ آستانہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے شرمندہ سر کی لاج رکھ لے۔ یہ پیشانی تیرے سرکش بندے کی ہے جو عاجزی سے خاک پر پڑی ہوئی ہے ⊕

رحم کرنے والے خطاپوش داتا۔ ہم تیرے ہیں۔ تو ہمارا ہے۔ تجھ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں ⊕

طاعون نے۔ قحط نے۔ مفلسی نے خود غرضی اور ریاکاری نے جھوٹی عزتوں کی حرص و ہوس نے۔ تیرے بندوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ اپنی رحمت کی کمند میں اسیر کرلے اپنے کرم کے حصار میں بچالے ⊕

صدقہ ان گیسوؤں والے حجازی کا۔ جس کی یاد و اللیل کے پیارے لفظ میں کی جاتی ہے۔ صدقہ اس نورانی مکھڑے کا۔ جسکو والضحیٰ کا خطاب عطا ہوا۔ اسکا طفیل جو بے قرار سمندر کے کنارے مستغرق پہاڑوں کے بیچ میں۔ یثرب کی خوش نصیب زمین پر بجلی اوڑھے تیرے نام کی منادی کرنے آیا تھا۔ اُس پتھر کا صدقہ جو تیری محبت میں سات دن کے بھوکے پیاسے پیٹ پر باندھا گیا۔ واسطہ ان چھالوں کا جو بنت رسولؐ کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے پڑے۔ وسیلہ اُس پیاسے حلقوم کا جو کربلا کی تپتی زمین پر ستم کی چھری سے

کٹ گیا۔ اور ان تلواروں کا جو تیرا نام بلند کرنے کو اُٹھائی گئیں۔ ان گھوڑوں کا جو تیرے دشمنوں کی صفوں میں ہنہناتے ہوئے۔ ٹاپیں مارتے ہوئے۔ کٹ برساتے ہوئے گھس گئے حرم حجاز کا صدقہ۔ مدینے کے در و دیوار کا صدقہ۔ سُبکیاں بھرنے والے ستون کا صدقہ اور اس پیار کا صدقہ جس سے فراق زدہ لکڑی کو تسلی دی گئی۔ اس ممبر کا صدقہ۔ جہاں تیرا مزمل تھا۔ تیرا مُدثر تھا۔ اُس ہریالے گنبد کا صدقہ۔ جو تیری شمع سراج منیر کا فانوس ہے۔ اُن جالیوں کا صدقہ جن کے اندر کچھ ہے۔ آہ کچھ ہے۔

فریاد ہے مولا۔ دوہائی ہے مولا۔ دیدے مولا۔ اپنا بنا لے۔ ایک کر دے۔ اور نیک کر دے۔ آمین۔ اللھم آمین۔ ثم آمین۔ بیماروں کو شفا۔ بے اولادوں کو اولاد۔ بے روزگاروں کو روزگار۔ بے قراروں کو قرار۔ امتحان دینے والوں کو کامیابی۔ مقدمہ والوں کو فتحیابی۔ مقروضوں کی سبکدوشی۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

(۳۳)

از اخبار توحید مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء

غریبوں کے دردمند خدا! ہم کو خس کی ٹٹی اور تہ خانہ کی ٹھنڈک درکار نہیں ہے اپنی رحمت کی خنکی مرحمت کر اور گرمی کے موسم کی بلاؤں سے بچا۔ گرم زمین کی حرارت سے ہمارے دماغ کو محفوظ رکھ۔ جب ہم تیری دی ہوئی روزی کمانے کے لیے اور بال بچوں کو پالنے کے واسطے دھوپ میں چلتے پھرتے ہیں۔ لُو سے۔ سرسام سے۔ اور گرمی کے کل آلام سے حفاظت دے۔

علی گڑھ کالج کی پیچیدگیاں دور ہوں۔ حاجی نواب سکرٹری دلیری و حقانیت سے کارگزاریاں دکھائے۔

ندوۃ العلماء کا انجام بخیر ہو۔ موجودہ خلفشار آسانی سے رفع ہو جائے۔ علم دین کا بول بالا رہے۔

ہندو مسلمانوں کی تازہ کوشش اتحاد میں برکت ہو۔ دونوں کے دلوں کو خلوص عطا فرما۔ ذات کی رنجشیں اور خود غرضیاں بیچ میں نہ آنے دے۔ لارڈ ہارڈنگ کی سلامتی ہو۔ انکو توفیق دے کہ ہندوستان میں عدل و انصاف برقرار رکھیں۔ گوروں کالوں کو برابر سمجھیں۔ اخباری دُنیا میں اتفاق دے۔ ہر ایک کو حادثہ ناگہانی سے بچائے رکھ۔ اور اپنے فضل کا سایہ ڈال تاکہ وہ حقیقی صداقت سے تیرے بندوں کی خدمت کریں +

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ +

آنسو بھری آنکھ کی اِلتجا

از اخبار توحید میرٹھ مؤرخہ ۸ رجون ۱۹۱۳ء

میرے مالک۔ پچھلی رات ہے۔ سب سوتے ہیں۔ تُو جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں۔ تو سامنے کے آسمان میں ہے۔ یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سن۔ صبح کا نور چمکنے سے پہلے۔ تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر۔ پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل میری مراد مجھ کو دے +

یہ سامنے تیرے اجمیری پیارے کا سفید گنبد ہے اس کے کلس پر اپنا دیدار دکھا اسکو طور بنا۔ مجھ کو موسوی بصیرت دے۔ اور تو جلوہ افروز ہو۔ آنسو کا پردہ تیار ہے۔ اور کوئی نہ دیکھنے پائے گا۔ چپکے سے اس کے اندر آجا۔ تاکہ تجھ کو اپنی بپتا سناؤں۔ کلیجہ کے زخم کھول کر دکھاؤں +

دن بھر ان بے قراروں کی دید میں گزر گیا۔ جو اجمیری وسیلہ گاہ میں تجھ کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ایک کہتا تھا۔ الٰہی قرض کے بوجھ نے پیس ڈالا۔ اپنے خواجہ کے صدقے میرے بازو ہلکے کر۔ دوسرے کی فریاد تھی۔ مصائب ناگہانی بلا نے گھیر لیا۔ خواجہ کے ہاتھ سے

اس آفت کو دور فرما۔ تیسرے کی فریاد تھی۔ گود خالی ہے۔ گھر بے چراغ ہے۔ اولاد کے لیے جی ترستا ہے۔ ارمان کا باغ اُجاڑ ہوا جاتا ہے۔ خواجہ کے وسیلے میرا دامن بھر دے۔ چوتھا مرض جسمانی میں مبتلا تھا۔ روضۂ خواجہ سے سر ٹکراتا تھا۔ اس کی بھی سمجھ سے آس تھی اور خواجہ کے در کی ڈھارس پاس تھی۔ پانچواں رزق کا بھوکا۔ ہاتھ خالی۔ پیٹ خالی۔ خواجہ کے دروازہ پر تجھ کو پکارتا تھا۔ اور روٹی کا ٹکڑا مانگتا تھا چھٹا آتشِ عشق میں جلتا۔ آہِ شرربار کھینچتا۔ غلافِ خواجہ پر مایوسانہ ہاتھ مارتا تھا۔ کیونکہ اسکو بھی یقین تھا کہ غلاف کے اندر تیرے پاس جانے کا راستہ ہے۔ اور تیرے پاس جاکر شربتِ وصل کا جام میسر آسکتا ہے ؛

ساتواں کچھ اور کہتا تھا۔ دیوانہ تھا مستانہ تھا۔ کائنات اور ہستی موجودات کے معمہ کو اور اس کے گورکھ دھندے کو ناوانی کی انگلیوں سے سلجھا کر اُلجھا رہا تھا۔ اور خبر نہیں کیا بڑبڑا تھا ؛

اتنے نظاروں سے تھکی ماندی۔ اپنی عاجز بندی۔ چشم اشکبار کی التجا پر رحم کر دے اور ان سب کی مرادوں کے ساتھ جن کا ذکر اوپر آیا۔ میری درخواست بھی پوری فرما دے ؛

جھولی والے فقیر کی بھیک

از نظام المشائخ۔ اگست سنہ ۱۹۱۳ء

تُو ہی جانتا ہے۔ رمضان میں کون سی رات ہزار راتوں کی برابر ہے۔ کس کو تو نے خطاب قدر عطا فرمایا ہے۔ مجھ کو۔ ہزار۔ لاکھ۔ یا سو۔ پچاس سے غرض نہیں۔ میں اس کی بھی پروا نہیں کرتا کہ وہ رات خطاب یافتہ ہے یا نہیں ہے۔ اس کا شوق بھی نہیں کہ شبِ ملائکہ اور روحوں کی ملاقات والی شب میسر آسکے ؛

میں تو اے بڑی اور اونچی چوکھٹ والے بادشاہ تجھ کو مانگتا ہوں۔ تیری آرزو میں سرِ شام سے نہیں سویا۔ چاہے تو رمضان میں مل یا شوال میں۔ رمضان کے عشرۂ آخرہ میں جلوہ افروز ہو یا پچ کی اور کسی رات میں۔ مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں ہر حال میں راضی برضا ہوں۔

قربان اس دروازے کے جس پر چشم لاہوت کو ہاہوتی نوشتہ نظر آتا ہے۔ دل کہتا ہے میں جبروتی ہوں۔ روح کہتی ہے میں ملکوتی ہوں۔ ہاتھوں کا اصرار ہے کہ ہم ناسوتی ہیں تو کیوں نہ اس دروازے کے راز کو عالم ناسوت میں فاش کر دیں۔ کب تک اقلیم ہاہوت پردۂ خفا میں رہے گی۔

مگر نہیں میرے باپ۔ میرے امام میرے مرشدِ اوّل۔ سیدنا علی۔ سلام علیہ نے تو وعدہ کر لیا تھا کہ راز کو مخفی رکھوں گا تو مجھ کو بھی یہ رمز ظاہر نہ کرنی چاہیئے۔ اچھا تو اے وہ جس کے پاس جانے کے لیے ہاہوت جیسے گم اور گم کرنے والے دروازے سے گذرنا پڑتا ہے۔ دُور سے میری آواز سُن۔ میں ناسوت کے عالم خواہشات میں ہوں۔ وہیں سے پکارتا ہوں پانچ پردوں کی دوری ہے۔ مگر جانتا ہوں کہ تو وہاں بھی سُن لیتا ہے۔ ناسوت میں ہوں۔ اس کے بعد ملکوت ہے۔ پھر جبروت ہے۔ پھر لاہوت ہے۔ پھر ہاہوت کا دروازہ ہے۔ مگر تو سب میں ہے۔ اول بھی آخر بھی۔ لاہوت میں بھی۔ ناسوت میں بھی۔ پس تو میری سُن میں اپنے سر کو تیری چوکھٹ پر جھکاتا ہوں۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ یہ میرے دونوں ہاتھ کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ تو بخشش و کشایش کے دروازے کو کھول جب تو دیتا ہے اور دے سکتا ہے تو مجھ کو دے۔ جب تیرے ہاں کسی بات کی کمی نہیں تو میرے لیے دیر کیوں ہے۔ دستِ رحمت بلند کر۔ اور بندۂ فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دے۔ یہ جھولی والا فقیر گھر بہ گھر نہیں جاتا۔ اسی دروازہ پر آتا ہے۔ اسی پر آیا ہے۔ اسی پر آتا رہیگا۔ کسی نے کہا وہ نوالہ دینے کے بہانے سے اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھا دیتا ہے۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

آمد بروں زخانہ چہ آواز ما شنید　　　بخشیدن نوالہ گدا را۔ بہانہ ساخت

تو یہ بھکاری بندہ بھی صدا لگاتا ہے۔ بھیک کا ٹکڑا مانگتا ہے۔ دروازے کے فقیر کو یا یوں کہ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ کا خیال رکھ۔ اور میری جھولی میں خیرات ڈالنے کے لیے دروازہ پر آجا۔ تاکہ میں رمضان کے روزے۔ تراویح۔ نوافل۔ شب بیداریاں۔ غرض تمام نیکیاں جو میں نے اور تیرے سب بندوں نے کی ہیں تجھ پر قربان کر کے پھینک دوں آ اور پھر تیرے قدموں کو پکڑ لوں۔ اگر وہ نہوں اور یقیناً نہیں ہیں۔ کیونکہ تو اعضائے جسمانی سے پاک ہے۔ تو اپنے خیال و تصور سے تیرے مثالی پاؤں بناؤں۔ اُن کو چوموں۔ ان پر سر ٹکاؤں۔ آنکھیں ملوں اور جب تک تو میری جھولی نہ بھرے اُن قدموں کو نہ چھوڑوں۔

رمضان کے روزہ دار فقیر کی آواز سن جو کہتا ہے:۔

میری جھولی بھر دے　　میرا چنبل بھر دے

تیری جنت کی خیر　　اس کی فرحت کی خیر　　شاخِ طوبےٰ کی خیر　　حور جمرا کی خیر

ٹھنڈی نہروں کی خیر　　اُجلی لہروں کی خیر　　تیرے جلوے کی خیر　　دید میلے کی خیر

میری جھولی بھر دے　　میرا چنبل بھر دے

تیری دوزخ آباد　　اُس کا برزخ آباد　　طوق بھاری آباد　　شعلے ناری آباد

قہر و خفگی آباد　　طیش و ترشی آباد　　گرز و ہنٹر آباد　　دُکھ کے سنٹر آباد

میری جھولی بھر دے　　میرا چنبل بھر دے

تیری کرسی رہے　　اُس کی بستی رہے　　عرشِ اعظم رہے　　حکمِ محکم رہے

لوحِ مخفی رہے　　نقش ہستی رہے　　نورِ نیتر رہے　　شانِ اختر رہے

میری جھولی بھر دے　　میرا چنبل بھر دے

تیرے دریا بہیں　　موجیں بھر جا اُٹھیں　　کوہ و جنگل رہیں　　چیپکے دنگل لگیں

مرنے والے مریں　　جینے والے جئیں　　عقل والے رہیں　　بھولے بھالے ہریں

میری جھولی بھر دے میرا چنچل بھر دے

شنا! تیرا فقیر بندہ تیری ہر چیز کی سلامتی چاہتا ہے۔ خیر و شر۔ نور و ظلمت قہر و رحم کا یکساں خیر طلب ہے تو تو بھی اس پر مہربان ہو۔ اور اس کی خالی جھولی میں ایک غیبی ٹکڑا ڈال دے +

فلک پر

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۳ء

جسکو حد نظر کہتے ہیں۔ میں نے ایک مست کی متوالی آنکھ دیکھی۔ ستارے سکوت سازی تھے۔ مگر وہ بے پروائی۔ مدہوشی۔ خود فراموشی کے عالم میں آسمان کے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی +

میں نہیں کہہ سکتا۔ اس آنکھ کو کس کی تلاش تھی۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ اس میں خمار و مستی تھی یا کچھ اور تھا +

فلک کی کھڑکی کھلی۔ ایک فرشتہ نے گردن نکالی۔ اور آنکھ سے کہا کا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ۔ کا حکم نہیں سنا۔ نشہ باز کا یہاں کام نہیں۔ زمین کے میخانے میں جا اور جام کی لال روح کو دیکھ۔ چشم دیدار طلب نے ملکوتی ہستی کے فرمان کی پروانہ کی اور لڑکھڑاتی ہوئی آسمان کے اندر گھس گئی +

فرشتے اس بے ادب۔ گستاخ۔ اور دیوانی آنکھ کے داخلہ سے گھبرا گئے۔ انہوں نے غل مچایا۔ اور کہا۔ تو اس مقدس اور پاکیزہ مقام پر بھی فتنہ فساد برپا کرنے آگئی۔ خدا سے ہم نے کہا تھا۔ آدم کو خلیفہ نہ بنا۔ جو تیری با امن زمین پر خونریزی کرے گا۔ مگر اس نے آدم کی کلیت سے ہم کو قائل کر دیا۔ وہ جو کچھ تھا زمین کے لیے تھا۔ اس کی خلافت تجھ کو مبارک مگر آسمان ہمارا ہے۔ ہم کو عبادت کرنے دے۔ اپنی آوارگی کو یہاں مت پھیلا +

عین فرشتوں کی پورش میں ایک غیبی صدا پیدا ہوئی۔ جس سے کہا آنے دو مت روکو۔ یہ میری ہے۔ میں اس کا ہوں۔ اسکے بعد ایک تجلی نمودار ہوئی۔ فرشتے کانپ کر سجدے میں گر پڑے۔ مگر انھوں نے گرتے گرتے دیکھا وہ تجلی آنکھ کے پردے میں سما گئی۔ آنکھ نے اپنے دونوں غلافوں کو کھینچا۔ اور پردے بند کر لیے۔ پھر دیکھا تو نہ فلک تھا نہ زمین نہ فرشتے۔ نہ کچھ اور۔ یہ آنکھ اور اس کے اندر چھپی ہوئی تجلی کے سوا سب نابود ہو گئے۔ میں نے کہا کیا فنا و بقا اسی کا نام ہے +

قدرت میرے ہاتھ میں

از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۳ء

گنہگار، خطاؤں کی پوٹ۔ ابن آدم۔ خاک کا پُتلا۔ میں ایک بشر ہوں۔ تم بھی جانتے ہو۔ میں بھی جانتا ہوں کہ کس قدر قصور میری ہستی سے نمودار ہوئے۔ تم نے مجھ کو آزمایا میں نے تمکو دیکھا۔ ایک بار نہیں ہزار دفعہ محبت کے رشتہ کو کتنی مرتبہ خفقان کی چھری سے کاٹا۔ گو وہ نہ کٹ سکا مگر زخمی ضرور ہوا +

میرے خیالات۔ میرے حالات۔ میرا ظاہر۔ میرا باطن۔ تم سے پوشیدہ نہیں۔ جو عیاں تھا وہ بھی تم کو معلوم۔ جو مخفی تھا اُس سے بھی تم خبردار۔ برسوں کیجائی رہی۔ آنکھ کی۔ کان کی۔ ہاتھ کی۔ پاؤں کی۔ زبان اور ہونٹ کی۔ اور خبر نہیں کس کس کی +

مگر تم نے دیکھ بھال کر قول دیا۔ جان بوجھکر پیمانِ وفا باندھا۔ اور کہا۔ میں تیرا ہو کر رہونگا اور اپنا بنا کر رکھوں گا۔ یہ کہکر طاقت اور قدرت کی کنجیاں میرے حوالے کر دیں اپنا سب کچھ سونپ دیا +

میں نے یہ دیکھکر گرد و پیش کے تعلقات توڑ ڈالے۔ تمہاری زنجیر سے ہاتھ پاؤں اور دل کے گلے کو باندھ لیا۔ تمہاری یاد کو بقائے زندگانی کا ذریعہ ٹھیرایا۔ تمہاری طاعت

و فرماں پذیری کے آگے جھک گیا۔ جو کہا وہ کیا۔ جدھر لے گئے اُسی سمت چلتا رہا +
کچھ یاد ہے وہ اندھیری راتیں۔ جن میں مَیں جاگتا تھا۔ اور تم کو جگاتا تھا۔ اور وہ گرمی
کے دن۔ جبکہ میں تمہاری خاطر اپنے جسم کو پسینہ میں ڈبوتا تھا۔ وہ سردی کے سناٹے۔
جن میں تمہاری مدارات کی جاتی تھی +

تم کہتے تھے آہا یہ کیسے اچھے دن ہیں۔ مَیں کہتا۔ ہاں میاں یہ زمانہ ہر ایک کو نصیب
نہیں ہوتا۔ تم مجھ پر فدا تھے۔ مَیں تم پر نثار تھا۔ آسمانی آبادی رشک کرتی تھی۔ بازوؤں
کے فرشتے نیکی بدی کے علاوہ ایک تیسری چیز درج رجسٹر کرتے تھے +

اسی زمانہ میں جبکہ میں نے سمندر کی یورش سے نجات پائی۔ تم نے کہا۔ آدمی
میں تیری یاد میں بے چین تھا۔ تو کہاں تھا۔ تو آگیا؟

اب کیا ہوا جو تم مجھ سے بیزار ہو۔ اگر خطا داری اور غلط کاری باعث حجاب ہے۔ تو
یہ پہلے بھی تھی۔ کہہ چکا ہوں کہ تم نے آزما لیا تھا۔ اور خصلت و عادت کو پہچان گئے تھے
اب تم مجھ سے بچتے ہو۔ بہانہ کرکے ٹالتے ہو ظاہر داری کی رسموں سے بہلاتے
ہو۔ اُسکو؟ جو تمہاری دی ہوئی قوت عرفان سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جو باوجود
سیہ کاری و عصیاں آبی کے زبردست طاقت ہوش و دانش کی رکھتا ہے +

آج اگر تم ناقص۔ اور تمہاری شان کو نہ سمجھنے والی ہستی کو اپنا بناتے ہو۔ اور تاج
حکمرانی اِن کے سر پر رکھتے ہو۔ آج اگر تم کو یہ خیال ہے کہ قدیمی رشتہ توڑنے سے
منظر کائنات کی نمایش بڑھ جائے گی تو مَیں ادب سے کہوں گا کہ انصاف کا خون ہو جائیگا۔
اور لطف رعنائی و کبریائی ہاتھ سے جاتا رہے گا +

یاد تمہاری ہے۔ اس کو سامنے لاکر سوچو۔ قدرت تم مجھ کو دے چکے ہو۔ میں ہجوم اندوہ
میں اپنے ہاتھ کی قدرت کو گردش دوں گا۔ اور ناقص العقل ہستی کو خاک و خون میں ملا دونگا
پھر نہ کہنا کہ وفاداری و دلداری کے خلاف کیا۔ میرا دل پک گیا ہے۔ میرا جگر دُکھ گیا ہے

(۲)

مسلمان ہوں جس پر نعمتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔ حجازی ہوں جس کی دلجوئی کا قول ہار چکے ہو۔ مستِ الست ہوں جس کے "بلیٰ" کو قرآن میں شایع کر چکے ہو۔ وہ وجود ہوں جس کی پشت پر مہر اسرار کے نشان ہیں۔ منکر اور ناشناس دوزخیوں کو مجھپر مسلط نہ کرو۔ اپنی فرقت کی آگ میں مت جلاؤ۔ رقابت کی آتش میں نہ ڈالو۔ کوئی قصور ہوا ہو تو چشم کرم کو پھیر لو۔ اس میں کام تمام ہوجائے گا۔ دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ نگاہِ قہر کی کارسازیاں ہیں۔ مگر قہر اپنی ذات تک محدود رکھو۔ تمہاری رحیم سرکار ہے۔ پھر ایک نہ ایک دن ملائمت کی توقع ہوسکتی ہے۔ ان خود غرض بندۂ حرص و ہوس اجسام۔ ان نمودئے اور فراموش کار افراد کے پالے نہ ڈالو۔ جنھوں نے تمہارے دلدادہ کو جوتیوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور اجازت دو کہ میں بھی انتظام کے لیے باہر آؤں۔ اور اس خس و خاشاک کو نابود و فنا کرکے دکھاؤں کہ تمہاری دی ہوئی قدرت میرے ہاتھ میں ہے۔

کعبہ والے خدا کو کیونکر پاؤں؟

از رسالہ خدام کعبہ جون ۱۹۱۴ء

میں اُسکو چاہتا ہوں۔ میرا جی اُسپر آگیا ہے۔ اُس کی یاد مجھ کو ستاتی ہے۔ دید مانگتا ہوں۔ ایک نظر ڈالنے کی ہوس ہے۔

وہ کہاں ہے۔ کس طرح دستیاب ہوتا ہے۔ ہر چیز کوشش سے مل جاتی ہے ہر چمن نے پڑھتے پڑھتے بی۔ اے۔ پاس کر لیا۔ لال خاں کو مرغبازی کا ہنر آگیا۔ انجن دہلی سے دوڑا تھا کلکتہ پہنچ گیا۔ گنگا ہردوار سے بہی تھی بہتے بہتے سمندر میں جا گری۔ سورج طلوع ہوا تو اُس نے ہر سوتے کو جگا دیا۔ چاند غروب ہوا تو تارے چمک گئے۔

میری بیٹی حور بانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کر لیا بکانے والی نے آٹا گوندھا تھا۔ اب روٹی پکا رہی ہے۔ مگر میں اُسکو کعبہ کی کالی چادر میں۔ مدینے کے سبز غلاف میں۔ اجمیر کے صندل میں۔ دہلی کے نظام الدین میں۔ نماز کے سجدے میں بیوہ کی آہ سرد میں۔ یتیم کی چشم تر میں مظلوم کی مایوسی میں ظالم کی خود فروشی میں ڈھونڈ چکا ہر دروازہ کی کنڈی بجا چکا۔ آنسو بھی بہائے۔ ہاتھ بھی پھیلائے۔ لیکن اُس کا دامن نصیب نہ ہوا میں نیا گرفتار نہیں ہوں۔ میری اسیری پُرانی ہے۔ مگر اب بھی مجھ کو فریاد کرنی نہیں آتی۔ اُس کی ناز برداریاں نہیں جانتا۔ کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اُسے کیونکر پاؤں ؛

اِدھر جُھک۔ سُن۔ بتانے والا بتاتا ہے۔ زخم کھول۔ مرہم کا پاہا خود سامنے آتا ہے تیری تلاش ادھوری تھی۔ تیری جستجو کا رُخ بے رُخ تھا۔ وہ کعبے کی چادر میں منہ چھپائے موجود تھا۔ وہ مدینے کے سبز غلاف پر صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے تجھ کو اجمیری صندل میں خوشبو بنکر۔ اور دہلی کے نظام الدین میں سُلطان المشائخ ہوکر پکارا مگر تیرے کان میں سائنس و فلسفہ اور نئے زمانہ کے ہوا و ہوس نے پردے ڈال رکھے تھے۔ تو اُس کی آواز بے صوت کو کیونکر سُنتا ؛

اور سُن۔ علی مرتضےٰ نے کیا آواز دی۔ کہ ارادہ کی شکست میں اُسکی شکل نظر آتی ہے ہربرٹ سپنسر نے کتاب لکھی۔ اور ہر چیز کا فلسفہ بتا دیا۔ مگر چھپنے کا وقت آیا تو ناگہانی اُفتاد سے مسودہ غائب ہوگیا۔ اُس وقت اس نے کہا۔ کہ یہ کون تھا جس نے میرے ارادے اور یقینی کوشش کو جلدی پورا ہونے سے روک دیا۔ کیا یہ امر اتفاقی تھا؟ اگر اتفاقی بات تھی تو مسودہ پریس میں دستیاب ہونے کے بعد پھر کیوں گم ہوگیا۔ کیا اتفاقات کو میرے ساتھ ضد ہے۔ شاید اس میں کوئی بھید ہے۔ ممکن ہے اسکا اختیار کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہو۔ وہ کون ہے؟ کیا خلقت اسی کو خدا کہتی ہے ؛

اگر یہ سچ ہے تو میں اُسے کیونکر پاؤں۔ ایسی طوائف کو دیکھ۔ عمر بھی چھوٹی۔ صورت بھی

انوکھی۔ لباس بھی طرحدار۔ آواز بھی قیامت گانے کا ڈھنگ بھی بے نظیر۔ مگر اسکو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ مجرے کے لیے کوئی نہیں بُلاتا۔ نویلی جان طوائف۔ کالی۔ بھونڈی۔ چالیس برس کی عمر۔ پھٹی ہوئی آواز۔ ناچنا آئے نہ گانا۔ لیکن ہر شخص کی زبان پر اس کا چرچا ہے۔ یہ اثر اور بے اثری کس نے پیدا کی۔ کیا اُس نے جسکو خدا کہتے ہیں۔ اگر بات یوں ہی ہے تو سمجھ کہ خدا اِن ہی موقعوں پر پہچانا جاتا ہے۔

اُستاد شبّو کا قصہ بھول گیا۔ خون کے مقدمے میں گرفتار تھے۔ ثبوت پُورا تھا قانون پھانسی پر لٹکانے کے لیے آستین چڑھا چکا تھا۔ ہزاروں روپیہ روز لینے والا وکیل قلم ہاتھ سے رکھ کر چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُستاد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کہ جج صاحب نے حکم دیا۔ شبّو خاں تم بری کیے جاتے ہو۔

ختم خواجگان چشت پڑھوایا تھا۔ ان کا زیادہ بھروسہ اسی پر تھا۔ گو وکیلوں کے محنتانہ میں دس ہزار خرچ ہوا۔ لیکن ان کا دل یہ کہتا تھا کہ یہ اکسو ایک روپیہ جو ختم خواجگان چشت میں خرچ ہوا یہی اصل اور مفید خرچ ہے۔

اگر یہ بات درست ہے تو خدا اسی توکل اور بھروسہ کے اندر تھا۔ اور سب ظاہری اسباب کو شکست دے کر ختم خواجگان میں نمودار ہونے والا وہی تھا۔ تو چاہتا ہے تو اِس طرح اُس کو تلاش کر۔

چودھری سنگھ کا دس لاکھ روپیہ کیوں تباہ ہو رہا تھا۔ قانون کے ہاتھوں دستاویز کی تحریر کی بدولت وہ کس طرح مایوس ہو گئے تھے۔ رشوت خوار حاکم کو ۷ ہزار روپیہ دینے کو تیار تھے۔ مگر آیت کریمہ کے ایک عمل نے جس میں صرف اٹھ روپے صرف ہوئے انکی جائداد کو بچا لیا۔ ان کو حیرت تھی کہ غیبی ہاتھ کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اسکا تو انہیں گمان بھی نہ تھا۔ لیکن قرآن نے انکی حیرت کو یہ سُنا کر دور کیا کہ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔ جو خدا پر بھروسا کر لیتا ہے تو وہ اس کا حامی بنجاتا ہے۔ اور ایسی صورتوں سے مشکلیں آسان کرتا

ہے جس کا اسکو وہم وگمان بھی نہ ہو۔ بس تو بھی ان ہی کرشموں میں اسکو ڈھونڈا کر۔

ارمان والی اصغری۔ دولت والی اصغری اولاد کے لیے بھڑک گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اور حکیموں کے علاج میں پورا اکیس ہزار روپے پانی کی طرح بہا چکی تھی۔ مگر کیا ہاتھ آیا۔ حسرت و مایوسی۔

اور سورۂ مزمل کے وظیفہ میں کیا خرچ ہوا۔ صرف اکیس روپے۔ اور نتیجہ کیا پیدا ہوا۔ چاند سی صورت کا بیٹا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے میرا اس پر ایمان ہے۔ اس گوشۂ تنہائی میں جہاں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ یہی شغل رہتا ہے۔ مگر یہ سب میرے درد کی دوا نہیں ہیں خون کے مقدمہ سے رہائی۔ دولت کی کمائی اور بچے کی ہوائی نہیں چاہتا۔

میرے دل میں ایک اور درد ہے۔ میری آنکھ کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اسکو پانے کا خواستگار ہوں۔ اور علانیہ دید کا طلبگار ہوں۔ جس کو خدا کہتے ہیں۔ جو رب کعبہ کہلاتا ہے۔ ابابیلوں سے ہوائی جہازوں اور کنکروں سے توپ کے گولوں کا کام لیتا ہے۔ جو اپنے نام کے گھر بنواتا ہے۔ انکی عزت و حرمت کراتا ہو مگر سکونت مکانی سے انکار کر[illegible]

وہ جس نے کشمیر کے گلزار پہاڑوں شملے کے خنک آبشاروں۔ سوئزرلینڈ کے سہانے نظاروں کو چھوڑ کر حجاز کے سوکھے جلتے بلتے کوہستان کو اپنی پسندیدگی کا نشیمن بنایا۔ اور پروانہ بھجوایا۔ قرآنی گزٹ میں چھپوایا کہ ساری خدائی میں ایک دفعہ میرے ہر ہمت و طاقت والے شیفتہ پر اس مقام کی دید فرض ہے۔ میں اسکو مانگتا ہوں جو عرب کی کھجوروں کانٹے دار بیریوں۔ اونٹوں کے کجاوں کو آم کی ٹہنیوں گلاب کی شاخوں اور موٹروں پر ترجیح دیتا ہے

جس نے اپنے نام کی قسموں کو رب کعبہ کے لفظ سے نامزد کیا ہے۔ جس کا اشارہ ہے کہ سب خدا کار کعبہ کے رخ مجھ کو دیکھیں اور سر جھکائیں۔

بس میں اسی کو۔ بالکل ٹھیک اسی کو پوچھتا ہوں کہ وہ کیونکر ملے۔

طائر سبز فام کا پیام

(از رسالۂ اسوۂ حسنہ میرٹھ بابت اگست ۱۹۱۴ء)

ذکر اسی شب برات کا ہے۔ جبکہ پہلے آسمان پر وہ جلوہ افروز تھا جسکو خدا کہتے ہیں۔ آسمان پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ فرشتے اپنی نوکریوں پر سر بسجدہ اور پا بقیام حاضر تھے۔ چاند کی شمع جل رہی تھی۔ تاروں کے فانوس جگمگا رہے تھے۔ زہرہ گنگناتی تھی اور نغمہ بجاتی تھی۔ مشتری وجد کرتا تھا۔ عطارد سال بھر کی تقدیروں کے نوشتے پیش کر رہا تھا۔ مریخ تلوار کھینچے کھڑا تھا۔

تختِ رب العالمین ظہورِ ذات سبحانی کی مستی میں جھوم رہا تھا۔ میں نے دیکھا ایک سبز پرندہ دستِ قدرت پر بیٹھا ہے اور مخلوق پناہ رب سے کچھ کہہ رہا ہے قدرت کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر شفقت سے پھر رہا ہے۔ اور بار بار اُس پرند کی منقار سرخ کو بوسے دیے جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک زمردیں قفس لایا گیا جس کے اندر موتیوں کا جھولا پڑا ہوا تھا۔ جانور پھدک کر اس پنجرے کے اندر چلا گیا اور قفس کی تیلیوں میں سے چونچ نکال کر مستانی صدا میں کچھ اور گانے لگا۔ غیب کے ہونٹ پھر بڑھے۔ اور فریادی پرند کی چونچ کو چوم کر اس کا پنجرہ ایک موجود وجود کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ موجود وجود پنجرا ہاتھ میں لیے ہوئے۔ ہوا میں تیرتا۔ فراٹے بھرتا دم کے دم میں زمین پر آ گیا۔

یہ بمبئی میں داؤد یہودی کا گھر تھا۔ جہاں حسن نظامی کا خاکستانی پیکر جلووں کی دید کے لیے آنکھیں مانگ رہا تھا۔ آج شب برات ہے۔ میں بصیرت مانگتا ہوں۔ یہ لال

پرلڑی کا پنجرا نہیں مانگتا۔ آپ کی بھی عجیب دین ہے۔ بھوکے کو کپڑا دیتے ہو اور ننگے کو روٹی۔ اندھے کو کان دیتے ہو۔ اور بہرے کو آنکھیں +

صاحب نیلی آنکھ کا طلبگار ہوں۔ اور البیلے یار کا خواستگار ہوں۔ یہ جانور کسی بچے کو بخشیے۔ یا کھلونا کسی نادان کے حوالے فرمائیے +

چینی کی رکابی میں بنے ہوئے پھولوں کو کیا کروں۔ رنگ روپ بھی ہے دوام قرار بھی ہے۔ مگر نیچرل ادائیں نہیں۔ نہ وہ گل اندامی کی مہک ہے۔ طلائی نقرائی گلدانوں کے گلدستے مجھ کو منظور نہیں۔ یا یہ گل پودا درکار ہے۔ جو اپنے بھروسا اور اپنے پاؤں کا سہارا رہے کھجور کے درخت میں آم نہ لگا۔ انگور کی شاخ میں کریلے نہ پھیلا +

وجود موجود! قرن ہست کے فرد! تو کیا جانے عبد و معبود کے کلمہ کلام کو۔ نابود ہو جا۔ اور اس جوہرستانی پنجرے کے سامنے سے ہٹ جا +

وجود موجود نے ایک ہلکی سی جنبش کی اور اپنی نامفہوم صدا میں کہا:۔

معدوم ہستی نما آدم! آج کی رات لین دین اور جزا و سزا کی رات ہے۔ اجسام و ارواح الفاظ و معانی۔ بندہ خدا کی یکجائی کی رات ہے۔ ہر طلب کی حقیقت مجاز کا لباس پہنتی ہے۔ آج دربار سے جسکو جو کچھ ملتا ہے اس کی خواہشوں کا مجسمہ ہے۔ تو جو اکڑتا ہے الٹی سیدھی باتیں بنا کر اپنا کوئی ممتاز مطالبہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ غور کر کہ یہ جانور اور یہ پنجرا تیری ہی خواہشوں کا برزخ ہے۔ تیرے ہی مطالبات کا ہیولی ہے +

بصیرت کیوں مانگتا ہے؟ کس کی دید کا طلبگار ہے۔ دیکھ کر اس قفس میں سب کچھ موجود ہے۔ یہ طائر سبز فام طریق حیات کا خضر ہے۔ اور عطائے ربانی کا مجازی برزخ ہے۔ جس طرح تیری دعا اس زبان سے تھی جو اصلی حسن نظامی کی نہیں۔ تیری طلب اس دل سے تھی جو حقیقی حسن نظامی سے خارج ہے۔ تیرے ارادے اس دماغ سے تھے۔ جو واقعی حسن نظامی سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا اسکا جواب۔ اس کا عوض۔ اس کا تبادلہ

بھی اس صورت میں ہوا۔ جو تیری آنکھوں کو اجنبی اور غیر نظر آتا ہے ؎

وجود موجود کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ طائر سبز فام نے اپنی شیریں نوا بولی کو اُردو زبان میں آمیز کر کے یوں دُرافشانی شروع کی ؎

پہلے ثابت کر کہ تو ہی حسن نظامی ہے۔ پھر دیکھ کہ میں ٹھیک تیرا ہی مطالبہ ہوں۔ یا کچھ اور۔ ارے نادان۔ یہ سارا جہان وہ نہیں ہے جو تو دیکھتا ہے۔ وہ نہیں ہے جس کا تصور تیرے ظلماتی ذہن میں آتا ہے۔ یہ شکلیں حیوان و انسان کی۔ یہ صورتیں شجر و حجر کی دیکھنے میں کچھ اور ہیں اور حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ ایسے ہی ان اجسام کی ارواح کے جذبات و خیالات اپنے اندر باہر کی جو شکلیں بناتے ہیں وہ سب بے معنی اور مہمل ہوتی ہیں۔

اوّل تو مسلمانوں کی قوم کو دیکھ۔ پھر دوسری قوموں پر نظر ڈال۔ بلندی و پستی عروج و زوال۔ شہ زوری و بے چارگی۔ سرکشی و بے بسی کے دو کارخانے دکھائی دینگے۔ جو ایک دوسرے کے بالکل برخلاف کام کر رہے ہیں۔ جب ایک فریق بلند ہوتا ہے تو جان لے کہ اس نے خود اپنی بلندی کو بلند نہیں پایا۔ دوسرے اسکو بلند سمجھتے ہیں۔ اسکو رات دن اپنی پستی کا تصور رہتا ہے۔ جو عروج میں ہیں۔ ان کو اپنی حالت زوال پر نظر آتی ہے۔ شہ زور کو ہمیشہ اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ سرکش دوسروں کو مرعوب کر لیتا ہے۔ تو خود اپنے نفس سے بھی مرعوب رہتا ہے۔ اور اپنی کم طاقتی کا صدمہ سہتا ہے ؎

لیکن میں جس کے پاس آتا ہوں۔ اسکو چند روز میں منتہائے مقصود کی اصلیت بتا دیتا ہوں۔ سمجھا دیتا ہوں۔ بلکہ آنکھوں سے دکھا کر ذہن و دماغ پر نقش کر دیتا ہوں ؎

دیکھ میں مدینہ کے گنبد خضرا برج سبز کا برزخ ناسوتی ہوں۔ میری منقار سرخ کے آگے گردن جھکا جس کو پروردگار کے لب بے لب نے چوما۔ اور میرے ہر بول کی صدا۔ اور میری ہر حرکت پر قدم اُٹھائے چلا جا کہ یہی میرا اسوۂ حسنہ ہے۔ اور اسی کے اندر تو اپنے سب مطالبات مشاہدہ کرے گا۔ اور پائے گا ؎

تُو ہی ہے اَے خُدا

(از اسوۂ حسنہ۔ اگست ۱۹۱۴ء)

لوہے کے قلم کو لال نیلے آنسو دینے والے۔ لوہے کی توپ کو آگ کی آہ بخشنے والے تو ہی ہے جس کے نام سے ہر چیز شروع ہوتی ہے جس کے پَرتَو سے بڑھتی پھلتی ہے۔ اور جس کے اشارہ سے نابود و فنا ہو جاتی ہے۔

ہر صورت دوسری شکل سے نرالی ہے۔ یہ تیرے شجر قدرت کی ایک معمولی سی ڈالی ہے آدمی آدمی سے جدا۔ جانور جانور سے جدا۔ درخت درخت سے علیحدہ۔ پہاڑ ہے تو ہر ایک اپنی صورت میں سب پہاڑوں سے الگ۔ دریا ہے تو وہ بھی اپنے رنگ اور وضع قطع میں دوسرے دریاؤں سے انوکھا۔ ذرہ ذرہ میں فرق و امتیاز ہے۔ واہ مولیٰ تیرا کیا راز و نیاز ہے۔

بولیاں رنگ برنگ کی بنائی ہیں، اور ہر بولی میں اپنی شانیں چھپائی ہیں۔ حرفوں کو عجیب عجیب وضع کے کپڑے پہنائے ہیں۔ کسی سے کہا اوپر سے نیچے آؤ۔ کسی کو حکم ملا دائیں سے بائیں کو چلو۔ کوئی بائیں سے دائیں کو ہانکا جاتا ہے۔ کسی کا نام عربی رکھا ہے کسی کو چینی کہا ہے۔ کوئی ہندی ہے۔ کوئی انگریزی ہے۔ غرض عجب ہنگامہ رنگارنگی اختلاف ہے اور پھر ہر جگہ مطلب ایک صاف صاف ہے۔

آسٹریا کا بڈھا بادشاہ معلم الملکوت بنکر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی خونریزی کے لیے تلوار میان سے کھینچتا ہے تو پہلے تیرا نام لیتا ہے۔ دلی کا ناتوان گدا الفت آمیزی کے واسطے قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو پہلے تیرا نام لے کر زبان کھولتا ہے۔

میں کب تک کہوں تو ہی تو ہے۔ تو کب تک سنے تو ہی تو ہے۔ کہنے اور سننے سنانے کا

وقت ہو چکا۔ اب فعل اور عمل میں جلوہ افروز ہو۔ اس پرانی لفظی حمد و ثنا کے عوض نئی معنوی تعریفیں حاصل کر۔

ذرا تو ہی دیکھ۔ کیسی چوڑی چکلی۔ صاف ستھری سڑکیں آدمیوں نے بنائی ہیں۔ جگہ جگہ سنگی پھرہ دار کھڑے کر دیے ہیں جو راستہ چلنے والے کو بتاتے ہیں کہ کتنا راستہ طے کیا اور کتنا باقی ہے۔ کچی سڑکیں ہیں۔ لوہے تک کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ مگر بتا کہ تجھ تک کونسی سڑک جاتی ہے۔ تیرا پتہ کس پتھر پر لکھا ہے۔

سمندر کہتے ہیں۔ ان کی موجوں اور کف آلود جوش و خروش میں تیرا نشان ہے۔ کنارے آواز دیتے ہیں ہماری بیچارگی و افتادگی میں تیری شان نہاں ہے۔ آہ سینہ سے نکلتی ہے تو کہتی ہوئی چلی جاتی ہے کہ اس خلجان کے اندر تو ہی ہے۔ واہ زبان پر آتی ہے تو تیرا نعرہ مارتی سنی جاتی ہے۔

روئی دھنیئے کے ہاں پاش پاش ہو جاتی ہے، اور تیرا گیت گاتی جاتی ہے، لوہا آگ میں تپتا ہتھوڑوں سے کٹتا پٹتا ہے۔ مگر تیری سرمدی صوت اور تیری ابدی صورت کو فراموش نہیں کرتا۔

اسلیئے خدایا تو نے رحمۃ للعلمین کا لقب کس بشر کو دیا ہے۔ وہ سورج ہے۔ چاند ہے، تارا ہے۔ یا مٹی کا دیا ہے۔ سراجؐ منیر کس کی شان میں فرمایا ہے۔ اس روشن چراغ تک ذرا ہم کو بھی پہونچا دے۔ ہم بھی اپنے بجھتے ہوئے چراغوں کو اس سے روشن کر لیں۔ وہ چاند۔ سورج تارا نہیں مٹی کا چراغ ہے۔ مگر دوسروں میں اپنی روشنی ڈال سکتا ہے اسلیئے ان سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ ہم اسکو چاہتے ہیں جس کی زلفیں اندھیرے رات کی طرح کالی تھیں جس کا چہرہ صبح کی نورانی روشنی کی مثل منور تھا۔ وہ جو خلق عظیم کا درجہ لے کر اس دنیا میں آیا تھا جس نے عیش و راحت تیرے نام پر لٹایا تھا۔ وہ جو میدانوں میں تلوار کھینچکر نعرۂ حق بلند کرتا تھا۔ برچھیوں کو بہادروں کے سینے پر مارتا تھا۔ تیروں کو چٹکی بجاتے دل و جگر میں اتار دیتا تھا۔ وہ جو خود چٹائی پر بیٹھتا تھا اور دوسروں کو شاہانہ تخت دیتا تھا۔ وہ جو کمبل کا کرتہ پہنتا تھا اور اپنے غلاموں کو

سلطانی دنیا میں بخشتا تھا۔ جو کا آٹا کھاتا تھا۔ اور ہمارے لیئے پلاؤ قورمے پکوا کر رکھتا جاتا تھا۔ وہ جو راتوں کو جاگا اور ہمارے لیئے پاؤں پھیلا کر سونے کا سامان کر گیا۔ وہ جو تیرے آگے آنسو بہاتا تھا کہ میری اُمت کو بخش دے۔ وہ جو بیماروں کی مزاج پرسی کو خود ان کے گھروں پر جاتا۔ گھر والوں کے ساتھ ہو کر گھر کا کام کرتا۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ یہانتک کہ اپنی جوتی خود ہی گانٹھ لیتا تھا اپنے کپڑوں میں آپ ہی پیوند لگا لیتا تھا۔ اسکو تو نے ہمارا آقا و مولیٰ بنایا ہے۔ اسواسطے ہمارا جی اسپر آیا ہے۔ ہم کو اجازت دے کہ اس کا ذکر ادب سے کریں۔ ادھر کہیں کہ وہ جو لڑکوں تک کو پہلے خود سلام کرتے تھے۔ غریبوں مسکینوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے مفلس و بیمار کو حقیر نہ جانتے تھے۔ لاچار بیوہ عورتوں کے سودے بازار سے خرید کر اور اپنے کندھے پر رکھ کر لاتے تھے۔ جنھوں نے کام کے وقت کبھی اسکی پرواہ نہ کی کہ دور جانے کے لیے سواری موجود ہے یا نہیں۔ اکثر پیدل پابرہنہ سر برہنہ چلے جاتے تھے۔ دینی لڑائی کے سوا کسی پر وار کرنے کی پہل نہ کرتے تھے اپنے صحاب میں اس طرح مل جلکر بیٹھتے تھے کہ اجنبی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ حضور کون سے ہیں۔ وہ جو لیٹنے کے لیے بچھونے کا انتظار نہ کرتے تھے۔ اگر بچھونا نہ ہوتا تو بے تکلف زمین پر لیٹ رہتے تھے

تو ہی اسکے خدا اس حبیب کا رستہ بتا۔ اس کا اسوہ حسنہ دکھا۔ تاکہ ہم سب تیری کھینچی ہوئی لکیر کے فقیر بنیں اور ہماری رفتار تیرے اور تیرے بھیجے ہوئے رسول کی رفتار گفتار و کردار پر ہو۔"

دنیا جہان کے حالات معلوم کریں تو سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کا ارشاد سامنے ہو۔ علمی چرچے ہوں تو طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ کو سامنے لائیں صنعت و حرفت کا خیال ہو تو اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ ذریعہ بنے۔ سیاست ہو تو وہ جو تیرے رسول نے بتائی معاشرت ہو تو وہ جو تیرے فرستادہ نے بنائی۔ لکھنا۔ پڑھنا۔ بولنا۔ چالنا۔ کھانا۔ پینا۔ رہنا سہنا۔ لڑنا جھگڑنا غرض ہر حصہ زندگانی میں حصہ لیں۔ اگر تیری اور تیرے رسول کی پیروی سے ایک قدم باہر دھرتے

بندوں کی دُعا

(از اخبار خطیب دہلی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء)

کاغذ کے ناتواں ہاتھوں کو توانائی دے۔ بیجان حروف میں اثر زندگانی بخش۔ انمٹ تقدیروں کو نہ بدل۔ مگر صبر کی تدبیریں۔ تسلیم و رضا کی لکیریں۔ دل کی تسلی کیلئے بھیج۔ تو نے حجاز کے جھلسے ہوئے بے رونق پہاڑوں میں دو پھول نرگس کے پیدا کیے اور ان پھولوں نے کائنات آخر کی بیمار آنکھوں کو صحت بخشی ہم انہی شرمیلی جھکی ہوئی نظروں کو تیرے سامنے شفیع بناتے ہیں۔ ہمارے دین و دنیا کے پہاڑوں میں عیش و رحمت کے باغ لگا دے۔

اے خیالوں میں رہنے بسنے والے۔ مگر دانش و عرفاں کی تمناؤں کو بیتاب رکھنے والے اے ہر ذرہ میں موجود۔ مگر آفتاب تحقیق کی نظروں سے مخفی اے ٹوٹے ہوئے دلوں کو نشیمن بنانے والے۔ ہمارے پاش پاش دلوں کو بھی لبھانے آجا۔ اس فطرت کی مستیوں سے جی ڈرتا ہے۔ اپنی بستی میں پناہ دیدے۔

تجھ کو داتا کہیں۔ تجھ کو مولا کہیں۔ تجھ کو داد کہیں۔ تجھ کو کیا کچھ کہیں۔ تو ہر ہے اور ہر سے آزاد ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

طائرِ سیاہ فام

از رسالہ القمر دہلی جون ۱۹۱۵ء

کل رجب ۱۳۳۳ھ کی ۲۰ تھی۔ معراج کی رات سوتے گزر گئی۔ اس لیے کل روزنامچہ میں آیا تھا۔ رین بسیرے کے وسیع صحن میں بہت سے انسان پچھلی رات کی خنک ہوا کا لطف

لے رہے تھے۔ اور بے خبر سوتے تھے۔ میری آنکھیں ان کی بے فکری اور بے خبری پر رشک کرتی تھیں۔ اور دل کی بھٹی آنسو گرم کرکرکے بھیج رہی تھی +

میں نے تکیہ کے نیچے سے بجلی کا لیمپ نکالا۔ اس کا کھٹکا دبایا۔ روشنی تڑپ کر باہر نکل آئی۔ غسلخانے میں لیجاکر اس کو رکھ دیا۔ وضو شروع کیا۔ جب زبان نے کہا:۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ وَجْھِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ خیال رز گیا۔ میں نے یہ کیا مانگا کیا میرا چہرہ منور ہونے کے قابل ہے۔ برقی لیمپ نے اشارہ کیا کیوں خلجان میں پڑتا ہے۔ نور بھی کوئی چیز ہے۔ بارہ آنے کو نور کی بیٹری آتی ہے۔ خواہ مخواہ خدا کا احسان اٹھاتا ہے +

باہر آیا۔ تاروں نے اذان دی۔ اُفق نے حیران ہوکر کہا۔ نماز کا وقت نہیں ہوا یہ کیسی اذان؟ تخت کا مصلےٰ آہستہ سے بولا۔ وقت تہجد ہے۔ مگر کل کی رات کیسی غفلت میں کٹ گئی۔ خیر آج بھی کچھ نہیں گیا۔ چاہتا تھا کہ نیت باندھوں، اور دل کی گرہ کھولوں کہ پھر کلیجہ میں ایک تیر لگا۔ کوئی چیز سینہ کے اندر جوش مارتی منہ کی جانب ابلتی ہوئی آئی۔ میں نے آہ آہ کہہ کر اس بخار کو باہر پھینک دیا۔ اور کہا:۔

کم بخت۔ یہ کیا بلا ہے۔ میری ساری رات برباد کردی +

میرے سب پشتم نے کچھ اثر نہ کیا۔ سارے جسم پر اس نامعلوم زہر نے قبضہ کر لیا میں بے قرار ہوگیا۔ میں نے نماز کے قانونی طریقے کو ترک کردیا۔ اور بغیر قیام و رکوع کے سجدہ کے آگے سر جھکایا +

پیشانی کے نیچے خاک نہ تھی۔ تخت کی لکڑی تھی۔ اس پر سرد جانماز تھی میرا ماتھا اوس پر رکھا تھا۔ اور اس کی پُردَسن آنکھیں بے اختیار رو رہی تھیں +

میں نے سبحان ربی الاعلیٰ نہیں کہا۔ میں نے خندی میں اسکی تعریف کی۔ اسکی خوشامد کی۔ اُس کی بڑائی کی۔ جوں جوں میں اُسکو جگ داتا جگ داتا پکارتا تھا۔ دوں دوں دل کی آگ بھڑکتی تھی +

اُس نے تو وعدہ کیا ہے۔ بندہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اُسکی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ آج وہ کہاں چلا گیا۔ مجھے کیوں رُلاتا ہے۔ سامنے کیوں نہیں آتا ہے + ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ شعلۂ غم کو زیادہ بھڑکا گیا۔ میں نے سجدے کو چھوڑ دیا گردن کو اوپر اُٹھا لیا۔ چشمِ تر کو آسمان سے لڑایا۔ جب بھی جی کو قرار نہ آیا۔ رین بسیرے کا دروازہ کھولا سب سونے والوں پر حسرت کی نگاہ ڈالی۔ قبرستان میں آیا۔ حور بانو کی والدہ خاکی چھپر کھٹ میں غریب گیاہ سبز کا چادرہ اوڑھے اپنے لاڈلے بچے حسن بصری کو آغوش میں لیئے سوتی تھیں +

حدیث یاد آئی۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم قبروں کے مردوں پر رشک کرو گے کاش قبروں میں ہوتے۔ اور زندگی کی اُلجھن ہمکو نہ ستاتی۔ سچ فرمایا میرے رسول نے دیکھو میری بیوی جو دس برس شریک بزمِ حیات رہ کر جنت کو سدھاریں کیسی خوش نصیب ہیں اور آرام سے پڑی سوتی ہیں۔ اور آگے بڑھا۔ اب جنگل سامنے تھا۔ بڑے بڑے گنبد چُپ چاپ کھڑے تھے درختوں پر اندھیرے نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ دن کو جو سایہ مجھے نیچے نظر آتا تھا اسوقت ان کے اوپر سوار تھا +

سگنل کی لال آنکھ

جی، آئی، پی۔ ریلوے کی لائن آئی، سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آئی کہ:-

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

میں اُس سے کیوں مانگوں، کیا وہ حاضر و غائب کا عارف نہیں ہے۔ اتنے میں سگنل نے ہاتھ جھکایا۔ لال آنکھ بند کی۔ سبز کھولی۔ کیا کوئی ریل آئی۔ آگے بڑھا سلطان سکندر لودھی

کا مقبرہ استقبال کو کھڑا تھا۔ ہاتھ ملایا۔ ملاقات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک گیدڑ برابر سے نکل کر بھاگا اس کے فرار نے جسم میں گدگدی کی۔ بے اختیار ہنسی آئی۔ بتی لیمپ کی شعاع کو گیدڑ پر دوڑایا۔ غریب وحشی زیادہ گھبرایا۔ اور کہیں بھاگ کر غائب ہو گیا +

اب خدا خدا کر کے جی ٹھیرا۔ اور اس کھنڈر میں ذرا چین آیا۔ چار رکعت نماز ادا کی اسم بار ذکر جہر ادا کیا۔ اور ہر ہو میں ایک مزا پایا +

صبح صادق قریب تھی۔ چاہتا تھا کہ گھر چلوں کہ پیپل کے بے برگ درخت پر ایک شامہ نے نغمہ حمد شروع کیا۔ بولی:۔

سانچے پیر

کہیں ایک دیوار پر اس کا جوڑا بیٹھا تھا۔ اس نے جواب دیا سب پیر سانچے سانچے بہت دیر تک ان کے سوال جواب ہوتے رہے۔ کیوں ری۔ کالی کلوٹی چڑیا۔ تو ہمارے پیروں کا مزاج بگاڑتی ہے۔ سانچا نام اللہ کا ہے۔ باقی سارا جہان جھوٹا ہے۔ شامہ بولی:۔

کیسے پیر۔ سچے پیر کیسے

جوڑے نے جواب دیا:۔

سانچے رب۔ سانچے۔ سانچے

ہاں اب ٹھیک کہا۔ آخر تو کالے رنگ کی چڑیا ہے۔ سراپا ظلمت ہے مگر بات نورانی کہتی ہے۔ جتنے کالے بدشکل ہوتے ہیں ایسی ہی سفید بات کہا کرتے ہیں +

طائر سیاہ فام کے ظاہری الفاظ میں تو یہ تھا جو سنایا۔ مگر اس طائر کی اسپرٹ کا سمجھنا آسان نہیں۔ جس نے اسکو سمجھ لیا وہ رات کا سونا بھول جاتا ہے۔ اسکو رونے میں مزا آتا ہے اور رونا ہی اس کی دارین کی تسلی بن جاتا ہے۔ جس کی ہر آدم زاد کو ضرورت ہے +

دوسری منزل

ذوق و شوق * عشق و محبت * سوز و گداز * ارادت و عقیدت

حسن کا فرمان

(از رسالہ مخزن سنہ ۱۹۰۴ء)

(ڈھڑ دیے۔ دودیے۔ نفسانی عاشقوں کے نام)

جاں نثار قدیمی زلف کے مشرقی صوبے دار ذوق دہلوی کو ہدایت کی جاتی ہے۔ کہ ظلِ الٰہی کا حسبِ ذیل فرمان اُن عاشقوں کو پہنچا دے۔ جن کی محبت ماجناب کی شانِ عالم آرائی میں بٹہ لگاتی ہے۔

ان کو بتایا جائے کہ ماجناب عرصۂ دراز سے ایک ایسے مُلک میں رہتے تھے۔ جہاں ہم کو سوائے ہمارے کوئی نہ جانتا تھا۔ اس مُلک میں ماجناب کی جیسی شان و جبروت تھی اس کا اظہار ہماری قدرت میں داخل ہے۔ مگر تم کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ کشفِ راز کی تاب لاسکو۔ ایک ذرہ اگلی شان کا ظاہر ہو جائے تو تمہاری ہستی کا نشان باقی نہ رہے۔

ایک دن ماجناب نے اپنی آن بان کا تماشا دیکھنا چاہا۔ خیال آنا تھا کہ خود بخود تماشاگاہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑ ہیں۔ دریا ہیں۔ جنگل ہیں۔ گلستاں ہیں۔ اور ایک انسانی صورت اُن کے بیچ میں بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ یہ عالم ماجناب کو پسند آیا۔ شان

زیبائی کے تھوڑے تھوڑے جلوے چاروں طرف بکھیر دیئے۔ تصویر کی خاموشی ایسی بھائی کہ اسکو اپنے لیے اختیار کر لیا۔ اور اسکی آنکھوں میں تخت سلطانی بچھا دیا گیا +

یہیں سے ہماری حکومت کا زمانہ شروع ہوا۔ اور ماجناب کی کبریائی کونسل میں ابرو۔ رخسار۔ لب۔ دندان۔ ذقن۔ گردن داخل کیے گئے۔ گیسو کی سرحد قایم ہوئی۔ آواز اور زبان کے وزیر احکام چلانے لگے۔ ماجناب کی رعایا ویسی ہی وفادار ہوئی جیسا ظل الٰہی کا پہلے منشا تھا۔ کونسل کے بعض ممبر یا یوں خیال کرنا چاہیئے کہ بعض صوبے دار نادانی و شرارت سے کسی پر ظلم کرتے وجفاکاری سے پیش آتے تو اطاعت شعار رعیت بڑی خوشی سے ان کی ستم آرائی برداشت کرتی۔ بارہا باڈی گارڈ کے سپاہی پلکیں نوکدار برچھیوں سے حضوری کی لوگوں کو ستاتے، مگر کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی نے اُف کی ہو۔ ماجناب کے کان ان کی فریاد سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔ اگرچہ ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ بے زبان رعیت پر ظلم توڑے جائیں۔ مگر کیا کریں بعض دفعہ شوخی کے نشے میں ایسا ہو جاتا تھا، اور بارگاہ احدیت مآب کو اس سے افسوس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رعیت کے بعض افراد نافرمان ہو جاتے تو ماجناب ایک حسین ایلچی ان کی ہدایت کے لیے مقرر فرماتے چنانچہ یوسف۔ موسیٰ۔ رام کرشن۔ محمد جیسے خوبصورت لوگ وقتاً فوقتاً ہدایت کے لیے مقرر کیے گئے +

اب آجکل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رعایا میں ابتری پھیل گئی ہے۔ دودلے۔ تھڑدلے اور نفس پرست لوگ ہماری حضوری کی طلبگاری کرنے لگے ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ایک فرمان کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جائے اگر انھوں نے اس فرمان کو قبول کیا۔ نزول رحمت کے مستحق ہونگے۔ ورنہ قہر کی بجلیاں گرینگی۔ اور ان کی ہستی کو نیست و نابود کردینگی +

ماجناب احدیت کے خیالِ مقدس میں تھڑدلا شخص جو ذرا سی بدنامی و ملامت کے ڈر سے گھبرا جائے۔ یا ایسا دودلا کہ گاہے چنیں اور گاہے چناں کی حالت میں گرفتار ہو۔ یا نفس پرستی اور جذبہ شہوانی کی تکمیل کی غرض سے ہماری رعیت بننا چاہتا ہو۔ ہرگز اس قابل

نہیں کہ ما جناب کی نورانی حکومت کو اپنی سیاہ کاریوں سے بدنام کرنیکے لیے باقی رکھا جائے
اگر تم لوگ ما جناب کی دل آرا حکومت میں باقی رہنا چاہتے ہو تو بدنامی کے فکر و تردد
کو پس پشت ڈال دو۔ یکسوئی اور خلوص قلب سے اپنی پیشانیاں ہمارے سامنے جھکا دو
نیت اور ارادے کو نفسانی خواہشوں سے پاک رکھو۔ ہم تم میں وہ صفت دیکھنا چاہتے
ہیں جو ہماری قدسی صفات سلطنت کی رعایا کے واسطے زیبا ہو ؛

نفسانی خواہش کی تکمیل ایک فوری لذت ہے جو دوسرے ملکوں میں بھی حاصل
ہو سکتی ہے۔ ہماری اقلیم کی جو بات ہے وہ دیرپا ابدی۔ اگر نفسانیت درمیان میں
نہ لائی جائے تو عارضی سرور کے بدلے ابدی لطف کی کیفیت عطا کی جائے گی۔ پس تمام
طلبگاروں کو آگاہی دی جائے کہ وہ اس فرمان کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائیں ؛

منظرِ فراق

یعنی

وفات الرسولؐ

کا سین

(از نظام المشائخ۔ مارچ ۱۹۱۴ء)

آسمان چپ۔ زمین دل تھامے ہوئے۔ ہوا چلتے چلتے رکتی ہے۔ اور خانۂ رسولؐ
میں غم کی گھڑی کو جھانکتی ہے۔ پرندوں نے چہچہانا چھوڑ دیا۔ کبوتر معصوم عائشہؓ
کی بے کسی کو بھولپن سے دیکھ رہا ہے ؛

آفتاب رسالت پر موت کا ابر چھا رہا ہے۔ نورانی کرنیں پردے میں چھپ رہی ہیں
اُمت کا سرتاج دُنیا سے سدھار تا ہے۔ باپ کی لاڈلی۔ فاطمہؓ کا سہارا بیٹی کے سر سے

ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ عائشہؓ کا دل دھڑکتا ہے کہ سہاگ کی منزل آخر ہوئی۔ حجرۂ رسولؐ
کی رونق رخصت ہو رہی ہے۔ یاس و ہراس در و دیوار سے لگے کھڑے ہیں ۔

یا رسول اللہ! ابھی نہ جائیے۔ حسنؓ حسینؓ سے جدا نہ ہوجیئے۔ ذرا دیکھئے یہ کیسے ڈرے
سہمے جاتے ہیں۔ اب ان کو کون دوش پر بٹھائے گا۔ کس سے ان کے نازک دلوں کی دلداری
ہوگی۔ انہیں کس پر چھوڑا۔ تلواریں ان کو گھور رہی ہیں اور ڈرا رہی ہیں۔ تیر ان کے بے کینہ
سینوں سے اور خنجر ان کی صراحی دار گردنوں سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے ہیں ۔

علیؓ کی کمر ٹوٹی جاتی ہے۔ عقدہ کشا کی زندگی میں حسرت و رنج و محن کی گرہ لگا رہی ہے
سلجھے ہوئے ایام اُلجھ رہے ہیں۔ صدیقؓ کو بڑھاپے میں یار غار کا داغ رُلائے دیتا ہے ۔

اور ہاں۔ پتی کی ستی بی بی عائشہؓ
کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ستی پتا کی جائی۔ ستی پتی کی من موہنی۔ سچ کائنات کے
سب سے بڑے شام سندر کی منظور نظر صدیقؓ کی گود میں پلنے والی۔ آغوش نبوت کے تخت
کی ملکہ کیسی اُداس۔ مایوس۔ نڈھال۔ سر رسولؐ کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ آج اسکی راج دھانی
ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دُنیا سے مُنہ موڑ رہا ہے ۔

پتی کی ستی عائشہؓ! ہم تیرے ست کے قائل ہیں۔ تو سچی صدیقہ ہے۔ ایک دفعہ
آگ میں جلکر مر جانا آسان ہے۔ مگر سارے عمر پتی کے کام میں لگا رہنا اور اسکو انجام پر
پہونچانا تیرا ہی حصہ تھا۔ رسولؐ کے خانگی حالات جن پر اُمت کے ہزاروں کا موں کا انحصار
تھا تو نے ہی بتائے۔ اور پر بھو پر شوتم کے پیارے شوہر کے نام پر اپنی زندگی کا عیش و آرام
نثار کر کے جلا ڈالا ۔

عقل والے تدبیروں کے بادشاہ عمرؓ کو دیکھنا سائیں کے فراق نے دیوانہ کر دیا ہے۔
ہوش و حواس قابو سے نکلے جاتے ہیں۔ عثمانؓ فنا کار سکوت میں ہیں۔ غم نے گم کر دیا ہے۔
سب سے زیادہ جس دل پر قیامت آئی۔ وہ فاطمہ زہرؓا کے سینے میں بھڑک رہا ہے۔

یہ ان کے باپ ہیں جو داغ جدائی دیکر جاتے ہیں۔ زہرا بی بی۔ رسولؐ با با کو نظر بے بسی سے دیکھتی ہیں۔ اور دل ہی دل میں کہتی ہیں الٰہی! اب کیا ہوگا۔ کیا با با جان مر جائیں گے گیا میری تشفی دینے والے پردیس کو چلے، اچھی با با۔ فاطمہؓ کو بھی لے چلو۔ لڑائیوں میں اپنی لونڈی کو نہ بھولے۔ اکثر ساتھ رکھا۔ میدان موت میں بھی یہ کنیز ساتھ رہے گی۔ ہائے میرے فقر و فاقہ کے وقت اب کون دلاسا دینے آئے گا۔ با با میں تمہاری بیٹی ہوں۔ با با میں تمہاری فاطمہ ہوں۔ میں ضد کرتی ہوں کہ آپ نہ جائیے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ کو یتیم نہ بنائیے اے خدا! تو ہی سُن۔ صدقہ اس کششِ اُلفت کا جو اپنے حبیب کو دُنیا سے کھینچ رہی ہے صدقہ اس قاب قوسین سے آگے والے مقام کا طفیل اُس آنکھ کا جو اس بندہ کو خصوصیت سے پیار کرتی ہے واسطہ اس مشیت لامتناہی کا جو سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر سکتی ہے۔ میرا باپ مجھ سے جدا نہ ہو۔ میرا سید آنکھ بند نہ کرے۔ پروردگار! میں تیرے رسولؐ کی لختِ جگر ہوں۔ خداوندا! میں اس آنکھ کی ٹھنڈک ہوں۔ جسکو تونے دُنیا کی ٹھنڈک کے لیے مقرر کیا تھا۔ الٰہی! میرا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔

سرکار استغراق میں تھے۔ رخصتِ سفر کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ عالمِ خاک سے آنکھ بند تھی۔ عالمِ پاک کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ یکایک اہل بیت کی بیتابیاں۔ اُمت کی یتیمی کو ساتھ لیکر قدموں کو چمٹ گئیں۔ آنکھوں کو تلووں سے ملا۔ اور حضور کو متوجہ کر لیا چشم گرامی وا ہوئی۔ بیقراروں کی غمناک صورتوں پر نگاہ ڈالی۔ اور رفیق اعلیٰ کے ان سب کو سپرد کیا گیا۔ رفیق اعلیٰ کو پکارا۔ رفیق اعلیٰ نے لبیک کہی۔ اور جھک کر اپنے کارگزار مقبول بندے کو اُٹھا لیا قریب کے سب مقام ادب سے بعید ہو گئے۔ عزرائیل کا اسمِ صفت۔ اسمِ ذات سے الگ کر دیا رفیق اعلیٰ نے رفیق اعلیٰ کو خود منزلِ رفیق میں لیجا کر پہونچا دیا۔ جو کبھی نہیں ہٹنا۔ جو کبھی نہیں ہٹنے گا۔ جو ہٹنی سے پاک ہے۔ اُس نے مسکرا کر رسولؐ کے فرقت زدہ اصحاب کو۔ اہل بیت کو۔ غم و الم کی تصویروں کو دیکھا اور زبان بے زبانی

سے ارشاد فرمایا۔ کیا یہ میرا ہمیشہ تمہارے پاس رہتا۔ کیا تمہارا دل مجھ سے زیادہ اس کا مشتاق تھا؟ تم کو اسکی خاطر نوازوں گا۔ اور نواز رہا ہوں۔ تم کو اسکی خاطر اُمتوں کا سرتاج بنایا اور بناؤں گا۔ عائشہؓ ہراساں نہ ہو۔ میں تیرا محافظ ہوں۔ فاطمہؓ دلگیر نہ ہو میں تجھ کو دلاسا دوں گا۔ اور جلدی اس سے ملاؤں گا۔ میرے بندے کے فدائیو! بےچین نہو قیامت تک میں تم سے ماتم پُرسی کروں گا۔ اور دلِ زخم خوردہ پر مرہم پاشی ہوتی رہے گی۔

لو صاحبو! آقا رخصت ہوئے۔ فاطمہؓ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ عائشہؓ کے حجرے میں آفتاب چُھپ گیا۔ جبرئیل جاتے ہیں۔ اب نہ آئیں گے دیکھو یہ تمہارے کملی والے شاہ لیٹے ہیں۔ اُمتی اُمتی پکارنے والے۔ اور آخر وقت تک اُمت کے خیال میں سرشار ہونے والے کو جی بھر کر دیکھ لو۔ اب یہ شکل بھی مٹی میں مُنہ چھپانے والی ہے۔

منظر خیالی تیرہ سو تیس برس کے بعد دل کو نہ ستا۔ کون مرا۔ کون گیا۔ کس کی وفات وہ زندہ ہیں۔ زندہ خدا کا زندہ رسول۔ نہ مرے نہ مرنے دے۔ آؤ۔ اس کے دین کی آگ میں سانس کو قربانی چڑھائیں اور اُس تک پہونچیں جس کی آرزو ان مناظر تخیلات میں لے کر آئی ہے۔ مر جاؤ اور اس کو پاؤ۔

اچھّے بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے

اُمت کی سُسرال سے مدنی میکہ کو ایک خط

(از توحید ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء)

بابل بڑھوا۔ چودھویں سال میں بیوہ ہو جانے والی دُکھیا۔ اُمتا کے چاہنے والے نانا۔ باوا جان۔ اُمت تم پر قربان۔ آپ کی بدنصیب رانڈ اُمتا۔ پردیس میں بےکس بےبس پڑی ہے کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کیا آپ اپنی لاڈلی کو بھول گئے۔

ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے۔ جب میں آپ کی دل کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی، آپ سنوارتے تھے میں روتی تھی۔ آپ رومال سے آنسو پونچھتے تھے میں ضد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے میری فکر میں آپ نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن کے فاقے جس کے لیے ہوتے تھے۔ وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے۔

وہ زمانہ بھی یاد ہے۔ جب آپ کی لاڈلی کے بیاہ کی تیاریاں تھیں۔ قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کا سامان میرے جہیز کے لیئے نکالا جا رہا تھا۔ اور ہاتھوں کو ایسی مہندی لگائی گئی تھی جس کے رچاؤ نے پردیس میں سسرال جا کر بالم سیاں کو بے اختیار کر دیا۔ اور وہ اُن ہاتھوں پر قربان ہو ہو گئے۔

اور اُس گھڑی کو کیونکر بھولوں۔ جبکہ میکہ سے ڈولا چلا ہے۔ اور میں نے بچپن کے گھر بار کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لی ہے۔ اپنے بیگانے روتے تھے۔ بابا جان آپ بھی غمگین و افسردہ تھے۔ مجھ کو کالے کالے پہاڑ۔ اونچی اونچی کھجوریں۔ جنگل کی بیریاں۔ اور ان پر کبوتروں کا غٹر غوں غٹر غوں کرنا۔ اور مدینہ کی سہیلیوں کی جدائی۔ سب پر طرہ آپ جیسے پریمی پتا کی چشم محبت کا فراق غضب ڈھا رہا تھا۔ سسرال میں اچھی گزری۔ لال چھپے والی مہارانی کہلائی۔ شوہر دلداریاں کرتا تھا۔ آنکھ کے اشارہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ چاندنی راتیں تھیں۔ سمندر کا کنارہ تھا۔ اور کان میں موتی ہزارہ تھا۔ فوجیں تھیں۔ پہرے تھے۔ وردیاں سنہرے تھے۔ تاج تھا۔ تخت تھا۔ سہاگ تھا۔ بخت تھا۔

مگر ہائے بابل قسمت لوٹ گئی۔ عمر کا چودھواں سال۔ اُمنگوں اور ارمانوں کا شباب پورا نہ ہونے پایا تھا کہ شیام سندر پیارے رن میں کام آئے۔ دشمنوں نے دھوکے کی کٹاری خبر نہیں کہاں ماری۔ کام تمام کر دیا۔ میرا سہاگ لٹ گیا۔ میری سج دھج مٹ گئی۔ میرے [illegible] ارمان رہ گئی۔ میری ہری ہری چوڑیاں اُتر گئیں۔ میں بیوہ اور دکھیا رانڈ کہلانے لگی۔

اچھی بابل ذرا اپنی اُستا کو دیکھنے آؤ۔ اچھی میرے چاہنے والے باپو مجھ کو ساس نندوں کے طعنوں سے بچاؤ۔ وہ مجھ کو چھیڑتی ہیں۔ انہوں نے مجھ کو نکو بنا رکھا ہے اب اس گھر میں میری مٹی خراب ہے ۰

بیٹی اپنے منہ سے کیونکر کہے۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ لیکن پتا۔ تجھ سے کیا پردہ ہے۔ اب مجھ سے رنڈاپے کے دن نہیں کاٹے جاتے راتیں مجھ کو ستاتی ہیں۔ گھٹائیں جب آتی ہیں۔ بجلی جب چمکتی ہے۔ بادل جب کڑکتا ہے۔ مور جب بولتا ہے۔ پپیہا پی کہاں کی صدا لگاتا ہے۔ سہاگنوں کے جھولے جب دیکھتی ہوں۔ پھول پہننے والیاں جب سامنے آتی ہیں۔ میری تمنائیں، میرے ولولوں میں حشر برپا ہو جاتا ہے۔ کلیجے پر سانپ لوٹتا ہے ننگی کلائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو بے اختیار ٹھنڈا سانس نکل جاتا ہے۔ سُنتی ہوں آپ بدھوا کی شادی کے حامی ہیں۔ میرے لیے بھی کچھ فکر کیجیے۔ میری جوانی دیوانی کی خوشیوں کو بربادی سے بچائیے۔ پھر وہی پہلی سی مہندی منگائیے۔ سفید ہاتھوں کو لال لال بنائیے پھر دلہن بنوں۔ پھر جہیز کا انتظام ہو۔ جیسی آپ کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ ویسا ہی بیاہ رچائیے ارمان کہتے ہیں۔ ابھی تیری عمر چودہ برس کی بھی نہیں۔ باپ کی چہیتی ہے۔ جو ضد کرے تھوڑی ہے جو دان مانگے کم ہے ۰

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو ۰

اچھی بابل مجھے مہندی منگا دو ۰

اچھی بابل میرا منڈھا چھوا دو ۰

سب پر بتوں کے بانس کٹوا دو۔ سب باغوں کے پھول پتے منگوا دو۔ مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہنا دو۔ اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے ۰

گاؤ! میرا یہ سندیسا مدینہ نگری پہنچا دے۔ بھونرے! کلیوں کے رس کو چھوڑ۔ اور ذرا میرے حق میں بپتا باوا جان تک لیجا۔ نسیم سحری میرے نامراد گھر میں کیوں چلی آتی ہے

یہاں سب پھول مرجھائے ہوئے ہیں۔ اُلٹے قدم جا۔ اور زائف کے چمن والوں کو
یہاں کی خزاں کاریاں سُنا دے۔

بجلی کے تار دو۔ اگر تم میرے ہمدم جا سکو تو "تائی ڈیر فادر" کو میری خبر دیدینا۔

ہم ہیں بالک ایک پتا کے

(از توحید۔ ۲۴ ر مئی ۱۹۱۳ء)

ہمارا باپ فقط آسمانی نہیں۔ زمین پر بھی وہی ہے۔ اوّل بھی وہی ہے آخر بھی وہی ہو دکھ میں بھی ہمارا باپ ہے۔ اور سکھ میں بھی ہمارا پدر بزرگوار۔ تیرہ سو اکتیس برس سے وہ ساری دنیا کا باپ اور دُنیا والے اس کے بچے ہیں۔ اسی واسطے اسکو رحمۃ للعالمین کا لقب دیا گیا ہے۔

گورے کالے نیلے پیلے۔ لمبے ٹنگے۔ چھوٹے بونے۔ بھوکے۔ پیٹ بھرے۔ خاک پر سونیوالے۔ اور مخملی بچھونوں پر پاؤں پھیلانیوالے سب حجازی باپ کے فرزند ہیں۔

انجیل کا آسمانی باپ اس کے قول کے موافق اپنے اکلوتے بچے مسیح کو سولی پر چڑھتا دیکھتا ہے اسکی فریاد سنتا ہے۔ جبکہ اس نے ایلی ایلی کہہ کر باپ کو پکارا۔ اور کہا۔ کیا تو مجھ کو بھول گیا۔ مگر اس کو اپنے لاڈلے پر ترس نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اس کا نورِ چشم سولی پر تڑپ تڑپ کر جان دیدیتا ہے۔

ہمارا باپ آسمانی وزمینی خدا کا بھیجا ہوا رسول اور بندہ ہے۔ ہمارے باپ میں اس کے خدا کی صفت رحمت سر سے پاؤں تک چمکتی نظر آتی ہے۔ ہمارا باپ اپنی اُمت کے پاؤں میں پھانس کی کھٹک کو بھی گوارا نہیں کر سکتا اور بے چین ہو جاتا ہے۔

ہمارے باپ کو مدینہ کی گلیوں میں بچے روک لیتے تو وہ کھڑا ہو جاتا اور جب تک ہاتھ نہ چھوڑتے ٹھہرا رہتا۔ ہمارا باپ دوجہان کا شہنشاہ تھا مگر غریب لاوارث عورتوں کا

سودا بازار سے لاتا۔ ان کے بوجھ کندھے پر اُٹھاتا۔ بیماروں کی خدمت میں رات رات بھر
جاگتا۔ اور اپنے بچوں کی خبر گیری کے لیے آبادی میں رہتا تھا جنگلوں۔ پہاڑوں میں خلقت
سے مُنہ چھپائے نہ پھرتا تھا۔ ہمارے باپ پر اُس کے بچے عاشق تھے۔ جب کافر تیر چلاتے
اور تاک تاک کر ہمارے باپ پر نشانے پھینکتے تو اس کے بچے ستر ستر تیر ڈھال بنکر اپنے
جسم پر کھاتے تھے مسیح کے بچوں کی طرح نہ تھے جنھوں نے تیس روپیے لے کر اپنے باپ کو
قاتل دشمن کے حوالے کر دیا۔ ہمارا باپ آدمی تھا ہمارا باپ بچوں سے ان کی سمجھ کے موافق
باتیں کرتا تھا مسیح کی طرح نہیں جو مچھلی والوں کے سامنے فلسفہ اور الٰہیات کی مشکل مشکل مثالیں دیتا تھا +

ہمارا باپ بڑا۔ ہمارا باپ سب سے اچھا۔ ہمارا باپ سب کا باپ اور ہم سب اس کے بالک
تو آؤ اپنے باپ کو پہچانیں۔ در در کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ اپنے باپ کے گھر چلیں۔ وہ
ہم کو یاد کرتا ہے۔ ہم بھی اسکو یاد کریں۔ اسکی محبت گود پھیلائے۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی
موسائی سب بچوں کو بلاتی ہے۔ چلو باوا جان کے سینے سے چمٹ جائیں۔ پاؤں چومیں
آنکھوں سے لگائیں۔ بابا پتا۔ بابا۔ فادر۔ ابت کہہ کر جنت کے میوے اور پھول مانگیں +
باپ کے گھر کا راستہ کدھر ہے۔ دیکھو کسی یتیم بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرو۔
اُس کی خبر گیری کرو۔ باپ کا گھر مل جائے گا۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ باپ کے پاس جا پہنچو گے۔
لڑائی جھگڑے سے باز آؤ۔ مدنی بابا کا دروازہ ہاتھ آ جائے گا۔ کسی سے نہ ڈرو۔ خدا کا خوف
اپنے دل میں ہر وقت رکھو۔ اس کو ایک مانو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اور اسکو اور اپنے
باپ کو ہر چیز سے اچھا اور بڑا سمجھ کر محبت کرو۔ باپ تم کو اپنے گھر میں بلا لے گا +

ہم ہیں بالک ایک پتا کے۔ جس کا پیارا پیارا نام محمدؐ ہے۔ اور جو خدا کی طرف سے
ہم دنیا والوں کے لیے رحمت کا پیام لے کر اور رسول بن کر آیا ہے +

سلام ہمارے باپ پر۔ سلام ہمارے رسولؐ پر۔ سلام ہمارے پتا پر۔ سلام ہمارے
فادر پر اور اُس کے اصحاب اور آلِ مصفا پر۔ سلام اس پر جس کی نسبت قرآن میں ملکوتی

محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ارشاد ہوا۔
اور ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے محمدؐ کو زید بکر اور دُنیا کے نسلی باپ کی طرح نہ سمجھو۔ بلکہ رسول اللہ
اور پیغمبری ختم کرنے والا مانو۔ لہٰذا ہمارا اس کو باپ کہنا اور اپنے تئیں بالک سمجھنا محبت کا
لفظ ہے ورنہ وہ رسول ہم اُمتی۔ ہمارے ماں باپ اُس پر قربان ہوں +

مدنی شیام سُندر کی مُرلی

(از توحید۔ یکم جون ۱۹۱۳ء)

شیام نے مُرلی بجائی کس طرح ۔۔۔ مچ گئی گھر گھر دُہائی کس طرح
ہر کی مُرلی ہر کے اندر باجتی ۔۔۔ ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح

زلفوں والے۔ پیتم پیارے۔ یثرب باشی۔ موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری۔ حجازی پربت
میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دُکھ کلیش دور ہو گئے۔ روح۔ آتما۔ جیو۔ جسم شریر
سب کو سرشار و پرکیف بنا دیا +

مگر اب زمانہ گزر گیا۔ راتیں بیت گئیں۔ شیام سندر کی مرلی کی آواز سُنائی نہیں
دیتی۔ جنگل کے ہرن باغوں کے مور۔ آم کی ٹہنی کی کوئل سب اس پیاری اور سریلی صدا
کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے۔ برسات کا موسم قریب آیا۔
کالی گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں گی۔ اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈھیں گی۔ کوئی چاتر
سمجھدار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شیام سندر کو سندیسا پہونچا دے۔ اس سہانے بن میں بلا کر
لائے۔ پریم روپ مورتی کانوں میں مندرے ڈالے۔ بانسری لے کر پھونکے اور نفخت فیہ
من رُوحی کا جلوہ ظاہر ہو۔ شیام کی مرلی سُننے کو جی ترستا ہے۔ رن کے بگل زم ہمارے حجازی
موہن کی بانسری کے آگے ہیچ ہیں۔ کاش وہ پھر بجے۔ پھر گھر گھر دہائی مچے +

آہاہا۔ وہ دیکھو شیام سندر مُرلی لیے بن سے نکلے۔ وہ ہمارے سیتاپتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔ اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی۔ اور مینہ کی بدلی برسے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گنگا جمنا پیاسی تھیں۔ گھٹ کے تیرتھ سونے تھے۔ بھگتی کا تھا کال پڑا۔ ست کے گلے جنجال پڑا۔ اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی۔ اور چنتامن کا نور ہوئی۔ اب ہر مہر کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے۔ اور مہر کا جھنڈا لاتا ہے۔ بانس کی مرلی صدور ہے یہ۔ اور پپیک کا مسطور ہے یہ ۞

حلقہ بگوش کا قلمی نذرانہ

خواجہ کے دربار میں

(از توحید۔ مرجون ۱۹۱۳ء)

شاہوں کے شاہ۔ عرش پائے گاہ۔ سلطان الہند اجمیری خواجہ کے دربار میں حلقہ بگوشوں کی نذریں گذر رہی ہیں۔ فقیر بے نوا خالی ہاتھ خانماں برباد۔ اس قابل کہاں ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں کچھ پیش کر سکے ۞

ہندالولی داتا جانتے ہیں۔ بندہ حسن گدڑی پوشوں میں پیدا ہوا مسکینوں میں پلا گور غریباں میں جا کر سو جائے گا۔ زر و جواہر طلا و نقرہ کی نہ کبھی اس نے اپنے وجود کے لیے خواہش کی نہ دوسروں کو ان کی حرص دلائی ۞

خواجہ بابا اس شکل ہوہوم معدوم۔ ہستی نما کو پہچانتے ہیں۔ پندرہ برس گزر گئے۔ اخباری میدان میں خواجہ کے نام بلند کرنے کے لیے جس خیال سے نکلا تھا۔ اس کی تعمیل میں کوئی دن۔ کوئی رات۔ کوئی گھنٹہ۔ کوئی ساعت۔ کوئی منٹ خالی نہیں جانے دیا۔ آج اگر وہ میدان میں یہ رجز پڑھے کہ خواجہ اپنے غلام کو دیکھیے جس نے قلم کی آگ سے لاکھوں آہنی دل موم کر دیئے

بے شمار انکار کرنے والی ہستیوں کو درِ آستان پر جھکا دیا۔ تو ذرہ نواز خواجہ اظہار قدر دانی فرمائیں گے +

اخبار توحید کا خواجہ نمبر بھی اسی دیرینہ جانفشانی و خدمت گذاری کا نمونہ ہے دنیا والے جس قسم کا شوق رکھتے ہیں۔ اور جن طریقوں سے بات کو سننا چاہتے ہیں تکلموا الناس علی قدر عقولھم پر عمل کر کے اسی پیرایہ سے گفتگو کی جاتی ہے +

نمبر کا لفظ خواجہ کے بزرگ اور پاکیزہ نام نامی کے ساتھ بھدا اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ یہ بھی نئے زمانہ کی رسم ہوگئی ہے۔ عہد انگلش میں ہے۔ ہر چیز کے اندر نمبر +

لہٰذا لفظوں سے چشم پوشی کر کے ان معانی کی طرف توجہ کی جاتی ہے جن کی اشاعت اس دورِ جدید میں لازمی اور ضروری ہوگئی ہے، خواجہ نمبر اخبار توحید کی اور اس غلام بے زر خرید کی قلمی نذر ہے +

بندہ حسن بصد زبان گفتہ کہ بندۂ توام تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی

خواجہ اور ان کے درباریوں میں یہ نئی روشنی کا نذرانہ لیجاتے ہوئے حجاب آتا ہے مگر حقائق شناس بارگاہ۔ ضمائر آگاہ سرکار۔ اپنے حلقہ بگوشوں کی نیت سے خبردار ہے۔ لہٰذا کمال ادب و عقیدت کے ساتھ یہ قلمی گلدستہ پیشکش کیا جاتا ہے۔ پھول پراگندہ ہیں۔ افسردہ اور بے رنگ ہیں۔ لیکن خواجہ کے دربار میں اچھے برے سب کھپ جاتے ہیں۔ سب پر نظر الطاف رہتی ہے +

عالم پناہ سلطان۔ اس ناچیز نذر کو قبول فرمایئے۔ اور اس میں ایسی برکت تاثیر عنایت کیجئے کہ جو دیکھے سیدھا معانی کی تہہ میں پہنچ جائے۔ تاکہ خاکبوس آستانہ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور کسی وحدت کی ڈگر پا لی جائے۔ اور

قلزمِ مضموں بہے اخبار میں نا ذکا عنقا چلے منجدھار میں

اجمیری پہاڑ کا بولنا

از توحید ۸ ؍ جون ۱۹۱۳ء

اجمیر کے اونچے پہاڑ نے جو رات دن خواجہ کے روضہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ ہندوستان والوں کو خطاب کر کے زبانِ حال سے کہا:۔

میں سنگدل پتھروں کا پہاڑ ہوں۔ مگر اے آدمی۔ میرا دل چشمے بہاتا ہے۔ میں سختی میں ضرب المثل ہوں۔ لیکن اے نرم مزاج کے مدعی انسان! تجھ سے زیادہ دوسروں کے کام آتا ہوں۔ میں اجمیری ہوں۔ میری بات سن۔ مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ۔

طور۔ میرا بھائی تھا جس پر خدا نے حضرت موسیٰ کو بلا کر پیغمبری دی۔ جودی بھی میرا ہم جنس تھا۔ جہاں حضرت نوح کی کشتی نے قرار پکڑا۔ وہ میرے ہم قوم پہاڑ کا غار تھا۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے چاند ستاروں اور سورج کو دیکھ کر خدا کا عرفان حاصل کیا۔ بیت المقدس کا نورانی پہاڑ بھی مجھ جیسا پتھر یلا تھا۔ جہاں حضرت عیسیٰ نے کلمۂ الٰہی کا وعظ کہا۔

اس کے آگے کچھ اور کہوں تو سن سکیگا۔ تجھ میں تاب اور برداشت ہے حضرت موسیٰ کی طرح بیہوش تو نہیں ہو جائے گا۔ اچھا تو آ۔ تجھ سے وہ بھی کہوں۔ حجاز کا نام سامنے لا۔ وہاں بھی میرا ہمشکل کالا کلوٹا۔ سوکھا پہاڑ ہے۔ جس کی آغوش میں ایک تر و تازہ پھول کھلا۔ جس کی وادی میں ایک گیسو دراز نے لکڑی کندھے پر رکھ کر بکریاں چرائیں جس کے اوپر چڑھ کر اس نے اپنی قوم کو پکارا۔ اور خدا کے غضب سے ڈرایا۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس کے نیچے اس نے گھر چھوڑ کر راستہ چلا۔ اور ہجرت کر کے مدینے پہونچا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں اس نے حق کا پیام ختم کر کے آرام فرمایا۔

ذرا آنکھ بند کر تاکہ دل کی آنکھ کھلے۔ اور دیکھ یہ سبز گنبد کس کا ہے۔ یہ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی کالی دیواریں کس کی ہیں۔ یہ سب پہاڑ ہیں۔ مجھ جیسے پتھر ہیں جن کی چوٹیوں پر خدا کی تجلیاں نازل ہو رہی ہیں۔ اس پہاڑ کی یاد میں مسلمان فاتحوں نے زمین کے سب بلند مرتبہ والے پہاڑ فتح کر لیے۔ اور ہندستان کا کوہ ہمالہ بھی انکے آگے جھک گیا۔

بس وہی میں اجمیری پہاڑ ہوں۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ سبز گنبد دیکھتا ہے۔ اجمیر میں مجھ کو سفید گنبد اسی وضع قطع کا نظر آتا ہے۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ کو لاکھوں مشتاق پروانہ وار

فانوس سبز

کے گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ اجمیر میں میری آنکھ بے شمار فدائیوں کو حجاب سفید کے آس پاس بے قرار مشاہدہ کرتی ہے۔ جو مدینے میں ہے۔ وہی یہاں ہے۔ غفلت چھوڑ۔ آنکھیں مل۔ منہ دھو۔ اور ہوش ٹھکانے کر کے دیکھ۔ کیا جلوے ہیں۔ کیا شانیں ہیں۔

دیکھنے سے فارغ ہو تو مدنی جبل کی یاد میں تو بھی ہاتھ پاؤں ہلا۔ اور اپنے اجمیری پہاڑ کی عزت کو بلند کر۔ میرے تارا گڈھ کو امید کا سنا ما بنا۔ میرے چلّے کو کمان توڑ کر تیر اندازی کی کمان میں ڈال۔ اور نفس و خودی کے لشکروں پر تیر برسا۔ ادھر آ۔ اُدھر جا۔ اس کو دکھا۔ اس پر تیر چلا۔ کمان جس طرف چاہے کھینچ۔ مگر تیر کا نشانہ ایک ہی کھا۔ تاکہ خود فراموش دشمن نفسانی چلا اٹھے۔ اور کہے ؎

کماں جانب دیگرے می کشد
دلے تیر بر جانِ ما می زند

آیا رے چلکے دیکھیں برسات کا تماشا

(از توحید یکم جولائی ۱۹۱۳ء)

والضحیٰ۔ واللیل۔ والرعد۔ والبرق۔ چمک کڑک اور گھنگھور گھٹاؤں کی قسم۔ برسات کا موسم آگیا۔ جون کی گرمیاں گئیں۔ جولائی کی سیرابیاں نمودار ہوئیں۔ سمندری مانسون ہوائی جہاز پر اُڑا چلا آتا ہے۔

کیوں رے ابر تو آیا۔ میرے پیارے کو نہ لایا۔ تیری بوند بوند میں ایک روح ہے تیرے قطرے قطرے میں ایک جان ہے۔ اب مردہ مٹی زندہ ہو جائے گی۔ کروڑوں جانور حرکت کرنے لگیں گے۔ چراغوں اور برقی لیمپوں پر ان کی یورش ہوگی۔ چراغ کہے گا۔ پروانے! مجھ پر کیوں گرا پڑتا ہے؟ پروانہ جواب دے گا۔ کل جہاں تھا وہ نورانی مقام تھا۔ آج دنیا میں آیا تو اس کو تاریک پایا۔ تجھ کو دیکھا تو سمجھا کہ تو میرے وطن روشن کا نشان ہے۔ اس لیے تجھ سے گلے ملتا ہوں۔ ملنے دے۔ ناراض نہ ہو۔ بادلو! ذرا ٹھہرنا۔ دیکھو۔ ایشیا میں۔ اور مسلم کے دلِ تشنہ کام میں بھی تم جا سکتے ہو یا نہیں۔ اگر نہیں تو جاؤ۔ میں تم کو نہیں مانگتا۔

برسات وہ اچھی جس میں یار ساتھ ہو۔ ورنہ ہیچ۔ قسم ہے گھونگر والے بالوں کی بادلوں کے پیچ و خم مسلمانوں کے پیچیدہ احوال سے زیادہ نہیں ہیں۔ قسم ہے کوندنے والی بجلی کی مسلمانوں کی بے قراری بہت بڑھ گئی ہے۔

کچھ یاد نہیں۔ کس کو برسات کا تماشا دکھائیں۔ کون سمجھے کہ جولائی کی برسات میں کیا بہار ہے۔ مور بولتے ہیں۔ کوئل کی آواز آرہی ہے۔ مینڈک تالابوں میں کچھ پکار رہے ہیں۔ میرا یار ہوتا تو وہ بھی ان کا مزا لیتا۔ نہیں بلکہ وہی اس کا لطف اُٹھا سکتا تھا۔

یہ سب تماشائی بندۂ حرص و ہوس ہیں۔ اسیر مجاز ہیں۔ میں جس یار کو تماشا دکھانا چاہتا ہوں۔ وہ مجذوب ہے۔ دیوانہ ہے۔ سالک ہے۔ ہوشیار ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے۔ سُنتا ہے اور سُناتا ہے۔ آج وہ آجائے تو بادلوں سے پانی نہ برسے کچھ اور برسے کچھ اور بہار ہو۔ کسی دوسری چیز کی کیچڑ نظر آئے +

پیاسی زمین کی قسم۔ گرمی اور گھمس کی قسم۔ دُھوپ اور لُو کی قسم +

اُفقِ حجاز

پر ایک بادل نظر آتا ہے۔ جو شاید گرج رہا ہے۔ اور ادھر کو بڑھ رہا ہے۔ میں اس میں حیات اور ممات کے کرشمے دیکھتا ہوں۔ مجھ کو اس کی آمد کا یقین ہے۔ وہ طوفانی رفتار سے۔ سیلابی انداز سے۔ غیبی پروں سے اُڑتا ہوا نظر آتا ہے +

اگر یار سوتا ہے تو اس کو جگا دو۔ اس کا تماشا دیکھے یہ برسات بار بار نہیں آتی۔ اور کہو۔ آیار چلکے دیکھیں برسات کا تماشا۔ دن رات کا تماشا۔ اسرار کا تماشا۔ اغیار کا تماشا۔ ایک وار اور سب مل کے ترک کر دیں گھر بار کا تماشا +

ٹھنڈا سانس

کھجور کی ٹہنی کے نیچے

(از توحید ۴ جولائی ۱۹۱۳ء)

میرٹھ میں شام تھی۔ ابر تھا۔ ہوا کا سکوت تھا۔ آسمان و زمین پر اُداسی تھی۔ جھینگروں کا شور تھا۔ مینڈک جگہ جگہ بول رہے تھے۔ میں نے کھجور کے نیچے کھڑے ہو کر قدرت کے اس نظارے کو دیکھا۔ اور میرے سینے نے ایک ٹھنڈا سانس باہر بھیجا +

زمین کہتی تھی۔ میں ٹھنڈی ہوں۔ بارش کے پانی نے مجھ کو سیراب کر دیا۔ دیکھو میرے جسم پر پانی بہنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں جو بل کھاتا ہوا مجھ پر سے گذرا ہے +

چھوٹی چھوٹی گھاس کے سبز تنکے خاک سے مُنہ نکالے مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ ہرے درختوں کی شاخیں مستانہ شباب کے عالم میں مخموری کی شان سے سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ کمپنی باغ کے تختۂ چمن میں لال۔ نیلے۔ سفید۔ رنگ برنگ کے پھول شام کے ڈرائونے وقت سے سہمے جاتے تھے۔ اور پتوں میں مُنہ چھپا کر تاریکی کی چادر بدن پر کھینچے لیتے تھے۔ اِن سب کو دیکھ کر میری آنکھ نے پھر کھجور کی ٹہنی کو دیکھا جو

بانکی تلوار

کی مثل اونچے درخت کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ سینے میں پھر ایک شورش ہوئی اور اس نے ایک ٹھنڈا سانس نکالکر مجھ کو دیا +

ہاں۔ آج کے دن اس موسم میں۔ سب مخلوق شگفتہ اور خوش حال ہے۔ مگر ابنِ آدم اپنے دل کی گرمی میں بُھنا جاتا ہے۔ اس کو باطنی سوز جلائے ڈالتا ہے +

جھینگر اور مینڈک نغمہ سنجی میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ آدم زاد کیا کرے۔ جس کو یہ زندگی وبال معلوم ہوتی ہے۔ وہ کیونکر واہ کہے۔ اسکو آہ کے مقام سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے کھجور کی ٹہنیوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ اور کہا تم اس اجنبی ملک میں کیوں؟ بہت دن نہیں گزرے مدینہ حجاز میں باب رحمت کے سامنے والے گھر میں تم کو بعالم رویا دیکھا۔ تمہارے سایہ میں میرا سلطان جس کا سکہ دونوں جہان میں چلتا ہے کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر افغانی لباس تھا۔ اس کے سامنے شکستہ دلوں کے ڈھیر تھے۔ وہ تمہارے پتے توڑ توڑ کر ان دلوں کو باندھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا +

میری اُمت کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ ان کو باندھتا ہوں۔ آ تو بھی باندھ +

یا وہ تھا۔ وہاں تھا یا یہ اور یہاں؟ گرم سانس والے اب یہاں نہیں رہے۔ کھجور کی ٹہنی! میرے ٹھنڈے سانس پر سایہ نہ ڈال۔ میں مسلم ہوں۔ جس کا سینہ گرمایا ہوا ہے۔ مگر ٹھنڈا سانس نکلتا ہے۔ میرا دل بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ مگر اس کے زخم کی بندش حجازی کھجور کے پتے سے ہو سکتی ہے۔ تو میرٹھ میں ہے۔ کیونکہ تیرا پتا اس جراحت دردی کے کام آسکتا ہے؟

موسم برسات ہے۔ مخلوق خدا کے دل امنگوں کے سانس لے رہے ہیں۔ دیکھو مینڈک کیسی بے فکری سے گُن گُناتا ہے۔ جھینگر کس اطمینان میں گاتا ہے۔ مجھ کو قرار ہو تو میں بھی ایک نغمہ مستانہ کی لَے بلند کروں۔ مگر ٹھنڈے سانس کا کیا علاج۔ وہ بار بار آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا دل بے چین ہے۔ تو برسات کی بہار نہ دیکھ۔ پہلے اس کو ہاتھ میں لے۔ اور حجازی شفاخانے میں لے کر جا۔ جہاں افغانی لباس والا

ربّانی سرجن

اس کی مرہم پٹی کرے گا۔ اس کے بعد تو بھی شام کی دلگیری میں برساتی ترانے کا مزا دیکھیو۔ اب تو فقط تو ہے اور ٹھنڈا سانس۔ امید ہے اور اس میں خوف و بیم کی پھانس۔

از توحید، ۳۔ ستمبر ۱۹۱۳ء

عید کے چاند نے کہا۔ مجھ کو دیکھو مدنی محبوب کے ابرو کا خم اسی شکل کا تھا آسمانی کنارے کی شفق بولی۔ اور رخسار کی رنگت دیکھنی ہو تو مجھ پر نظر ڈال لو۔ اس میں مجھ اسی قسم کا روپ تھا۔ سامنے سے تاریکی دوڑ کر آئی۔ اور شرما کر کہنے لگی گیسو مجھ سے ملتے جلتے تھے شام کے منظر اپنی کہہ چکے تو صبح کا نور بھی چمکا۔ اور زبان شعاعی میں گویا ہوا:

اپنی تجلی کی قسم روئے محمدؐ کا میں آئینہ ہوں۔ اس کی زبان درازی بجلی کی طرح گری بچوڑ عشق باز بیتاب ہوگیا۔ اور کلیجہ تھام کر عیدگاہ کی جانب چلنے لگا۔ وہاں کچھ سائل تھے۔ کچھ مسئول تھے۔ کچھ اُجلے تھے۔ کچھ میلے تھے۔ آنکھ نے کہا۔ غریبوں کی یہ عیدگاہ نہیں ہے دل نے کہا ناز کا مقام تو یہی ہے۔ تو اگر نیاز کی عیدگاہ تلاش کرتی ہے تو حجاز میں جا۔ یثرب کو دیکھ۔ چند پیچیدہ گلیاں نظر آئیں گی۔ ان کی دیواروں پر راز و نیاز کے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوجائے گا کہ مقصود کہاں دستیاب ہوتا ہے،،

غریبوں کی عیدگاہ مہربان ہوئی۔ اور اس کے امام نے جھک کر گلے لگانا چاہا۔ مگر مشتاق سینے نے کہا۔ نیازمندی کا ناز قدموں سے ملنا چاہتا ہے۔ اسکی یہ مجال نہیں کہ سرکار کے سینہ تک بڑھنے کی جرأت کرسکے۔ یہ ادب پسند کیا گیا اور ارشاد ہوا۔ دیوانو یہ قدم ہمیشہ تمہارے رہیں گے، تمکو عید مبارک بے قراروں نے جواب دیا: ؎

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو — انبساطِ عید دیدن روئے تو

پیا اجمیری

ہستی کے مست

ازنظام المشائخ جون ۱۹۱۴ء

فطرت جس کو آجکل نیچر کہتے ہیں۔ قدرت جس کا نام اس زمانہ میں عادت طبعی ہوگیا ہے۔ اجمیری پہاڑوں میں مست تھی۔ مگر مست نہ تھی +

نیچر کی مستی پہاڑوں کی ہستی میں سکوت ہے۔ سمندر اور دریاؤں میں شور و روانی ہے۔ جمادات میں پابندی ہے۔ نباتات میں شگفتگی اور سرسبزی ہے۔ حیوانوں میں

حرکت خود اختیاری ہے۔ اور انسانوں میں ہوشیاری و دلفگاری۔ دلداری وجفاشعاری ہے ۰

اجمیر کے جمادات۔ نباتات۔ حیوان۔ انسان۔ سات سو برس پہلے مست تھے شکلیں رکھتے تھے۔ لیکن یوم الست کے مست خواجہ پیا کے قدم آنے سے مستی میں آگئے مستی کے دم سے بستی ہے۔ چشتی خواجہ کا اس سنسان خاکستان میں پاؤں رکھنا تھا کہ کوہستان کے ہر تنکے سے پھول میں دُنیا جہان کی آبادیاں نظر آنے لگیں۔ جنگل کھلی کھلکھلا کر ہنسی۔ اور اپنے اندر کی بستیاں نازک پتیوں پر دکھانے لگی ۰

چنبیلی کے پھول پر شبنم

خواجہ پیا۔ موہن سیاں۔ کالی کملیا کاندھے پر ڈالے۔ وحدت کی بانسری ہاتھ میں لیئے جب اس بیابان میں جلوہ افروز ہوئے تو ایک چنبیلی کے پھول نے اپنی ہری بھری ٹہنی میں جھوم کر خواجہ پیا کے چرنوں پر سر جھکایا اور اپنے سینہ و گردن کے موتیوں کے شبنمی ہار کو ادب سے نذر چڑھایا۔ اور کہا۔ پالاگن مہاراج۔ ایک رات کی عمر والی ہستی آپ پر قربان۔ میری بپتا سُنتے جائیے ۰

میں ذرات خاک کا مجموعہ ہوں۔ فطرت ونیچر نے ہست ہونا چاہا تو مٹی سے سر نکالا۔ شاخیں بڑھائیں۔ پتے پھیلائے۔ کانٹے چُھنے۔ اور پھر ایک دن شام کو سبز فام کچی کلی کی صورت نمودار کی۔ وہ رات ارمانوں کی رات تھی۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا تو کلی سبزی سے سفیدی کی جانب بڑھتی تھی۔ بند پتیوں میں سرگوشیاں ہوتی تھیں۔ ہر پتی دوسری پتی کے سینے سے لگتی اور کہتی ؎

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اُس شب ہر ذرۂ گل میں خمار تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہر پتی میں کس کثرت سے ذرے

تھے۔ اور اِن سب کی مخموری سے میرے سرور کا کیا عالم ہو گا +

میں نے سمجھا کہ زندگی بڑے مزے کی چیز ہے۔ کھلنے کا وقت آ رہا ہے۔ اور شباب اپنا گھر بنا رہا ہے۔ ابھی وجود کل کی پیکر پوری تیار بھی نہیں ہوئی ہے۔ اور جذبات کی رنگا رنگیاں لذتوں کا مینہ برسانے لگیں۔ جب سب کچھ تیار ہو جائے گا تو خدا جانے کیا مزا آئے گا +

اسی اثنا میں مرغ نے صدا بلند کی۔ مندر کا گھنٹہ بجا۔ نسیم سحر آنکھیں ملتی اور مستی میں لڑکھڑاتی نمودار ہوئی۔ اور ہمارے درخت کے بدن میں گدگدیاں کر کے آگے بڑھنے لگی مجھ کو بے اختیار ہنسی آئی۔ مگر ہنسنے کی دیر تھی۔ ایک ہی جنبش میں پتیاں کلی کی ہم آغوشی سے جدا ہو کر تھرتھرانے لگیں۔ اور صبح صادق کے اُفق کو سامنے دیکھ کر شرمانے لگیں +

اب کیا تھا آسمانی نور نے زندگی کا دوسرا دور دکھانا شروع کیا۔ آس پاس کی جھاڑیوں سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی۔ ہوا نے ہمارے شباب کی مستی کو اپنے دامنوں میں بھر کر چپ چاپ جنگل میں بکھیرنا شروع کیا +

یہ زمانہ ختم نہ ہوا تھا کہ آسمان کی آنکھ کا آنسو قطرۂ شبنم کی شکل میں مجھ تک آیا۔ اور کہا۔ پھول! مجھ کو جگہ دے کہ فلک نے نظروں سے گرا دیا۔ میں نے ہاتھوں ہاتھ اس کو لیا۔ مگر میرے ذرات نے اس کو جذب کرنے سے انکار کیا۔ بیچارے کو ادھر ہی کے کنارے ٹھیرائے رکھا +

اتنے میں سورج نکل آیا۔ کرنوں نے شبنم کو چھیڑنا شروع کیا اور بیچاری بوند کا گھڑی بھر ٹکنا دو بھر کر دیا۔ آخر وہ گھبرا کر موت موت پکارنے لگی۔ اور میرا دل موت کا نام سُن کر سہم گیا۔ میں نے خیال کیا تو کیا مجھ کو بھی موت آئے گی۔ اور ان ولولہ خیز خوشیوں کو خاک میں ملائے گی +

یکایک آپ کے جمالِ باکمال پر نظر پڑی۔ شبنم کا قطرہ جلدی سے آپ پر تصدق ہوگیا۔ مجھے بتائیے کہ میں کیونکر قربان ہوں کہ اس موت کے کھٹکے سے نجات پاؤں۔

خواجہ پیارے نے گلابی۔ مستانی آنکھ سے اس فریادی پھول کو دیکھا۔ اور خبر نہیں نظروں ہی نظروں میں کیا کہہ دیا کہ پھول مستی میں آگیا۔ اور بولا۔ پالیا۔ مل گیا۔ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ اس نگاہ پر سب کچھ نثار۔ میرے پیا۔ میرے سیاں۔ تو ملا تو سب کچھ ملا۔

پیکرِ امکان کیوں دلگیر ہے

(از نظام المشائخ۔ دسمبر ۱۹۱۴ء)

لامکاں نہیں مکان۔ مکان نہیں مکین۔ مکین نہیں کن کا حرف جس کو کون و مکون کہتے ہیں جس نے اپنا گلا قوتِ ایجاد کی چھری سے کٹوایا۔ اور پھر مخلوق کے آگے بڑھ کر انسان کہلایا۔ یہی پیکرِ امکان کا کائناتِ شادان و فرحان میں اسیرِ پنجۂ دلگیری ہے۔ اسی کو وحدت نے فرقت کی شکل بنکر ستایا ہے۔ یہی کہتا ہے الٰہی ہجر میں کلیجہ منہ کو آیا ہے۔ چیونٹی رفیقِ زندگی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ مکھی اپنے جوڑے کے ہمراہ اُڑتی پھرتی ہے۔ بگلا دریا کے کنارے روئی کی بہار سے سفید ہے۔ کوا گھر کی دیوار پر اپنے مونس کو لیے بیٹھا ہے۔ اور کالی رنگت پر فخریہ چہچہاتا ہے۔ ریل کے پہیے آہنی ہم جنس سے گلے ملکر چلتے ہیں پھول ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلتے ہیں۔ پانی کے قطرے کیسے ملے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ذرتے کس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں پہاڑ لہا پہاڑ کی ملنساری سنگی ذرات کی باہمی ہم نشینی سے ہے۔ دریاؤں کی روانی پانی کے میل جول سے ہے۔ چاند تاروں کو لے کر چمکنے آتا ہے۔ سورج شعاعوں کے حلقہ میں موج اُڑاتا ہے خود اُس کو دیکھو جو جدا ہے۔ ہر ہے امر میں ہے۔ اور پھر کہنے کو سب سے جدا ہے۔ جس کی

وحدت ویکتائی کی گھر گھر دھوم ہے۔ جو نہ ملنے اس کے لیے خطاب احمق و شوم ہے وہ بھی اکیلے پن سے اُکتاتا تھا۔ دیکھنے دکھانے کی ہوس میں خاک کے پتلے بناتا تھا۔

آدمؑ کو خلیفہ کہا۔ دیکھا دکھایا۔ نوحؑ کو۔ ابراہیمؑ کو۔ موسیٰؑ کو۔ عیسیٰؑ کو۔ اُن کے زمانے میں محرم راز بنایا۔ ابراہیمؑ سے کہا میرا خلیل ہے۔ موسیٰؑ کو آگ کے بہانے پاس بلایا۔ اور کہا تو کلیم ہے۔ کچھ اور ترنگ آئی۔ دل لگی کی ٹھہرائی۔ بولا۔ جوتیاں اُتار دے اور سانپ سے کھیل۔ جی بہلا۔ اور فرعون سے لڑ۔ مٹی کی مورت اپنے بنانے والے کی مہربانیاں دیکھ کر اترائی۔ اور صورت دیکھنے کی صدا لگائی۔ کہا کر تو دیکھ نہیں سکتا۔ اور پھر جلدی سے ناسوتی آنکھ کے سامنے لاہوتی جلوہ نمودار کر دیا۔ تاب کہاں سے آتی۔ پتلا سینہ تھام کر رہ گیا۔

عیسیٰؑ کو اپنی روح کہہ کر پکارا۔ عالم تعین میں بھیجا کر مُردے جلائے۔ پھر کہا کہ تیرے بعد اس کی باری ہے۔ جو محبوب جناب کردگاری ہے۔ محمدؐ نام۔ محمدؐ کام۔ محمدؐ سرانجام۔ رفیق اعلیٰ۔ رفیق ظاہر۔ رفیق باطن۔ معراج میں بلایا۔ دو کمانوں یا اس سے بھی تنگ فاصلہ پر ٹھیرایا۔ کچھ کہا۔ کچھ دیکھا۔ کچھ دکھایا۔ اب تیرہ سو برس سے خبر نہیں کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کس شغل میں مشغول ہے۔ مسرور ہے۔ یا ملول ہے۔

مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش۔ وہ تو عین ذات میں سرشار ہے۔ مشکل میں میرا آزار ہے کہ عالم امکان و تعین کی تصویر ہوں۔ وحدت کے ہاتھوں ہجر و فراق میں اسیر ہوں۔ جب اس نے اپنی واحد خوشی کو اکیلا نہ رہنے دیا۔ اور صفاتی شکلیں جی بہلانے کو بنائیں۔ جب اُس نے ہر موجود کو اس کا ہم جنس وجود دیا جبکہ اُس کی نیچر اس بات کی رفاقت میں دی گئی۔ جبکہ اُس کی قدرت حیلہ و وسیلہ کی دست نگر رہی تو میں کیوں اکیلا ہوں۔ میری دلگیری ختم کیوں نہیں ہوتی۔ مجھ کو میرا دلدار کیوں نہیں ملتا۔ حجاز کتنی دور ہے۔ کھجوروں کے باغ کتنے فاصلے پر ہیں۔ وہ مقام کہاں ہے

جہاں سرورِ عالم شکستہ دلوں کو کھجوروں کے پتوں سے باندھتے تھے۔ میرے پاش پاش دل کا مرہم انہیں کے پاس ہے۔ یہ زخم انہی کے نشتر سے چیر اگیا۔ وہی پٹی باندھینگے کوئی چارہ ساز ہو یا نہ ہو۔ کوئی دلنواز ہو یا نہ ہو۔ مدنی شیام سُندر کی یاد کافی ہے۔ جبکہ اُس کی آس ہے تو پھر کیا ہراس ہے۔ میری آنکھوں کے خالی کٹھورے آنسوؤں کی لبریزی مانگتے ہیں۔ میرے سینے کے خالی کچھوے محمدی آرام جان چاہتے ہیں۔

میں نہیں۔ ایک اسیرِ دستِ بیداد فریاد کرنے کھڑا ہوا ہے۔ سب سہارے دل کو قطع کرکے ایک سبز گنبد کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ دیکھیئے۔ دل کی گرہ کون کھولنے آتا ہے۔ درد بھی اُس حکیم کے گھر جانے کے وقت ملا تھا علاج بھی یہیں ہوگا فرقت بھی اس کوچہ کی گردش میں پالے پڑے تھی۔ وصال بھی اِس گلی کی ٹھوکریں کھانے سے میسر آئے گا۔ اسیر ہوں۔ دلگیر ہوں۔ اُفتادہ پامالی رہگیر ہوں حیات کا مجاز ہوں۔ ممات کی حقیقت ہوں۔ حرکات کا عکس ہوں بے اختیاری کا سایا ہوں۔ محمد محمد تیرے دروازہ پر آیا ہوں۔ یا اُس کو بلا۔ یا تو مل جا ۔

پردیسی پیتم دیکھی تمہاری پریت

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

اُس کے لیئے میں۔ میرے واسطے وہ۔ دونوں اجنبی اور پردیسی تھے۔ فاصلہ کچھ بڑا نہ تھا۔ بس اتنا کہ تین بار پلک جھپکے۔ میں اس کا وہ میرا پیتم کہلایا۔ اس نے مجھے میں نے اسکو اپنا بنایا۔ اِن دنوں سورج مشرق ہی سے نکلتا تھا اور دریاؤں میں خاک کی جگہ پانی ہی بہتا تھا۔ جب تک سمندر میں آتشی طوفان کا ذکر سننے میں نہ آیا تھا۔ ہر چیز اپنی تھی کوئی بھی پرایا نہ تھا ۔

ایک رات کھجور کی ٹہنیوں میں ہوا جھولا ڈالنے آئی۔ اور بیری کی شاخوں میں مکھی بھنبھنائی دل سرشار تھا تخیل مستغرق۔ بحر ناپیداکنار تھا۔ ہوا کو نذ دینہ دی اور مکھی کے سامنے مستی نہ رکھی۔ اس بات سے خدا ناراض ہو گیا۔ اور اس نے اپنے جہاں کا رخ میری طرف سے بے رخ کر دیا۔

میں نے کہا۔ دنیا بے رُخ ہو جائے۔ میرا پردیسی پیتم رُخ نہ پھیرے۔ پیارے پیتم نے میرے قول کو چوم لیا۔ اور قول کے جسم کو سینے سے لگا لیا۔ خدا کو ہم دونوں کی محبت پسند آئی۔ اور اس نے توبہ کے دروازے کھول دیئے۔ سورج نے کہا۔ میں مغرب سے نکل آؤں گا۔ اس وقت یہ در بند کرنا پڑے گا۔ پردیسی پیتم نے اپنے رخسار کو سورج کی جانب موڑ کر کچھ کہے۔ سورج بن سُنے شرما کر پیچھے کو ہٹ گیا۔ میں نے کہا پیارے تمہارا منہ ہے یا شمس الضحیٰ۔ اس نے جواب دیا بر رخ کبریا۔ میں نے کہا تو لاؤ تم کو سجدہ کروں۔ بولا خبردار! فانبئہ مثلکم میں نے کہا اور وحی یوحیٰ! مسکرا خاموش ہو گیا۔ شرما کر نظریں جھکا لیں۔

کیا لطف کی راتیں تھیں۔ کیا مستی و سرور کی گھاتیں تھیں۔ کیا باہیں تھیں۔ کیا گردنیں تھیں۔ جو ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کیا لمبے بال تھے جو اُلجھتے تھے۔

مگر دیکھو تو۔ وہ پردیسی روٹھ گیا۔ میں تو لڑا نہ تھا۔ وہ کیوں خفا ہو گیا۔ اونٹوں کے قافلے میں کہیں چھپا ہے۔ چاند مسکراتا ہے۔ کیا اسی کے اندر گیا ہے۔ تارے کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں اور ان میں ہو بہو اسکی ضیا ہے۔ ہاں یہیں ہو گا۔ ان کو توڑ لو۔ آسمان سے جدا کر دو۔ زمین پر رکھ کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھو۔

نہیں سُنو۔ یورپ کے میدانوں میں گرج کی آواز آتی ہے۔ اُس کو جنگ کی زمین بہت بھاتی ہے۔ شاید وہاں جا نکلا ہو۔

اوقیانوس سے پکارنا۔ وہ فیلڈ مارشلوں کو نقشے بتاتا ہو گا خندقیں کھدواتا ہو گا۔

زخموں کی مرہم پٹی کرتا ہوگا۔ لاشوں کو دفنانے کی فکر میں مصروفیت ہوگی +

کیوں پردیسی تم یہاں ہو۔ اور ہو تو کس کیمپ میں۔ اتحادیوں میں یا بیدادیوں میں یا جرمن میں یا انگریزی خرمن میں بولو۔ من جاؤ۔ بس ناراضی ہوچکی۔ میں نے مانا کہ اُمت کی لاشوں کو یورپ میں دیکھنے گئے ہو۔ مگر اپنے اُس کو بھی ساتھ لیا ہوتا۔ جو ایک دم کو جدا نہ کیا جاتا تھا۔ نہ بولو گے تو ہم بھی بولنا چھوڑ دیں گے۔ نہ آؤ گے تو ہمارا بھی آنا جانا بند ہوجائے گا +

ہیتم ہیتم۔ پیارے۔ راج والے۔ میاں کہاں ہو۔ ذرا تو ترس کھاؤ اور جواب دو۔ آسمان چہارم کے عیسیٰ تک تمہاری خاموشی سے بے قرار ہیں۔ فرشتے ان کی آہ وزاری سے بیزار ہیں۔ مگر مجھے ان سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ وہ تو اُمت کی سفارش کے لیے تم کو ڈھونڈتے ہیں اور میں فقط تمہاری دید چاہتا ہوں +

نہیں بولتے۔ دروازہ نہیں کھولتے۔ کیسے دلدار ہو۔ کیونکر کہوں کہ جفا شعار ہو تم نے کبھی جفانہ کی تھی۔ آج کیا ہوگیا +

اُفوہ۔ میری بے صبری۔ میری بے چینی۔ کیا ہی اقرار تھا۔ کیا اسی سلوک کے قابل یہ گنہگار رہتا۔ اگر سرِ لایقِ دار تھا تو یہاں کسے انکار تھا۔ مگر جدائی کی سزا خلاف تہذیب قانون بین الاقوام عشق ہے۔ یہ بڑی وحشیانہ پاداش ہے۔ ہائے اب بھی رحم نہ آیا۔ نہ خود بولے۔ نہ کسی قاصد نامہ بر کو بھجوایا + واہ۔ بس۔ پردیسی ہیتم دیکھی تمہاری سنگا پریت +

رَس کے بھرے توٗرے نین

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

خونخوار آنکھیں۔ اشکبار آنکھیں۔ دلدار آنکھیں۔ دلفگار آنکھیں۔ میں کیا کہوں کہ

وہ ہیں زہر دار آنکھیں +

آنکھ تھی یا نرگس کا پھول۔ پھول تھا۔ یا دل میں چبھنے والا کانٹا۔ نہیں کانٹا نہیں یہ پھول ہے۔ وہ شامپین وحدت کا لبریز گلاس تھا۔ شاید اب بھی نشہ میں غلط کہا۔ وہ نشتروں کا پیکٹ نہ ہو۔ چھری کی دھار نہ ہو۔ تیر کی نوک نہ ہو۔ مگر دل تو کہتا ہے وہ آنکھ رسیلی، کٹیلی، نشیلی تھی۔ اس میں سے نور برستا تھا۔ سرور ابلتا تھا۔ اس نے اپنا رس دو پیالوں میں مجھ کو بھی دیا تھا۔ دل کی گواہی معتبر نہیں۔ اس کو جنون ہے۔ وہ وارفتہ مزاج ہے دماغ سے پوچھو کہ چشم زیر بحث کی نسبت بیان دے۔ حق کو جان کر سچی زبان دے۔

جناب عالی! وہ حجاز کی بنی ہوئی دونالی بندوق تھی۔ ایک سکنڈ میں دس کروڑ فیر کرتی تھی۔ یا وہ بے تار کا تار وار اشارہ تھا۔ یا کھاری سمندر کا کنارہ تھا۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ وہ رولا رہی تھی۔ اور ہنسا رہی تھی۔ اور آزاد ہستیوں کو جال میں پھنسا رہی تھی +

دماغ میں بھی خلل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی کسی سودے کا دخل ہے ایسے کوئی تو کہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک کیا تھا۔ آنکھ تھی۔ یا طلسم ہوش ربا تھا +

جی ہاں۔ چھ معتبر اشخاص اس گھر میں ہیں۔ چار مرد۔ دو عورتیں۔ ان سے دریافت ہو تاکہ تحقیقات خلجان بے خودی سے واگزاشت ہو +

آپ کون۔ اسم شریف؟ ابو بکر بن ابی قحافہ۔ کچھ ان آنکھوں کے بارے میں واقفیت ہے؟ کیوں نہیں۔ میرے یار۔ میرے خلیل۔ محبوب خدائے جلیل کی آنکھیں ہیں۔ انہیں کو دیکھ کر میں بوڑھا جوان ہو گیا۔ انہی آنکھوں نے مجھ کو چشم بصیرت عنایت فرمائی +

دوسرے صاحب تشریف لائیں۔ آپ کا اسم گرامی؟ عمر ابن الخطابؓ۔ ان آنکھوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ میری رائے ان آنکھوں ہی نے چھین لی۔ اور خود میری رائے بن گئیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہیں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ فاتح ہیں۔ ملک گیر ہیں۔ قاتل ہیں اور سب مقتول انہیں کے اسیر ہیں +

تیسرے بزرگ کہاں ہیں۔ آپ کا اسم مبارک؟ عثمان ابن عفان ؓ۔ ان آنکھوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کن آنکھوں کے متعلق؟ یہ جو سامنے ہیں۔ میری زبان شرماتی ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے۔ اور عقل چکراتی ہے۔ چوتھے صاحب کو بلائیے۔ اور مجھ سے کچھ نہ کہلوائیے

ان حضرت کو تکلیف دیجائے۔ صورت سے ذکی اور ذہین نظر آتے ہیں۔ دیکھئے یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا اسم عالی۔ مجھ کو علی ابن ابی طالب ؓ کہتے ہیں۔ مگر میں ابھی کچھ نہ کہوں گا پہلے ان دو عورتوں کا بیان سُن لیجئے +

اچھا اول ان بی بی صاحبہ کو تکلیف دو۔ اور پہچانتی ہیں یہ آنکھیں دکھاؤ آپ کا نام نامی ارشاد فرما سکتی ہیں؟ مجھ کو عائشہ صدیقہ کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آنکھیں کیا ہیں؟

بعد مدت کے ہوئی دید تری آنکھوں کی۔ یہ میری گود میں بند ہوئی تھیں۔ یہ مجھ کو محبت سے دیکھتی تھیں۔ ان کو میں نے آسمانوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھا۔ ان کو آنسوؤں میں غرقاب پاتی تھی۔ انہی کو دیکھ دیکھ کر میری تن بدن میں جان آتی تھی +

دوسری سیدہ کو بھی دکھاؤ۔ اور ان کے فرمان کو قلمبند کراؤ۔ حضرت کا نام مبارک؟ مظلوم فاطمہ بنت صاحب العیون۔ یہ میرے بابا جان کی آنکھیں ہیں جو مجھ سے خفا ہو کر کہیں چلی گئی تھیں۔ یہ میرے حسن ؓ حسین ؓ کو پیار کرنے والی انکھیاں ہیں۔ یہ میرے ہاتھوں کے چھالوں کو دیکھنے والی ہیں۔ مجھے دو کہ مدت کے بعد میں نے پائی ہیں میں ان کو آنکھوں پر رکھوں۔ دل میں چھپالوں۔ میں کچھ نہیں کہتی۔ انھیں سے پوچھو کہ یہ کیا ہیں +

علی ؓ نامدار۔ اب تو فرمائیے۔ اُلجھن کا خلفشار مٹائیے +

دیوانوں کو ہوشیار کرنے والی ہیں۔ ایک طرف خونخوار ہیں۔ ظالموں کا قصہ پاک کرتی ہیں۔ ایک جانب اشکبار ہیں۔ خوف ذوالجلال سے تر رہتی ہیں۔ بے دلوں کی دلدار ہیں۔ دلوں کو قرار دیتی ہیں۔ سنگدلوں کا نشتر ہیں۔ فگاران کا کار ہے۔ یہ رس کے بھرے ذہین

ہیں۔ انہی کی مٹھاس سے لب بند کونین ہیں۔ خمار بخش ہیں۔ خمار شکن ہیں۔ یہ چشم محبت میرے بھائی محمدؐ کی ہے۔ یہ چشم فسوں ساز میرے مولا سرور کائناتؐ کی ہے جس پر سحر کاری کا الزام لگایا گیا۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ وہ یہ ...... آنکھ کھل گئی۔ منزل مل گئی۔

اجمیری چنبیلی کا پھول

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

...... مت بھول۔ یہ اجمیری چنبیلی کا پھول ہے۔ اس کی دید میں ہر ارمان حصول ہے ایک ہار خریدو گلے میں اٹکا کر سینے سے لگاؤ۔

کیوں جناب داتا چنبیلی۔ آپ نے آنکھ کھولی۔ کلی سے پھول بنے۔ ذرا ہماری کلی کے لیے بھی تھوڑی سی صبا منگوا دو۔ اس کی بند پتیوں کو کھلنے کی اور کھلنے کی اجازت دلوا دو۔ بھائی مقبول حبیب اگر ہو تم چاہو تو تمہارے خواجہ بھی مہربان ہو جائیں۔ خواجہ کی نظر مہر ہو تو اللہ میاں کی عنایت میں کیا دیر ہے۔ اسی خود غرضی کیلئے اتنا چکر اتنا پھیر ہے بندہ مشرک نہیں۔ تم کو اور تمہارے خواجہ کو خدا یا شریک خدا نہیں مانتا۔ مگر تمہارے وسیلے کے سوا کسی کو نہیں جانتا پہچانتا۔ دل کے لگاؤ کے واسطے ایک رشتہ درکار ہے۔ رشتہ کہاں سے لاؤں۔ قطع برید کا زمانہ ہے۔ رگ گل میں تمنا کو پروتا ہوں۔ تم سے کہتا ہوں۔ تمہارے خواجہ کے آگے روتا ہوں۔

کہنا چمن حیات سے یقین کی بہار خفا ہو کر چلی گئی۔ وہم۔ شک۔ گمان نے ہر غنچہ کو گھیرا ہے۔ بلبل نہیں۔ زاغ چونچیں مارتا ہے۔ اور کہتا ہے یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے۔ باغ اُجڑ جائے گا۔ اس وقت آپ کو توجہ ہوگی۔ تو کیا ہاتھ آئے گا۔ اے اجمیری پھول اتنا کہہ دے گا تو بڑا اجر پائے گا۔

زُلف کا ماجُرا

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

اندھیری رات میں سوائے اس کے میں اور کیا بیان کر سکتا ہوں کہ وہ سیاہ بال تھے ان میں پیچ و خم تھے۔ کنگھی سے اُلجھتے تھے۔ مشکل سے سُلجھتے تھے۔

شاعروں نے ان کو گیسوئے عنبریں کہا۔ زلف پیچاں نام دھرا۔ میں نے یہ ماجرا سُنکر خلقت کی آہوں کو فراہم کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ سُنتا تھا۔ آہ بھی کالی ہوتی ہے۔ اس میں بھی پیچیدگی کا جنجال ہوتا ہے۔ لوگوں نے کہا دوسروں کی آہ مانگتے ہو۔ تم بھی تو سینۂ سوزاں رکھتے ہو۔ ایک شرارہ آہ اپنا بھی دو۔

میں گلِ چمپا کی بوئے مست میں مشغول تھا۔ پبلک مطالبہ سے چونکا۔ چاہا کہ ایک آہ تاریک کھینچوں۔ مگر دل نہ مانا۔ پھول کی بوئے پیچیدہ کو آگے بڑھا دیا۔ خوشبو بل کی لائی۔ غمزہ سے اترائی۔ اور بولی اکیلی نہ جاؤں گی۔ شمع کے دھوئیں کو ساتھ بھیجو۔ خوشبو کی یہ ادائے محبوبانہ دل کو بھائی۔ آہ کو بلایا۔ شمع کے دھوئیں کو بھجایا۔ اور تین پیچیدگیاں کو اللہ بیلی، اللہ نگہبان کہا۔

اب زلف کا ماجرا شروع ہوا۔ سارے جہان کی آہیں۔ دُنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو کل بزم کائنات کی شمعوں کا دھواں مل جل کر گھر سے چلے۔ تو دیکھا۔ عرب کے ایک شہر مدینہ میں ایک کاکل دراز کھڑے ہیں۔ اور سورۃ واللیل پڑھ رہے ہیں۔

اس مردِ عرب کے گیسو دیکھ کر ہر پیچیدگی شرما گئی۔ اور بولی:-

آشفتہ می دارد مرا زلف سمن بوئے شما

زلفوں والے منہ سے نہ بولے۔ ایک دوسرے کمبل والے کے سر پہ ہاتھ رکھ

یہ بھی گیسو دراز تھے۔ اور فرمایا :-

جاؤ میرے حسن ہندوستان سدھارو۔ سلطان الہند لقب دیا۔ وہ ملک تاریکی شرکت سے کالا ہے۔ وحدت کا نور لیجاؤ۔ اُجالا بانٹو۔ میرے بنو۔ میرا بناؤ +

خبر نہیں اس ہاتھ میں کیا تاثیر تھی۔ زلف حسن جھومنے لگی۔ اور بل کھاکر چلائی مجھ کو معین الدین حسن کا درجہ دیا۔ دین حسن کی اعانت میرا فرض ہے۔ اور ہندی دلوں کی اُلجھن سلجھانا۔ دل کا ارمان۔ زلف کا اتنا ہی ماجرا سُنا تھا۔ کہ رجب کا چاند نظر آیا۔ ہندو مسلمان کے گھر میں عید آئی۔ اجمیر اجمیر کی دھوم مچی۔ ہر ہستی اپنی بستی چھوڑ سر گھر سے چلی۔ دیکھا پہاڑوں کی آغوش میں گنبد سفید کی وہی شان ہے جو مدینے میں گنبد سبز کی تھی۔ زبان سے نکلا ؎

در خواجہ یار و درِ مصطفےٰ ہے ۔۔۔ سراسر مدینے کا نقشا کھچا ہے

ادب نے کہا خاموش سلسلۂ زلف میں اسیر ہو۔ زبان بند کر۔ تقریر نہیں۔ تاثیر ہو۔ تاکہ دل کے اُلجھاؤ سلجھیں۔ من موہنی مراد ہاتھ آئے +

چارۂ تشنہ لبی

از خطیب ۲۲ - مئی ۱۹۱۵ء

اجمیر کا عرس۔ مئی کا مہینہ۔ خلائق کا انبوہ۔ جس میں ہندو بھی مسلمان بھی۔ دانا بھی نادان بھی۔ مگر ہر جان پانی کی خواہاں۔ اور پانی مثل حجاز خطہ میں نایاب +

اخباروں نے چھاپا۔ اس کا تدارک ضرور ہو۔ اہتمام کرنے والوں نے کمر یں باندھ لیں۔ حضور نظام کے وعدے چشمہ کشائی بھی یاد آگئے۔ مگر دل نے انگڑائی لے کر کہا۔ میری پیاس کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کے لیے کون ناہمدرو ہے۔ جو کنڈی کھٹکھٹائے گا۔ تشنہ کامی

جان لبوں پر آئی ہے۔ روح کی زبان خشک ہے۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہے۔ کوثری خواجہ سے کہو۔ اس تشنہ لبی کا چارہ کار نہ بنے تو اخبار العشق میں ریمارک چھپائے جائیں گے۔ نکتہ چینی ہوگی۔ پھر نہ کہنا کہ یہ سخت نویسی حد سدیشن تک پہونچی ہے۔ پریس ایکٹ کے اشارے کنائے یا اور کسی انداز میں گرفتار کرو۔ اسپر پہلے ہی میں صاف کہے دیتے ہیں۔ اس پیاس کا انتظام کرنا ہوگا۔ خالی جام بھرنا ہوگا۔

ایک میں ہوں۔ ایک میرا اخبار ہے۔ مجھ میں اس میں اسی جام کی خاطر مدت سے یاری ہے۔ دودھ کی نہر نہیں مانگی۔ شہد کا چشمہ طلب نہیں کیا۔ سادے پانی کا ایک کٹورہ درکار ہے۔ بڑھا دو۔ منہ سے لگا دو۔ دل کی لگی کو بجھا دو۔ للہ بجھا دو۔ میں قربان۔ کوچۂ شرابی سے بچا کر عشق کے اصلی دارلخانہ تک پہنچا دو۔

آ، اے دل مجھ پر آ!

از خطیب ۲۲ جون ۱۹۱۵ء

تو اچھی صورتوں پر آتا ہے۔ میں بھی خدا کی صورت پر بنا ہوں۔ اچھی سیرتوں پر آتا ہے۔ تمام کائنات کی مخلوق سے افضل و اشرف سیرت رکھتا ہوں۔ تو لباس پر رفتار پر۔ گفتار پر۔ ادائے طرحدار پر جان دیتا ہے۔ دیکھ مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

پس میں درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر آ۔ یعنی مجھ سے محبت کر۔ میری الفت میں شہر تو مجھ کو کتنا پیارا ہے۔ سینے کے اندر۔ پہلو میں چھپا کر۔ سوائے تیرے کس کو رکھا ہے۔ اس جون کی گرمی میں تیری خاطر نیلوفر کا شربت پیتا ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے ریت پر لوٹتا ہوں۔ تاکہ تو خنکی سے راحت پائے۔ اور ماں اپنے

سائنس کا پنکھا

تجھ پر لگا رکھا ہے۔ جو دن رات چلتا رہتا ہے۔ اور تجھ کو ہوا دیتا ہے ۔

میرے دل میں تیری مخفی خواہش کو ذراسے اشارے سے تاڑ جاتا ہوں۔ اور جس طرح تو کہتا ہے کھاتا ہوں۔ پہنتا ہوں۔ چلتا ہوں۔ پھرتا ہوں۔ تیری ہی آنکھوں سے دُنیا کو دیکھتا ہوں۔ یعنی جس چیز کو تو چشم مسرت سے دیکھنا چاہتا ہے اُسی پر نظر ڈالتا ہوں اور کسی پر نہیں۔ تیرے ہی کانوں سے سُنتا ہوں۔ یعنی تیری مرضی کے خلاف کسی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ تو پھر کیا شرط انصاف ہے کہ تو مجھ کو چھوڑ کر دوسروں پہ آئے۔ مجھ سے بے وفا بنکر غیروں کی وفا کا عہد باندھے ۔

خبر بھی ہے۔ میں اُس خدا کا بندہ ہوں جس کو شرک سے نفرت ہے۔ ہر گناہ کی اس کے دربار میں معافی ممکن ہے۔ مگر شرک کی نہیں۔ پس میں کیونکر گوارا کروں کہ تو اغیار کی اُلفت میں مبتلا ہو اور میرا حق دوسروں کو دے ۔

اے دل تیرا نام ایک مجاز ہے۔ حقیقت میں مشکوۂ راز و نیاز ہے۔ میری اس تحریر کو چشم حقیقت سے پڑھ۔ اور خدارا مجھ سے محبت کر ۔

اگر تو مجھ سے محبت کرنے لگے تو خدا تک تیری رسائی ہو جائے گی۔ کیونکہ میری شناخت خدا کی شناخت ہے۔ چونکہ تو خود میرا دل ہے۔ جب میرے وجود کا عرفان حاصل کرے گا عرفان رب حاصل ہو جائے گا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ دلیل موجود ہے ۔

مگر ہائے تو مجھ کو بھول گیا۔ تو غیر کی چاہت میں میری وفا شعاریوں کو پس پشت ڈال بیٹھا ہے مجھے تجھ پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہوں اپنے سینے کو چیر ڈالوں۔ اور تجھ کو نکال کر پھینک دوں لیکن یہ بھی محال ہے۔ نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی۔ الٰہی یہ کیسی مشکل آئی ۔

اچھا تو میں دُنیا والوں کو تیری کج ادائی سُناتا ہوں۔ اور ان سے کہتا ہوں کہ جس کو سینہ سے لگا کر رکھا ہو۔ اس پر بھروسہ کبھی نہ کرنا۔ وہ تمہارا نہیں غیر کا طلبگار ہے۔ بلکہ خود

تجھ سے کہتا ہوں کہ خدا نے قدرت کا کارخانہ یوں ہی بنایا ہے کہ میں تجھ پر مرتا
اور تو دوسروں پہ لہذا تو جن پر مرتا ہے۔ وہ بھی تجھ سے بے وفائی کریں گے۔ اور تجھ کو
اسی طرح آتش فراق میں جلنا ہوگا۔ جس طرح میں جلا کرتا ہوں +

تو مجھ کو چھوڑ کر ماسوا پر فریفتہ ہوا۔ دیکھیو ایک دن ماسوا تجھ کو چھوڑ کر ایک
دوسرے ماسوا کا اسیر ہوگا۔ پھر تو ہوگا اور درد بھری آہیں۔ وہ آہیں جن کا کچھ نتیجہ
نہ نکلے گا۔ کیونکہ دوزخ کا عذاب ابدی اور غیر فانی ہے +

سوہنے دی یاد وچ

"ہچکی"

تو کیوں آتی ہے؟ میرا سجنا تو یاد نہیں کرتا؟ میرے من موہن شسندر کے دل میں
میرا خیال تو نہیں آیا +

پھر آئی۔ ہچکی نہ ستا، میرا سینہ ناتواں ہے۔ اس میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی
ہیں۔ تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اس کے زخم دکھنے لگتے ہیں سانس
رکا جاتا ہے۔ جب تو آتی ہے گردن کو جھٹکا دیتی ہے۔ اور ناف سے سر تک پٹھوں
اور رگوں کو ہلا ڈالتی ہے۔ میرا جی سانس سے گھبراتا ہے۔ اور پیا پیارے کی یاد
میں بے قابو ہوا جاتا ہے +

ہائے میں نے کیسے کیسے درد بھرے خط بھجوائے۔ لکھنا نہ آتا تھا دوسروں سے
لکھوائے۔ مگر اس نے کاغذ کا ایک پرزہ نہ بھیجا۔ دو حرفوں میں ہچکی کی۔ کس سے کہوں
میری نہ کوئی سکھی ہے نہ سہیلی ہے۔ اپنا ہے نہ پرایا ہے۔ کاش مجھ پر کوئی طعن

ہی کرنے والا ہوتا۔ اسی بہانے سے دل بہلتا اور اس کا ذکر سننے میں آتا ۔

میں نے اس کی خاطر رسوائیاں برداشت کیں۔ دنیا نے کچھ نہ کیا۔ لیکن اس نے اتنا نہ پوچھا کہ میں بھی کوئی ہوں۔ اب یہ ہچکی آئی ہے کیا (موہنے ڈاسینہا) پیام یار لائی ہے۔ اگر یہ اس کا خط ہے تو کس سے پڑھواؤں۔ خیال کی ڈاک میں سانس کا ڈاکیہ لایا ہے۔ وہی پڑھے گا۔ مگر آہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ تلھ (پیارے) مجھے بتا تو کیوں روندا (روتا) ہے ۔

میرا ساجن تو اچھا ہے ؟

یہ ہچکی موت کی خبر لاتی ہے۔ اس کے نہ دیکھنے کا ارمان دل میں رہا جاتا ہے۔ دنیا کا آسمان اب تک اونچا نظر آتا ہے۔ زمین اسی طرح بچھی ہوئی ہے۔ چولہے کی آگ ویسی ہی زبانیں نکال نکال کر جل رہی ہے۔ میرا دل اب تک تڑپ رہا ہے۔ گواہ رہو میرا خاتمہ دل وجان کے نام پر ہوتا ہے۔ جس کا ہمیشہ کلمہ پڑھا۔ مجھے قبر کا کچھ ڈر نہیں اس کی تاریکی کا اندیشہ کیا کروں۔ فرقت کی رات سے زیادہ اندھیری نہ ہوگی۔ اور میں نے ساری عمر انہیں راتوں میں بسر کی۔ میں منکر نکیر کا کیا خوف کروں۔ پیارے کا نام یاد ہے اسکی گلی کا پتہ یاد ہے۔ وہی میرا دین ہے۔ وہی میرا ایمان ہے ۔

زندگی کا چراغ بجھتا ہے۔ روح کا پروانہ دوسری شمع کے گھر جاتا ہے۔ اب گھر سے بستروں کو لپیٹو۔ آئینے توڑ دو۔ کسی کو بلاؤ۔ جو میرے غم میں گریبان چاک کرے ۔

آخری ہچکی آنے سے پہلے مجھے بیان کر لینے دو کہ میرا صیاد بڑا ہرجائی ہے کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کی سمائی ہے۔ نہیں آتا۔ تو ایک میرے پاس۔ اس واسطے اے دنیا کے لوگو! تم اگر اس کوچے میں آؤ۔ اور اس سے جی لگاؤ۔ جسکو خدا کہتے ہیں تو ذرا سوچ سمجھ کر آشنا کرنا ۔

آغوشِ مُحرّم میں شبِ عید

از نظام المشائخ نومبر ۱۹۱۴ء

آنکھوں نے رونا چھوڑ دیا۔ دلوں نے آہیں کھینچنی ترک کر دیں۔ اب کہیں سے سِسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں نہیں آتیں۔ اب کوئی عشقبازی کے کوچے میں قدم نہیں رکھتا +

آج وہ وقت ہے کہ زلف و کمر کا خیال بدترین گناہ مانا جاتا ہے۔ جناب حالی اس کے مفتی اعظم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ انہوں نے لاانتہا شاگرد وہم خیال پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک جانب مولانا اشرف علی اصلاح خیال کے درپے ہیں۔ ایک طرف خواجہ غلام الثقلین اصلاح تمدن کا ترانہ گاتے ہیں۔ انہیں کے پڑوس میں اسوۂ حسنہ کی صدا بلند ہوئی۔ نظام المشائخ بھی لمبی لمبی آیات و احادیث و اقوال و متانت لکھنے لگا۔ حسن نظامی تک اس گلی میں نہیں آتا +

اب اس سال زندگی کا کیا انجام ہوگا۔ جس کی روح خدا ہے۔ جسکو شیکسپیر نے مجسّم خدا کہا۔ اور جس کی حقیقت سمجھنے سے وہ عاجز ہوگیا۔ جس پر مولانا روم کو حال آتا تھا جس کو دیکھ کر حافظ شیرازؒ کا دم دینے سے گھبراتا تھا +

اب پروانوں کی پرستش نہیں ہے۔ اب شمع کی یادگاریاں مٹ رہی ہیں۔ آہ بلبل کی بدمستیاں خواب و خیال ہوئی جاتی ہیں۔ اب شاخ گل کا جھومنا کوئی نہیں دیکھتا اب گل کی چشم سرمگیں سے کسی کی آنکھیں نہیں لڑتیں +

اور کیونکر یہ چرچے باقی رہتے۔ ہر وجہ در روٹی اور عزت کے دام میں گرفتار ہے ہر ایک کو بال بچوں کی پرورش کا آزار ہے۔ جناب حافظؒ کے مطرب و مے کو کون پوچھے

رازِ دہر کا معمّا نوالے کھانے والوں نے چلکی حکمت سے حل کر لیا ہے +

کباب کھانے والے گذر گئے۔ شراب پینے والے گذر گئے۔ سرمد تک اہی عدم ہوئے۔ جو سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر اوقات بسری کر لیا کرتے تھے + جرمن کی سالہاسال کی تیاریاں بھی جنگ میں آئیں اور گذر رہی ہیں۔ یورپ کی نبرد آزمائیوں کے ولولے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ توپوں کے گولے بندوقوں کی گولیاں سنگینوں کی نوکیں سب اپنی زندگی کے دن آگے بڑھ بڑھ کر پورے کر رہے ہیں +

مگر محبت کو دُنیا میں رہنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ اُلفت کو اس دورِ حیات میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خارِ گندم کا الزام لگا کر ہر مجاز کو خوفناک بنا دیا۔ کیا حقیقت والے گندم نہیں کھاتے۔ کیا ان کے جذبات میں گندم کے دانے آگ نہیں لگاتے

مجاز اور حقیقت دو لفظ ہیں۔ جو ذہن انسانی کے بنائے خیالی ہیں۔ ورنہ نہ حقیقت کی کچھ ہستی ہے نہ مجاز کی۔ سوزِ لفظی کا کچھ نتیجہ ہے۔ نہ ساز کا +

آؤ! محبت کی ایک نئی دُنیا آباد کریں۔ آؤ! عشق کا ایک نیا آسمان و زمین بنائیں آؤ! اب وقت آ گیا ہے کہ ان پیٹ پیٹ پکارنے والوں اور دولت و عزت کے متوالوں کو بائیکاٹ کریں۔ یہ ہم کو جینے نہ دیں گے۔ ان کو کالج و اسکول بنانے دو۔ ان کو انجمن و کانفرنس میں غل مچانے دو۔ یہ اور ان کے سب حالی موالی یہاں رہیں۔ ہم وہاں اُٹھ چلیں گے۔ ہم انکے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم کو ایک سانس انکے ساتھ لینا دوبھر ہے +

انھوں نے بہت لکھنے والے بنائے ہیں۔ جو بھاپ کی مشینوں کی طرح انجان اور بے خبر رہ کر چلتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے بولنے والے تیار کیے ہیں۔ جو گراموفون کے ریکارڈوں کی مثل گاتے بجاتے ہیں۔ اور عالم بیچارگی میں دوسرے کے ہاتھ سے البم میں بند کر کے رکھ دیے جاتے ہیں۔ ہم بیمار ہوں تو ان کو بنفشہ گاؤزبان یاد آتی ہے سرسام کا خطرہ ہو تو سر کے بالوں کو نظر لگاتے ہیں۔ سردی آئے تو لحاف تو شک سے جی بہلاتے ہیں

گرمی آئے تو برف و پنکھے کے سامنے سر جھکاتے ہیں +

یہ مقلدوں میں وکیلوں کے محتاج ہیں۔ یہ چلنے میں جانوروں اور گدڑیلپائی کے محتاج ہیں۔ ان کو لباس کے لیے بھیڑ کی اترن اودن درکار ہوتی ہے۔ ان کا سہارا جھوٹ و مکر ہے۔ ان کی لپشت و پناہ دغا و جفاکاری ہے +

یہ خدا کو کیا جانیں۔ یہ اس کی امانت محبت کی کیا قدر کریں۔ منہ سے شرک خفی و جلی پکارتے ہیں۔ آنکھوں۔ ہاتھوں اور خیال داراد سے خود ہی سے اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اب ہم ان میں ایک دم بھی نہیں گزار سکتے۔ اب ایک لمحہ بھی ان میں رہنا دشوار ہے۔ چلو چلو کہ علیحدگی میں بیڑا پار ہے +

اس دُنیائے جدید کی کیا بات ہے۔ عید قرباں کی مستانی رات ہے۔ ہوٹل اکیلا کمرہ ہے سامنے کیپنی باغ ہے۔ میز پر آئینہ کے سامنے لیمپ جل رہا ہے۔ پرانی دُنیا کا کوئی پروانہ نہیں ہے۔ نورجہاں اسی منظر کے لیے کہہ گئی تھی۔ ع

نے پر پروانہ سوزو نے صدائے بلبلے

ہوا آتی ہے۔ مگر عاشق مزاج مچھروں سے گستاخی نہیں کر سکتی۔ مچھر آتے ہیں گاتے ہیں۔ حال میں لاتے ہیں۔ آغوش کھلا ہوا ہے۔ نہ تو غیری نہ من غیرم کی صدا ہے۔ ادھر مچھر۔ اُدھر مچھر۔ نیچے مچھر۔ اوپر مچھر۔ دائیں مچھر۔ بائیں مچھر۔ ہر طرف مچھر۔ ہر سمت مچھر۔ خیال میں بھی وہی۔ عالم مثال میں بھی وہی +

آ میرے پیارے مچھر۔ میری آنکھوں پر۔ میرے رخساروں پر۔ میرے ہونٹوں پر۔ میری ٹھوڑی پر۔ تو اس نئی دُنیا میں عشق کا پروانہ ہے۔ تو شاخ شجر محبت کا بلبل مستانہ ہے۔ آفاق ہا گردیدہ ام۔ بسیار خوباں دیدہ ام۔ لیکن تو چیزے دیگری +

میں شکل صورت کا پابند نہیں ہوں۔ میں سیرت کے حسن و قبح کو بھی دیکھنا خلاف آزادی سمجھتا ہوں۔ جو دل کو بھا جائے۔ جو تنہائی میں انیس و ہمدم بن جائے۔ جو سب کو

چھوڑ کر میرا ہو جائے جو ہوائے دہر کے مخالفانہ جھونکوں کے باوجود میرے پہلو سے جدا نہ ہو۔ وہی میرا ہے۔ اسی کا میں ہوں۔ باقی سب ہیچ۔

اس نئی دُنیا کے قوانین کچھ بھی ہوں۔ لیکن محبت اور اس کے رسول محمدؐ سے یہ آباد ہے۔ سُن لو۔ محبت کے پیام رساں نے کیا فرمایا۔

جو تیری دوستی کو دوسروں کی دوستی پر۔ تیری بات کو دوسروں کی باتوں پر تیری محبت کو دوسروں کی محبت پر ترجیح دے وہی تیرا دوست ہے۔ گویا ان کے خلاف دوستی نہیں ہے۔ میرے دلدار مجھ کو دیکھ لو سب اوصاف مجھ میں ہیں۔ میری بات سُننے آیا ہے۔ میری دوستی میں وطن سے ہجرت کی ہے۔ میری محبت کو تمام کائنات کی ہم نشینی سے مقدم جانا ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔

مَیں محبت کے پیامبر کے قربان۔ کیا بات سُنائی ہے۔ کیا دل کی بیکلی مٹائی ہے۔ ساری رات آنکھوں میں گزری آنکھیں لال ہو گئیں۔ خار کے ناسوت سے لاہوت تک پہونچیں۔ اندھیری رات نہ تھی۔ چاندنی نے لپک جھپک کر بجلیاں گرائیں۔ گملوں کے سبز پودے۔ شربت فتنے بنے۔ تشنۂ انتظار کو کسی کی آمد کی آہٹ کا سراب دکھایا۔ ہر لحظہ کلیجہ منہ کو آیا۔ آخر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مخلوق بشری کی تسلی کا یہ تخیل پرور ساماں بھجوایا۔

وہ میری ہر الجھن کے سلجھانے والے۔ وہ میری ہر دشواری کو آسان کرتے ہیں وہ شفیع اکبر ہیں۔ میری شفاعت کو دوسروں کے لیے سُنتے ہیں۔ تو کیا خود میری نہ سُنتے نہیں اس نئی دُنیا میں مجھ کو صرف محبت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ یہ پیغمبر بھی اُسی کے ہیں۔ اسی کے اشاروں سے کام کرتے ہیں۔ تو بتاؤ میں کیونکر آج کی تسکین کا شکرانہ بھیجوں۔ میں پرانی دنیا میں ان کو خدا کہتا تھا۔ اللہ کہتا تھا۔ رحمٰن کہتا تھا۔ رحیم کہتا تھا۔ یہاں ان کو صرف۔

محبت کے اسم صفاتی

سے یاد کرتے ہیں۔ وہاں ان کے ادب کی کچھ رسمیں تھیں۔ یہاں کے رواج سے میں واقف نہیں ہوں۔ تو انہیں کو سامنے کیوں نہیں بلا لیا جاتا۔ یہاں بھی پردہ قائم رہا تو بڑی مشکل ہوگی۔ انہی سے پوچھیں۔ انہی سے معلوم کریں کہ آپ کی مہربانیوں کی حمد و ثنا کیونکر ہوتی ہے۔ اور آپ کی دل نوازی کی داد کس طرح دی جاتی ہے +

حکم ہو تو آنسوؤں کے سمندر قدموں پر نثار کریں۔ ارشاد ہو تو ایک نعرۂ مجنونانہ بلند کر کے دنیائے جدید کو آپ کے الطاف کی خبر دیں۔ کچھ تو بولو۔ ہم بھی تو موسےٰ سے ہمکلام ہونے والے کی آواز سنیں۔ ہم کو بھی تو معلوم ہو کہ اُمتِ مرحومہ کے یہ درجے اور مراتب ہیں۔ آپ کے لحاظ و سکوت سے دم لبوں پر آگیا۔ ہم اور تو کچھ نہیں چاہتے فقط آپ کی تعریف کا طریقہ دریافت کرتے ہیں +

ہاں یہ۔ آہ یہ۔ ربنا انت۔ مولانا انت۔ ہکذا۔ مثل ہذا۔ ارے تو۔ اُفوہ آپ۔ اے قدر حضرت شمالی نئی دنیا کے دیوانو آؤ دیکھو نقاب اُٹھ گئی۔ پہلے میرے جدید محرم راز مجبوروں کو بلاؤ۔ جو راتوں کو ان کی یاد میں بلبلایا کرتے تھے۔ اور درد کے نالے نرالی صداؤں میں سنایا کرتے تھے +

دیکھیں۔ وہ یہ ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو پکارنا۔ جن کی خاطر آج کے دن انہوں نے سر کٹائے ہیں۔ دیکھو کھلم کھلا میرے گھر میں آئے ہیں۔ تم نے جان کھودی اور یہ جان لینے کو کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کیا بیچارے انجان ہیں۔ وہ سروں کی گردن پر چھریاں پھیر کر اور آپ بے خبر بنے کھڑے ہیں۔ یہ تمہارے ہی کھاونے تھے۔ تم ہی پر صدقے ہو گئے۔ آؤ ذرا آنکھوں میں تو آؤ۔ ذرا کلیجہ تو ٹھنڈا کرو۔ منم عبد و تو معبود۔ یا موجود۔ یا موجود +

تیسری منزل

سر دلبراں در حدیثِ دیگراں

آنسو کی سرگذشت

از رسالہ زمانہ سنہ ۱۹۰۲ء

جس دل میں درد نہیں اس کو انسان کے سینے میں نہ رہنا چاہیئے۔ آنسو نشان درد ہے اور مجھ کو اس کی سرگذشت بہت بھاتی ہے۔ زمانہ کی خاطر اسکو قلمبند کر دیا گیا۔ تا کہ سب درد آشنا دل دید کا لطف اُٹھائیں +

بیچارا آنسو اس گھر میں پیدا ہوا جہاں خوشی کی چہل پہل۔ اور شادی کی خوب گھما گھمی تھی چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر جس ننھے سے دل میں اس کا ڈیرا تھا۔ اسکو شکم مادری کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ آنکھیں بار بار اس وطن تاریک کو ڈھونڈھتی تھیں۔ اور مایوس ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آخر دل نازک کو تاب نہ رہی اس میں درد کا ایک دھواں اُٹھا اور آنسوؤں کو زبردستی آنکھوں تک کھینچ لایا +

یہ کشمکش مدتوں آنسو کو درپیش رہی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ بھرے پرے گھر میں بربادی شروع ہوئی۔ پہلے باپ مرا اور پھر ماں بھی رخصت ہو گئی ایک جوان لڑکی اور چھوٹا سا لڑکا زندہ بچا۔ باقی سب کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکی ہوشیار تھی۔ بار بار بیکسی و لاچاری کا خیال آتا۔ اور غمزدہ دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ آنسو اُمنڈ اُمنڈ کر آتے حسین و غمگین آنکھوں میں تیرنے لگتے۔ مگر یہ دکھیاری انکو زبردستی پی جاتی۔ تا کہ معصوم بھائی نہ دیکھ لے اور اس کے شکستہ

دل کو صدمہ نہ پہونچے +

کچھ دن تو یونہی گذرے۔ اس کے بعد لڑکی کی شادی ہوگئی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی تعلیمیافتہ خاوند کو بہت عزیز ہوئی اور دونوں میں اخلاص و محبت کا رشتہ مضبوط قایم ہوگیا۔ یہ صورت دیکھکر آنسو خلوت میں سدھارے۔ اور ان کی سرگذشت کا سلسلہ ملتوی ہوگیا +

یکایک زمانہ نے اپنی نیرنگی کا ورق اُلٹا اور پیاری کا پیارا ساجن طاعون کا شکار ہوگیا شوہر کیا مرا۔ یہ خود مرگئی۔ ہندو دہرم اور راجپوتی شرم کے پیام آنے لگے کہ زندگی ختم ہوئی اب اِس آباد دُنیا میں تیرا کچھ حصہ نہیں۔ اپنا چیت چتا کی سلگتی آگ میں لگا یہی تیرے دُکھ کا خاتمہ کرے گی۔ چندرماں کی سہانی چاندنی کو مست دیکھ اور برکھارت کی مستانہ ہوا سے اپنے دامن بچا۔ اور یقین کر کہ خوشی کے دن تیرے ساجن کے ساتھ چل گئے۔ بپتا کی ماری لڑکی دم بخود۔ چپ کی سُن رہی تھی۔ کہ دل میں ایک سناٹا سا آیا۔ درد کی ہلکی ہلکی چمک ہونے لگی اور برسوں سے رُکے ہوئے آنسو ابل پڑے۔ یہ آنسو نرالی شان کے تھے۔ اندرونی سوزش نے ان کی رنگت نکھار دی تھی۔ سیاہ پلکوں سے ڈہلک کر زرد رخساروں پر بہنا اور چمکنا ستم ڈہا رہا تھا۔ اب آنسوؤں کا دور دورہ تھا اور انہیں کا عمل دخل۔ اندہیری رات میں بے چاری جوان بیوہ کا کوئی ساتھ نہ دیتا۔ غریب اکیلی پڑی سسکیاں لیا کرتی تھی مگر اس کے اصلی رفیق آنسو اس سے ایک لحظہ کو بھی جدا نہ ہوتے تھے +

ایک دفعہ ہولی کے موسم میں ارمان بھری بیوہ اپنے رنگیلے پیتم کو یاد کرکے آنسو بہا رہی تھی اور اس کی سہاگن ہجولیاں رنگ اُچھالتی کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اس کی حالت زار پر کسی کو بھی رحم نہ آتا تھا۔ یہ بے ترسی دیکھکر اسے خیال آیا کہ مہاتما بدہ نے سچ فرمایا ہے۔ کہ کل سنسار خود غرض اور دُکھ کی پوٹ ہے۔ اسکی فانی خوبی پر نہ ریجھنا۔ اپنی ہستی کے مطالعہ میں دل لگانا اصلی سکھ اور آنند ہے۔ یہ خیال آتے ہی بدنصیب لڑکی نے جی میں ٹھان لی کہ اب اس ہستی سے سرمدی دل لگانا چاہیے جس نے ان نیرنگیوں کو ظاہر کیا ہے یہ سوچکر ایک رات گھر سے نکل گئی۔ اور گنجان جنگل

میں آسن جما کر جا بیٹھی + لیکن جوں جوں حجابات دور ہوتے جاتے تھے دل میں میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلے پڑتے تھے +

اس لڑکی کا بیان ہے کہ جو لطف اس درد اور اس گریہ میں آتا ہے۔ وہ دُنیا کی سب خوشیوں سے افضل ہے۔ یہی آنسو ہیں جن پر اس کی دلچسپ زندگی کا انجام ہوا۔

لمپ

ازرسالہ زبان ۱۹۰۵ء

اب ہر ملک میں چراغ اور شمع کے بدلے لمپ کا راج بڑھتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان تاریکی دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ جانتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب کام آسانی سے پورے کر لیے جاتے تھے۔ ہندوستان کی نسبت سُنا ہے کہ جب کسی ہندی کو رات کے وقت کوئی تحریر پڑھنی ہوتی تو جنگل کی گھاس وغیرہ جلا کر پڑھتا تھا یہی حال عرب کا تھا وہاں بھی چراغ کا دستور نہ تھا وہ لوگ بھی خاص ضرورت کے وقت لکڑیاں روشن کر کے کام نکال لیتے تھے اس کے بعد انسان تمدن میں آگے بڑھا اور مٹی کا چراغ بنایا سینکڑوں برس خاکی چراغ نے خاکی انسان کے گھر کو روشن کیا اور اس کی روشنی میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں جب نفاست بڑھی تو موم اور کافوری شمع بنائی گئی اور اس کے لیے مختلف وضع کے فانوس تیار ہوئے۔ تاکہ ہوا اور پروانوں کی آفت سے محفوظ رہے فانوس عموماً شمعوں کے لیے بنائے جاتے تھے چراغ کے واسطے بہت کم چیزیں تھیں جو چراغ کو ہوا کے جھونکوں سے بچا سکتیں۔ ترقی کے زمانہ میں مٹی کے بدلے تانبے اور پیتل کے چراغ بنائے گئے مندروں مسجدوں اور خانقاہوں میں ان پنچی چراغوں کا بہت رواج ہو گیا۔ چنانچہ آج تک باوجود اعلیٰ ترقی کے مذہبی مقامات میں یہی پیتل اور تانبے کے چراغ پائے جاتے ہیں یورپ نے جس کو نئی روشنی کا اوستاد بیان کیا جاتا ہے چراغچی

کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ اس نے اول بٹن کی ڈبیاں روشن کیں۔ اس کے بعد کانچ کی چمنیاں ڈہالیں اور لمپ تیار کیے۔ کانچ کی چمنیاں ایک طرح کے فانوس ہیں جو روشنی کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں ؂

انسان ذرا آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھے اس کو پرانے زمانے کے دو چراغ چاند و سورج نظر آئیں گے۔ جو اپنی قدیمی حالت پر جوں کے توں قایم ہیں۔ زمین پر مٹی کے چراغ سے لیکر برنجی چراغ۔ شمع کافوری۔ شمع مومی بتی کے تیل کا لمپ۔ گیس کا لمپ۔ یہاں تک کہ بجلی کا لمپ بنگیا۔ مگر آسمان پہ وہی پرانا قاعدہ جاری ہے۔ کیا مجال جو ذرا تغیر و تبدل ہو۔

مگر زمین کی ترقی نے جو روشنی کے معاملے میں ہوئی بجائے اس کے کہ انسان کو فائدہ پہنچاتی اُلٹا نقصان پہنچایا۔ آجکل آدمی اس نئی روشنی کی بدولت طرح طرح کے عذاب میں مُبتلا ہے اوّل تو خرچ کی زیادتی۔ پہلے تہوڑے خرچ میں بہت سا کام نکلجاتا تھا۔ اب کروڑوں روپیہ نمایشی اور فضول روشنی میں برباد ہوتا ہے۔ غریب ہندوستان بھی امیر یورپ کی دیکھا دیکھی ان فضولیات میں مُبتلا ہو گیا۔ اور اپنی محنت کی کمائی یورپ کے لیمپوں کی نذر میں مُفت گنوا رہا ہے ؂

مسلمانوں کے مشہور پیشوا اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ رات کے وقت ملک کا کام کرتے کرتے اپنے کسی کام کو باہر جاتے تو چراغ گل کر دیا کرتے تھے اور فرماتے کہ میں نہیں چاہتا قوم اور ملک کا تہوڑا سا تیل بھی بیکار جائے اسواسطے چراغ گل کر دیتا ہوں کہ فضول روشنی نہ ہے ؂

بخلاف اس کے آج کل پبلک کے روپیہ کی جیسی قدر کیجاتی ہے۔ ظاہر ہے میونسپل کمیٹیوں کی طرف سے شہروں میں روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اس میں ذرا سی ہمدردی بھی روا نہیں رکھی جاتی ؂

لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے۔ خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی۔ اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور

پنچ میں لٹکا دیتے ہیں۔ پھر اس پر کانچ کی چمنی لگا دی جاتی ہے یہ روشنی کا حجاب ہے۔ اس کے اندر بی بتی نئی روشنی کا تاج سر پر رکھکر ملک ظلمات فتح کرکے حکومت کرتی ہیں۔ پروانے بیچارے اس روشن تاج کے دیوانے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا کے گر پڑتے ہیں پچھلے زمانہ میں شمع کے رخ پر جو حجاب لٹکایا جاتا تھا وہ دور سے اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج کل چونکہ دنیا ہی دھوکے کی ہے یہ پردہ بھی دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے۔ ننھے سے پرندے کو روشنی بے حجاب نظر آتی ہے لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس ہو کر گر پڑتا ہے اور منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔ گورنمنٹ کی مہربانی ہے کہ اس نے رعیت سے ہتھیار لے لیئے تاکہ لوگ خودکشی سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح ان دیوانے عاشق مزاج پرندوں کی حفاظت جان بھی سرکار کو منظور تھی اس لیے سفید کانچ کے پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب طالبان مرگ کی آرزو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ مگر کیا تعجب ہے کہ پروانے بھی انسانوں کی طرح دوری حجاب کی کوئی نئی صورت نکالیں اور بقا و فنا کی منزلیں آسان ہو جائیں۔

مٹی کا تیل

(از رسالہ زبان ۱۹۰۸ء)

خاکساران جہاں را بحقارت منگر   توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اللہ میاں نے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو بیکار ہو یا حقیر و ذلیل سمجھی جاسکے۔ چار عنصر۔ آگ۔ ہوا۔ پانی خاک میں سب سے زیادہ بے حقیقت خاک ہے۔ جو تمام مخلوقات کے پاؤں میں روندی جاتی ہے پانی کے زور کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ ہوا کے جھوکے سے اڑ جاتی ہے۔ اور آگ کی حرارت سے جلا کرتی ہے مگر اُف نہیں کرتی۔ دیکھنے میں اسکی بیچارگی اور ذلت پر ترس آتا ہے۔ لیکن خود اس سے سوال کیا جائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرے گی

کہ میری شان سب سے بڑی اور نرالی بنائی۔ ہر چیز کا خمیر میرے وجود سے تیار کیا
خاصکر انسان جو اشرف المخلوقات ہے مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھی میں فنا ہو جاتا ہے۔
اس ناچیز خاک کی تہ میں وہ نایاب خزانے قدرت کے دبے ہوئے ہیں جن کو کام میں
لاکر انسان آدمی کہلاتا ہے۔ ورنہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ خیر اور بڑی چیزیں تو اپنی
جگہ ہیں۔ مٹی کے بعض ٹکڑوں کی تہ میں ایک قسم کا چکنا بدبودار پانی ہوتا ہے۔ جس کو لوگ مٹی کا
تیل کہتے ہیں۔ مقابلہ کر کے دیکھو تو چنبیلی کا تیل موتیا کا تیل اپنی خوشبو کے سبب اس بدبودار
تیل سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت اور نازک دماغ لوگ چنبیلی وغیرہ کے
تیل کو سر چڑھائے رکھتے ہیں اور جہاں مٹی کا تیل آیا اور ناک ڈھکی۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے
یہ گندا سڑا پانی تمام تیلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ آج کل تمام دنیا میں اسی کے دم سے اُجالا
ہے۔ اگرچہ گیس اور بجلی کی روشنی نے اب مٹی کے تیل کو بھی مات کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاہم اس کا
عالمگیر اثر ابھی تک باقی ہے۔ متوسط درجہ اور ادنیٰ درجہ کے آدمی جو دنیا میں زیادہ تعداد رکھتے
ہیں مٹی کے تیل کے سوا اور کچھ نہیں جلا سکتے۔ یہی تیل روشنی میں لڑکوں کو سبق یاد کراتا ہے
جوانوں کو حسن افروزی کے جلوے دکھاتا ہے اور بوڑھوں کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ اسی
کی روشنی میں نمازی نمازیں پڑھتے پجاری پوجا کرتے۔ وعظ اور کتھا کے جلسے ہوتے ہیں
یہی وہ تیل ہے کہ چور کو چوری میں مدد دیتا ہے۔ اور پولیس کو چور پکڑنے میں لالٹین دکھاتا
ہے غم کی راتیں جدائی کی رات میں جب مونس و غمگسار پاس نہ ہو تو مٹی کا تیل جل جلکر اپنا
وجود فنا کر دیتا ہے اور انسان کا شریک غم بنکر باعث تسلی ہوتا ہے۔

امریکہ کا "راک فیلر" اسی خاک کے نیچے رہنے والے تیل کی بدولت لاتعداد دولت
کا مالک ہے۔ یہی تیل دوسرے ملک کے ہاتھ میں رہنے کے باعث ہندوستان کی دولت
غیروں کو بانٹ رہا ہے۔ یہی تیل دنیا کی تمام کلوں میں کام آتا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے
بَل پر دنیا کی مشہور سواری موٹر کار زمین پر دوڑتی پھرتی ہے۔

اے خاک نشین پتیل! ہمکو یہ تیری ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلہ زار بنکر مقبول ہوجاتا ہے! اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے۔ پہاڑوں۔ دریاؤں میں سرگرداں پھرتا ہے مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے +

تو اتنا بے غرض و بے تعلق کیوں ہے؟ تیری روشنی میں شراب خواری ہو۔ زناکاری ہو یا عبادت الٰہی۔ تجھے روشنی دینے سے کام۔ کیا تو محتسبی نہیں کر سکتا جو لوگوں کو گناہ سے بچائے۔ یا کم سے کم ان کو گناہ کرنے میں مدد نہ دے۔ کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کرے۔ بیشک تجھ میں سب طاقتیں خدا نے رکھی ہیں۔ مگر تو اچھی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری نہ ہو البتہ انسان اپنی نیک قوتوں کو بھول جاتا اور بری طاقتوں کو کام میں لا کر خود تکلیف اُٹھاتا اور دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر وہ تیری صلح کل پالیسی پر عمل کرے تو دُنیا میں ایسا ہی امن قایم ہوجائے جس طرح لیمپ کی روشنی میں سب لوگ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتے ہیں +

عشقیہ آتشبازی

پھلجھڑی۔ انار۔ مہتابی

یہ شب برات، آتش بازی کے دن آگ جلائے گی ہستیاں مٹائے گی۔ فنا کے پھول بہار دکھائیں گے۔ بچے پھلجھڑیوں کے لیے ضد کرتے ہیں انکو دلوائی جاتی ہیں آؤ ہم بھی نادان بنکر نار کے نورانی کھلونے مانگیں اور جی بہلائیں +

پھلجھڑی کیونکر بنتی ہے۔ کاہے سے بنتی ہے؟ یہ سب کو معلوم ہے۔ گندک ہوتی ہے تاکہ آگ قبول کرے۔ شورہ ڈالا جاتا ہے تاکہ تیزی اور شورش پیدا ہو +

کوئلے جن کی ایک ہستی آگ پہلے بگاڑ چکی ہے۔ پھلجھڑی کا جزوِ اعظم ہیں۔ اور یہ پھولنا لوہے کے برادے سے بنتے ہیں۔ اور اس لیے اس کی آمیزش بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بس یہ پھلجھڑی کی کائنات ہے جس پر کاغذ کا خول چڑھا کر بازاروں میں پھلجھڑی کے نام سے بیچا کرتے ہیں۔ ہم ایسی پھلجھڑی چاہتے ہیں جس میں گندھک نہ ہو تو اس جیسا آگ قبول کرنے والا مادہ ضرور ہو۔ نمکین شورہ نہ ملے تو کوئی دوسری جلی بھنی چیز شامل کر لیں اور رہا لوہ چون ذرات آہن۔ جن پر پھولوں کی ہستی کا مدار ہے۔ ڈھونڈھنا ضروری ہے تو کیا پھول ایسی سخت دھات کے ذروں سے بنتے ہیں۔ نہیں نہیں خاک کے ذرے بھی چمک دمک دکھانے میں کم نہیں وہی ڈال دینا۔

آہا۔ عشق کی دیا سلائی انسانی پھلجھڑی میں لگا دی۔ آنکھوں کی راہ پھلجھڑی کے اندر کا مسالہ جل جل کر نکل رہا ہے۔ آنسوؤں کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ کوئی دم کا یہ تماشہ ہے پھلجھڑی جل چکے گی۔ اس کا خول راکھ ہو کر گر پڑیگا۔ اہا اہا کا غل و شور خود بخود بند ہو جائیگا اور جلی ہوئی راکھ اندھیرے میں زمین پہ گر کر پامال ہونے لگے گی۔

نہیں جناب ہم ایسی پھلجھڑی نہیں چاہتے جس کے جلنے کے بعد اندھیرا ہو جائے جس کا تماشہ تھوڑی دیر کا ہو جس کی بہار عارضی نظر آئے۔ ہماری ضد پوری کرنی ہے۔ ہمارا دل رکھنا ہے تو ایسی پھلجھڑی منگا دو جو ایک دفعہ سلگنے کے بعد کبھی نہ بجھے جس کے پھولوں کا مینہ ہمیشہ برستا ہے جس کی بہار کبھی ختم نہ ہو۔ دیکھو ہمکو منگا دو۔

پھلجھڑی نہیں تو کوئی اور آگ کا کھلونا دلا دو۔ کہتے ہیں یہ دن آگ بازی کے ہیں آج کی رات اللہ میاں پہلے آسمان پر آئیں گے۔ اچھا تو ہم ان سے کہیں گے کہ ہم آپ کے بندے ہیں۔ سب کو آگ کے کھلونے مل گئے۔ ہم کو بھی دلوایئے دل کے انار میں بارود بھری ہوئی ہے۔ مگر ایسی آگ نہیں ملی جس سے یہ انار چھوٹ جائے۔ آپ ہی کوئی چنگاری دید یجئے۔ تاکہ انار قلب کی چند لمحہ بہار دیکھ لیں۔ مہتابی بھی خوب ہوتی ہے۔ روشن اور منور

ظلمت کو کافور کرنے والی۔ آسمانی ماہتاب کی ماجائی مگر اس میں بھی وہی عیب ہے جلکر
خاموش ہوجاتی ہے۔ مہتابی وہ اچھی جو ہمیشہ چمکتی رہے ہر وقت نور افشانی کرے ظلمت
کو فتح کرے کبھی مفتوح نہ ہو۔ بھلا وہ گورا کس کام کا جو کالے کو فتح کرکے پھر اس کا مفتوح
ہوجائے ہمارا نسخہ بنگیا تو دکھا دیں گے کہ جس وقت مہتابی روشن ہوئی تو پھر کبھی نہ بجھے
گی۔ یہاں بھی نور وہاں بھی نور۔ اِدھر بھی نور اُدھر بھی نور۔ جہاں سنو یہی آواز آئے گی
اللہ نور السمٰوات والارض۔ خیر اگر اب کی شب برات میں یہ عاشقانہ آتشبازی
میسر نہ آئی تو آئندہ کی اُمید رکھنی چاہئے۔

دیاسلائی

از رسالہ زبان سنہ ۱۹۰۹ء

آپ کون؟ ناچیز تنکہ۔ اسم شریف؟ دیاسلائی کہتے ہیں۔ دولت خانہ؟ جناب
دولت خانہ اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا۔ مگر چند روز سے "احمد آباد" میں بستی بسائی ہے اور
سچ پوچھئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں
میں دبا ہوا ہے۔ میرا موجودہ ٹھکانہ ہے۔

یہ "احمد آباد" ناروے یا سویڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟ کیونکہ آپ کی
بستیاں تو انھیں علاقوں میں سنی جاتی ہیں۔

نہیں جناب احمد آباد ہندوستان میں ہے۔ آپ دیکھتے نہیں میری رنگت
کالی ہے۔ یہ اسی ملک کی نشانی ہے۔ ورنہ ناروے سویڈن کی دیاسلائی گوری چٹی
ہوتی ہے۔ مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت؟

آہا تو آپ ہمارے ملک کی دیاسلائی ہیں۔ تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہے۔ مگر
ہماری نگاہ میں سب دیاسلائیوں کی رانی ہو۔ ذرا مہربانی کرکے مجھ کو رانی نہ فرمایئے۔

’’بیگم‘‘ کہیئے۔ میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے +

بہت اچھا میاں تنکے ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے کہ ’’دیاسلائی‘‘ اور ’’بیگم‘‘
میں تمیز کرتے ہو ’’ئے آدمی کے پیر شدی‘‘ وہ وقت بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر
مشین کے آرے کے نیچے رکھے جاتے تھے۔ اور آرا آن کی آن میں تمہارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔
اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی وہ خود خیال کر کے گریبان میں منہ ڈال سکتے ہو۔ تمہارے
تراشیدہ کندوں کا ظلماتی گرم چشمے میں ڈالا جانا اور رابن کھولتے ہوئے پانی میں تمہارا تلملانا
کبھی سطح آب پر آنا۔ کبھی پھر تہ میں جا پڑنا۔ یہاں تک کہ اسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمہاری
کھال تک اتر جاتی تھی۔ اس وقت کچھ دیر کے لیے باہر نکال کر تم کو دم دیا جاتا تھا۔ اس کے
بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا۔ اور مشین چھیل چھیل کر تمہارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی اور
پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حرکت میں تم جیسی ہزاروں
ہستیاں عالم وجود میں آجاتی تھیں۔ زرد گندھک اور سرخ مصالحہ کا لباس بھی کچھ عزت
سے نہیں پہنایا جاتا تھا۔ بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالح میں تمہاری ناک
ڈبو دی جاتی تھی۔ اس پر یہ مزاج! کہ بیگم کہلانے کی آرزو۔ پچی کی ڈبیا میں رہتے سہتے
یہ دماغ ہو گیا۔ ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے منہ یا رگڑ کر پھینک دے گا۔ پھر
جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا +

حضرت! آپ کو تو غصہ آگیا۔ خفگی کی کیا بات ہے۔ جو چیز جہاں ہو اسی سے منسوب
ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر ’’دیاسلائی‘‘ کے مقابلہ میں بیگم کے لفظ کو پسند
کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے۔ کام دیکھنا چاہیئے۔ سو جیسا مسلمانوں کا
کام کرتی ہوں ویسا کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجا لاتی ہوں یہاں تک کہ میرے مشرب
میں دیسی بدیسی گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے
اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں۔ اور ایک غریب کے

جھونپڑے میں بھی میرے سبب اُجالا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بے حقیقت ہوں اور
بے بسی کے عالم میں انسانی کلوں سے عرصہ تک بے کل رہی ہوں تو یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں۔
آپ پر بھی یہ بپتا پڑ چکی ہے۔ بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ درگت ہوئی ہے۔ کیا یاد نہیں کہ ریم
کی آری نے منتجر راز سے کاٹا۔ اور نو مہینے شکم مادر کے شکنجہ میں آپ بھی جوش کھاتے رہے
اور پھر برسوں پرت در پرت کے چکر میں گردش رہی۔ میرے "درانی" اور "بیگم" کے لفظ
سے اتنے چونکے ذرا اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھئے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے
کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کرتا ہے وہ گورا کرنا نہیں چاہتا۔ جو مسلمان کو پسند
ہے۔ اس سے ہندو کو نفرت ہے اور غریب کمزور ہونا تو گویا دائرہ آدمیت سے خارج
ہو جانا ہے۔ اس کو دنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے +

بس بس۔ خاموش رہو بی فتنی ہو تو اتنی ذرا سی۔ مگر زبان بارہ ہات کی ہے۔ لگیں
حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زادی کیا عالی شان ہے +

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سنا ہو گا کہ خدا نے آدمی کو زمین
میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اسرار کا علم اسکو بخشا ہے بس یہ جو کچھ کرتا ہے۔ عین
منشاء الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے۔
اوہو! آپ کو یہ غرہ بھی ہے۔ بیشک آپ خلیفہ خدا ہیں۔ مگر سب چیزوں کی حقیقت
آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے
ہیں۔ یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی گئی ہے اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے
تو بتائیے کہ بجلی کیا چیز ہے۔ وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے۔ اور اس کی
تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے۔ مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز
ہے اور چند حرکتوں سے کیونکر ظاہر ہو جاتی ہے +

خیر بجلی تو بڑی چیز ہے تنکے کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی گرد ہیا

یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے۔ محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے۔ پانی اور روشنی عام ہے۔ جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذات شریف ان سب چیزوں کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتی ہے آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی۔ پانی۔ ہوا۔ سب میرے قبضے میں ہوں جسکو چاہوں دوں اور جسکو چاہوں محروم کر دوں۔ ایک آدمی کروروں روپے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں۔ مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں نام اور نشان کے شوق میں لاکھوں ہمجنسوں کو فنا کر ڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا ان ہی اعمال سے دعویٰ کیا جاتا ہے اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں۔ حضرت آپ ہزاروں لاکھوں سجدے کرتے ہیں مگر آپ کا سرکش وجود ویسا کا ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے۔ مجھ کو دیکھئے کہ ایک ہی سجدے میں مقبول ہو جاتی ہوں۔ اور تجلی اس چھوٹی سی شکل کو جلا کر خاک کر دیتی ہے +

خدا تمہاری طرار زبان کو چلاتا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں اچھا تو لاؤ اندھیرا زیادہ ہو گیا میرے کلبہ تاریک کو تجلی راز سے روشن کر دو +

کھٹکہ

از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء

لوگ کہتے ہیں زندگی وہ اچھی جس میں کسی بات کا کھٹکہ نہ ہو بلکہ ایسی زندگی کو بہشت سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ کیونکہ بہشت میں فکر و تردد کا کھٹکا نہ ہوگا۔ مثل ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را باکسے کارے نباشد

ہر شخص کا اپنے کام میں مست و سرشار رہنا اور کسی سے کچھ علاقہ نہ رکھنا بہشتی زندگی ہے مگر اس جہان کو اختلاف سے زیبائش ہے ایسے آدمی بھی اس دنیا کے پیدا

رہتے ہیں جو بے کھٹکہ رہنا عیش سمجھتے ہیں اور ایسا گروہ بھی موجود ہے جو

کھٹکہ وار گزران

کا شیدائی ہے۔ اس کو جینا، مرنا، چلنا پھرنا، ہنسنا بولنا، کھانا پینا۔ الغرض کوئی بات ہو کھٹکے کے بغیر بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ اور انصاف یہ ہے کہ کھٹکہ پسند جماعت حق بجانب ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کارخانہ کھٹکہ پر چل رہا ہے امور موجودات محسوسات ذرا اور آگے بڑھکر حیوانات وغیرہ کی تمام نوعیں کھٹکہ سے ظاہر ہوئیں کھٹکہ سے قایم رہتیں اور کھٹکہ ہی سے فنا ہو جاتی ہیں۔ حیوانات میں انسان کو دیکھئے کھٹکہ اس کو بھی محیط ہے ہر سانس میں کھٹکہ کا سلسلہ موجود ہے +

کھٹکے کی خارجی مثالیں

کسی بڑے تارگھر میں چلے جایئے۔ ہزاروں کھٹکے سنائی دیں گے انسانی انگلیاں حرکت کر رہی ہونگی اور کھٹکے کی گونج ان سے نکل رہی ہوگی۔ آواز سب کی ایک انگلیوں کی حرکت بھی یکساں۔ لیکن کاغذی نقوش کو ملاحظہ کیجئے۔ یہاں آکر یہ کھٹکہ رنگ برنگ کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں لکھا ہے ازید کو لاکھ روپیہ کا فائدہ ہوا" کسی میں درج ہے "عمرو ہلاک ہو گیا ہے" ایک کھٹکہ کے مختلف ظہور اور نتیجے کاغذ پر ہویدا ہوتے ہیں جن لوگوں کو اس

برقی کھٹکے کا عرفان

سے بہرہ ور تو صرف آواز سے ٹکر ٹیاک ٹ بر کا فرق محسوس کر لیتے ہیں۔ مگر ناواقف حیران ہوتے ہیں اور بعض اوقات شک و شبہ کرتے ہیں کہ ایک ہی کھٹکے سے مختلف خبریں کیونکر

بن گئیں۔ جو کھٹ کھٹ خوشی کے تار میں سنائی دی تھی وہی غم کی اطلاع میں سُنی گئی۔ اتنا بین فرق کس طرح ہو گیا۔ حقیقت آشنا تار بابو ان نادان لوگوں کے شک و شبہ کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں +

اسی تار کے کھٹکے میں وحدت و کثرت کا سبق موجود ہے۔ جس میں آج کل کے بعض کم فہم انسان اُلجھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ واحد کثرت میں ظاہر ہو کر واحد کیونکر رہ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ دہلی سے کلکتہ تک دو سو تار گھر ہیں ایک بابو دہلی میں بیٹھ کر کلکتے کو تار دیتا ہے۔ بس جس وقت اس کی اُنگلی حرکت کر کے ایک کھٹکہ پیدا کرتی ہے تو کلکتے تک ہر تار گھر میں وہ کھٹکہ پیدا ہو جاتا ہے وہی کھٹکہ دہلی میں۔ وہی کلکتہ اور وہی درمیانی تار گھروں میں کسی کھٹکہ میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی +

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کھٹکے سے دو سو کھٹکے پیدا ہو گئے مگر حقیقت میں موجود ایک ہی ہے۔ احمق سے احمق آدمی بھی جس کو تار کے معاملہ سے تھوڑی سی آگاہی ہے نہیں کہہ سکتا کہ کھٹکا تقسیم ہو گیا اور اس کی وحدت میں کچھ فرق آ گیا۔ پھر ذات واحد کے کثرتی ظہور سے اس کی وحدت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے +

گھڑی کا کھٹکہ

یہ سامنے والی دیوار کے سہارے دم لینے والی گھڑی بھی دیکھی۔ سانس کا کھٹکہ چل رہا ہے اور سوئی کی گردش وقت کاٹ رہی ہے۔ ہر کھٹکا فنر کی پیچیدہ طاقت کا ایک حصہ کم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہی ننا مُنا کھٹکہ گھڑی کی سب طاقت ختم کر کے اس کو خاموش کر دے گا +

رات کے اندھیرے میں جب کوئی مونس و غمخوار پاس نہ ہو کھٹکے دار گھڑی

کو پاس رکھ لیجیے۔ دیکھیے یہ کھٹکا کیا لطف دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گھڑی کی زندگی بھی کھٹکے سے معلوم ہوتی ہے اور موت کا باعث بھی یہی کھٹکا ہوتا ہے۔ انسان کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو مشابہت بہت ہی ٹھیک اور موزوں ہوگی گھڑی کی بناوٹ اور کل پرزے سب انسانی اعضا کی ساخت سے نکلے ہیں پھر بھلا نقل تو کھٹکے سے جیئے۔ کھٹکے سے مرے اور اس کے کھٹکے سے لوگوں کو فائدہ پہونچے اور اصل یعنی انسان کھٹکے سے محروم سمجھا جائے اور بے کھٹکے زندگی کو بہشتی کہا جائے یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔

گراموفون کا کھٹکہ

غیبی آواز سے خود بخود بولنے والا باجہ گراموفون جو نئے زمانے کی لاثانی اور عجیب ایجاد تصور کیا جاتا ہے۔ نوکدار کھٹکے سے بولتا ہے۔ ایک سوئی کی نوک ریکارڈ کی چکرانے والی تختی پر کھٹکے دار ضربیں لگاتی ہے اور مومی پلیٹ کی مخفی آواز کو عیاں کر دیتی ہے پھر دیکھیے کہ کیا کیا عجیب و غریب صدائیں نکلتی ہیں آج کل کے خوش باش انسان گراموفون کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ مگر ان میں کسی کو اس کھٹکے پر توجہ نہیں ہوتی جس کے طفیل باجے کا کاروبار چلتا ہے۔ حالانکہ ہر باجہ یعنی انسان خود ہی بولتا ہے۔ اگر وہ ادھر توجہ کرے تو اپنے وجود کے کھٹکے کا حال بھی ایک دن معلوم کر لے۔

انسانی کھٹکا

ان خارجی مثالوں کے بعد خود انسان کے اندرونی کھٹکے کو دیکھنا چاہیے کہ یہ نادان بے کھٹکے زندگی پر مرا جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی بغیر کھٹکے کے بالکل نکمی اور

بیکار رہے۔ آدمی کے تمام دینی و دُنیاوی افعال کسی سبب سے ہوتے ہیں نوکری کرتا ہے تاکہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ اسی طرح دُنیا کے سب دہندے کسی سبب کے ماتحت ہیں۔ تو یہ سبب اس شخص کے لیے ایک کھٹکا ہے بظاہر تو یہ کھٹکا اسکو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ کھٹکا نہ ہو تو جاہل آدم زاد ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جائے اور کچھ کام نہ کرے +

دینی امور کا بھی یہی حال ہے۔ دوزخ کے خوف۔ بہشت کے لالچ۔ خدا کی رضامندی کی طمع۔ غرض اس کے اعمال کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہی اس کے لیے کھٹکا ہے جس کے بغیر یہ سب اعمال جن سے انسان کی روحانی زندگی وابستہ ہے چل نہیں سکتی +

کھٹکے کے باطنی اسرار

جو اسرار کھٹکے کے وجود میں پائے جاتے ہیں ان تک رسائی ممکن ہے۔ مگر ان کا بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر کیفیت اور حال سے ہے۔ جو قال اور الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ اس لیے ہم باطنی کھٹکے کا صرف ایک حصہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں +

زندگی کا مسلسل لطف

آدمی جگہ جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے۔ اور اپنے اندر کی طلسماتی زنجیر کو حاصل نہیں کرتا۔ جس میں اسکو ساری دُنیا کی مزیدار کیفیتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہر سانس جو جسم کے اندر جاتا اور باہر آتا ہے اگر اس کی قدر کی جائے تو لازوال نعمت ہے بشرطیکہ اس میں لوچ دار کھٹکہ بھی پیدا ہو جائے +

جوگی حبس دم وغیرہ طریقوں سے اس سانس کو اپنے قابو کا بنا لیتے ہیں اور پھر ساری خلقت سے بے پرواہ ہو کر جنگل میں منگل کرتے ہیں۔ اور انند کے تار بجاتے ہیں۔ مسلمان درویش باوجود فقر و فاقہ کے مست و سرشار رہتے ہیں محض اس سانس کی بدولت جس میں ذکر الٰہی لہرایا کرتا ہے اور ان کو ہر وقت مسرور رکھتا ہے۔

پوچھا جائے گا کہ کس طرح سے سانس میں لوچ پیدا ہوتا ہے۔ اور کیونکر یہ مزیدار کھٹکا حاصل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ سوال بھی ایسا ہی ہے، جیسے باطنی کھٹکے سے بےخبری۔ اخباروں کے مضمون میں یہ باتیں لکھنی دشوار ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ذکر جہر اور ذکر خفی جس کو پاس انفاس بھی کہتے ہیں سانس میں پُرلطف کھٹکا پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان مسلسل لطف کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

جس وقت یہ کھٹکا انسان کے دم سے وابستہ ہو جاتا ہے پھر زندگی بے کھٹکے گزرنے لگتی ہے جس کی اکثر لوگوں کو خواہش ہے۔

خدائی گراموفون

از رسالہ صوفی سنہ ۱۹۰۹ء

مسٹر ایڈیسن کو دعوےٰ ہے کہ اس نے گراموفون ایجاد کر کے ثابت کر دیا کہ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ بیجان کا بولنا ایک زمانے میں معجزہ اور دوسرے عہد میں کرامت شمار ہوتا تھا۔ آج ایڈیسن معجزہ و کرامت کا انکار کر کے یہ عجیب چیز پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض عقل انسانی کا ظہور ہے۔ کسی غیبی طاقت کو اس میں دخل نہیں۔"

ہم ایڈیسن سے دریافت کرتے ہیں کہ عقل انسان کہاں سے آئی؟ جس نے یہ

کرشمہ ظاہر کیا۔ اس کا دارومدار بھی ایک پراسرار طاقت پر ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں
کہ جس کرشمہ کا نام ایک وقت میں معجزہ۔ دوسرے وقت میں کرامت تھا۔ آجکل
کے زمانہ میں اس کا نام ظہور عقل یا سائنس کا تماشا ہے۔ تینوں ناموں کے باطنی
معانی میں کچھ فرق نہیں ⁂

اصل میں خود انسان حضرت ایزد کا گراموفون باجہ ہے۔ جب اس سراپا عقل
وسائنس خدا کو منظور رہوا کہ آواز ہو اپنے کان سے سُنے۔ اس نے خاکی ریکارڈ بنائے
اور ان میں نفخت فیہ من روحی کی صدا بھر دی اور پھر اس کو اڈیسن کے موجی
ریکارڈ کی طرح ایک گردش میں مبتلا کر دیا ⁂

بعض ریکارڈ ہیں جن میں سنسکرت زبان سے روح الٰہی ظاہر ہوتی ہے اور
وید کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ بعض ہیں جو عبرانی و عربی کے ذریعہ سے انجیل
و توریت و قرآن کہلاتے ہیں۔ غرض خیر و شر۔ خشک و تر۔ مہذب و غیر مہذب۔ سب
کچھ ان ریکارڈوں میں موجود ہے۔ خود میاں اڈیسن بھی خدائی باجے کے ایک ریکارڈ
ہیں۔ ذرا غور کریں تو ان کو بھید مل جائے ⁂

مچھر

از رسالہ صوفی ۱۹۱۰ء

یہ بھنبھناتا ہوا۔ ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی
ہے۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز
اس کے مقابلہ کے لیے مہمیں تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں
مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی
جاتی ہے ⁂

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مصالحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بُو سے مچھر بھاگ جائیں۔ لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بیچارا آدم زاد حیران رہ جاتا ہے +

امیر غریب ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورت، مرد۔ کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی اس کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا +

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجیٹیشن کرنے میں کوئی نہیں اُٹھا رکھی ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھکر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر مچھر اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا +

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسو کے ذریعہ سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک بلا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو۔ مچھروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو تہس نہس کر دو۔ اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے +

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سُن رہا تھا۔ اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پانیر" کو آکر دیکھتا اور اپنی بُرائی کے حروف پر بیٹھکر اس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے قاعدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا۔ کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے +

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے، اکوڑے، اکرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا بے خبر کے چرکہ لگانا۔ مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے صورت تو دیکھو، کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں بے ڈول چہرہ اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے، خوش وضع پیاری ادا کی دشمنی بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجئے۔ ذات صفات نہ دیکھئے۔ میں کالا سہی۔ بدرونق سہی۔ پنچ ذات اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہئے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر "الٹی میٹم" دیدیتا ہوں۔ کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کر دے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں والا۔ بیڈول فتحیاب ہوتا ہے۔ یا گورا چٹان آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردہ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھلائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعوی کرتا تھا۔ اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا۔ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی۔ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے کسی بھائی سے دریافت کیجئے۔ یا مجھ سے سنئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو۔ دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بیچارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیئے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کریں اور حمد و شکر کے گیت گائیں۔ اس لیے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے۔ اٹھو میاں اٹھو جاگو۔ جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بیفکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔ مگر انسان اس شہلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا۔ اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر اس کے غیظ و غضب میں اس کے چہرہ اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پروا سے انسان۔ آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بیچارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس ورمغز سے پوچھے کہ جناب عالی آپ کے دسکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے +

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سُنکر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل ہی میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک

رلائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کانٹا تھوڑی ہے قدم چومتا ہے۔ اور ان بزرگوں کے قدم چومنے کے ہی قابل ہوتے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے +

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کریں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے۔ لطف سے جینے نہ دونگا اور بتا دوں گا کہ کمین اور نیچ ذات اعلیٰ درجہ والوں کو پریشان اور بے چین کر سکتی ہے +

لا

(از رسالہ نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء)

انگریزی زبان میں اس سر بلند لفظ کے معنے قانون اور ضابطہ کے ہیں۔ عرب والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں اہل اُردو تحکمانہ طلب کے موقعہ پر لا بولتے ہیں۔ مگر لام الف کے دو حرفی لفظ کی اصلی شان پر بہت کم لوگوں کو توجہ ہوتی ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ آج دو چار ساعت اس کی حقیقت پر غور کریں +

اوّل تو ذرا اس لفظ کی ظاہری صورت پر نظر ڈالیے کیا مغرور اور متکبر وجود ہے شاعرانہ مدح سرائی کرنی ہو تو سرو بالا قد کہکر جی خوش کر لیجئے۔ مگر حضرت لا میں سرو کی سی لچک کہاں۔ سرو گو خود سر درخت ہے۔ تاہم ہوا کے جھوکوں سے اس کے ننھے ننھے پتے جنبش میں آجایا کرتے ہیں۔ برخلاف لا کے کہ یہ کسی ہوا کے جھوکے سے نہیں ہلتا اور مضبوطی سے بے حس و حرکت قدم جمائے کھڑا رہتا ہے۔ لا نہیں جانتا کہ اس کے پیروں میں کون پڑا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا سر نخوت سے اونچا رکھتا ہے +

انگریزی زبان میں جس کام کے لیے یہ مستعمل ہے اس کی ضد اور ہٹ کو کون نہیں جانتا۔ سارا زمانہ ایک منہ ہو کر چیخے چلائے مگر یہاں لا کے حکم کے سامنے کسی کی نہیں چلتی جو لوگ جناب لا کے حقایق و معارف سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں وہ اول تو برسوں سکول و کالج کی خانقاہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر لا کے ذکر اذکار میں مشغول رہتے ہیں اس کے بعد لنڈن کی سب سے بڑی خانقاہ میں جاکر وہاں کے حلقہ ذکر میں تین سال گذارتے ہیں جب کہیں ان کو خرقہ لا کا عرفان حاصل ہوتا ہے یہ خرقہ اور سند خلافت لیکر اپنے ملک میں آتے ہیں اور آبادی سے الگ ایک خلوت خانہ لیکر رہتے ہیں ÷

اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ نہ پوچھئے ورنہ مسٹر لار کا نیا تازیانہ سامنے آجائے گا۔ اگر آپ اس کوڑے سے نہیں ڈرتے اور آزادانہ تحقیقات چاہتے ہیں تو سن لیجئے کہ خرقہ پوشان لا اپنے خلوت خانوں میں ہزاروں مکر و فریب کی کمندیں بچھاتے ہیں اور ان بھولی بھالی چڑیوں کو جال میں پھانستے ہیں۔ لا کی قینچی سے جیبیں کترتے ہیں لا کے استرے سے سر مونڈتے ہیں اور ممکن ہوتا ہے تو لا کے پستول کی گولی سے بے زبان جانور کو شہید کر ڈالتے ہیں

لا کے سیاہ خرقہ والے بزرگ کے کمالات اور کرامتیں اس قدر زبردست اور مستند ہیں کہ کوئی دہریہ اور ملحد ان کے انکار کی مجال نہیں رکھتا۔ سب مانتے ہیں کہ لا کے تصرفات باطنی بالکل سچے اور یقینی ہیں۔ لا دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتا ہے۔ لا ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کر سکتا ہے۔ لا کے ایک ادنیٰ اشارہ چشم میں بیگناہ پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں اور لا ہی اگر چاہے تو اصلی مجرم کو دار سے اُتروا دے ÷

عرب کا "لا" صور اسرافیل ہے۔ انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں ایک ہی ضرب میں لا انگلش کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ انگریزی لا کی بساط ہی کیا ہے جو عربی لا کے سامنے آسکے۔ عربی لا تو وہ بلا ہے جو خداؤں پر چوٹ کرتا ہے اور ہمیشہ کا بناتا رہتا ہے۔ کس خدا کی طاقت ہے جو لائے عرب کے مقابلہ میں ٹھہر سکے خداوندان خداوندِ تا

خداوندعزیٰ تینوں ایک دفعہ ملکِ حجاز کے میدان میں اس بہادر لا کے سامنے آگئے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی خدائی کو اس کانٹے سے صاف کر دیں۔ مگر جونہی لا نے اپنی گرج دار آواز نکالی۔ تینوں خدا سر کے بل اوندھے زمین پر گر پڑے +

کہتے ہیں عرب کے اس لا میں یہ طاقت غیبی خزانے سے آگئی ہے اور یہ وہ خزانہ ہے جو کنجِ وحدت میں مخفی ہے۔ اس خزانہ میں لازوال اور بے شمار دولت ہے۔ جو الف کی ہتھیلیوں میں رہتی ہے۔ جب اس کنزِ مخفی کو لامِ مفرد میں زور پیدا کرنا منظور ہوا تو اس نے اپنے خزانہ کا ایک الف اس کے آخر میں لگا دیا۔ یہ اسی الف کی قوت ہے جس کے بل پر لائے عرب دنیا کا بے مثل شہ زور مانا جاتا ہے۔ لائے عرب کو کنزِ مخفی کا حکم ہے کہ ہر وجود کو نابود کر دے۔ چنانچہ جب یہ حکم بجا لاتا ہے تو صلۂ خوشنودی میں اس لا کو دوسرا الف عطا ہوتا ہے۔ جو لا کے اول میں چسپاں کر دیا جاتا ہے اور یہ لا سے اِلاّ بن جاتا ہے اور جونہی اِلاّ بنا اس کے سامنے سے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ اور کنزِ مخفی اس کے ذاتی ظہور کے لفظ اللہ میں وصلت کا شرف عطا فرماتا ہے اور لوگ اِلّا اللہ کے نعروں سے اس کی تشہیر کرتے ہیں +

آپ نے سُنا ہے عرب کے لا کا فسانہ۔ عرب کے کلمہ گو اور دُنیا کے وہ سب آدمی جو ان کی ہمنوائی پر ایمان رکھتے ہیں اس لا کا وِرد یوُں کرتے ہیں لا الہ الا اللہ گویا ہر شخص لا کی ضرب سے سب خداؤں کی نفی کر کے ایک خدا کا وجود قایم کرتا ہے اور فنا کے بعد بقا کا تماشا دیکھتا ہے +

اُردو کا لا سوائے تحکمانہ طلب کی شان کے اور کوئی شان نہیں رکھتا اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ بس ان میاں کی تو اتنی ہستی ہے کہ ذرا اکڑ کے بولے کہ ہم کو بھی لا کی بحث میں لا۔ ے آئے مگر ان کا نتیجہ کچھ نہ نکلا خیر الامور اوسطہا درمیانی لا خوب تھا یہ ہمکو بہت پسند آیا۔ اب خدا کرے جس دن ہم سب کے جسم سے جان نکلے تو لا الہ الا اللہ

جھولے میں جھول رہا ہو۔ کبھی جھونٹا لیکر زبان پر آئے اور کبھی دل میں جائے اور چاروں طرف وحدت کے ترانوں کا شور ہو۔ آمین

مکھی

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۱ء

دیکھنے میں بھنبھناتا ہوا ذرا سا پرندہ ہے بلکہ پرندہ کا لفظ بھی اس ننھی سی ہستی پر زیبا نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ناچیز و غلیظ و مکروہ بھنگا ہے مگر نظر تعمق سے دیکھو تو عرفان قدرت کا پُر اسرار نوشتہ ہے +

مکھیوں کی کئی قسمیں ہیں ایک قسم شہد کی مکھیوں کی ہے دوسری قسم وہ مکھیاں ہیں جو انسان کے ساتھ بود وباش رکھتی ہیں۔ تیسری قسم مکھیاں قبروں۔ قتل گاہوں ذبح خانوں وغیرہ مقامات میں رہتی ہیں +

قسم اول شہد کی مکھی آدمی کو طریق تمدن سکھانے والی اور بڑی عقلمند ہو قرآن شریف میں ایک سورت اس کے نام سے منسوب ہے اس مکھی کے ضابطے اور قانون انسان کو حیرت میں ڈالتے ہیں +

آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے قدامت کے اُصول سے منحرف ہوتا جاتا ہے ایک زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں شخصی حکومت کا دور دورہ تھا اب یہ وقت ہے کہ خود مختاری اور مساوات کی روح ہر شخص میں ایسی سرایت کر گئی ہے جس کو دیکھئے وہ "ہمچومن دیگرے نیست" کا راگ گاتا ہے۔ یورپ میں ان خیالات کا بڑا زور ہے۔ وہاں کے باشندے آزادی کی ترنگ میں کسی کی برتری گوارا نہیں کرتے۔ اکثر مقامات میں جہاں بادشاہ کوئی چیز نہیں ہر فرد بشر اپنا آپ حاکم ہے۔ اور اگر کہیں بادشاہ موجود ہے تو اسکا کچھ اختیار نہیں۔ شطرنج کے مہرے کی مثل نام کا بادشاہ ہے +

اگرچہ اہل یورپ نے عملاً اس کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ فرد واحد کی حکومت سے زیادہ مفید پنچایتی حکومت ہے لیکن یہ عملدر آمد ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ اُصول اسی وقت تک کارگر ہے جب تک خلقت میں علم کا شوق عام ہے اور لوگوں میں اپنے فرض کا احساس باقی ہے۔ جس دن علمی چرچا کم ہوا۔ اور تعیش و آرام طلبی نے جہالت کا بازار گرم کیا۔ اسی روز دیکھ لینا کہ جمہوریت کا سارا شیرازہ درہم و برہم ہو جائے گا۔ اور پھر وہ لوگ جن کے دماغ اور قوی قدرتاً شاہی و افسری کی قابل ہیں خود مختار بادشاہ بن جائیں گے۔

شہد کی مکھی ابتدا سے خود مختار بادشاہ کے ماتحت ہے۔ آدمی کی طرح رنگ نہیں بدلتی ان مکھیوں کے ہر چھتہ میں ایک حکمراں ملکہ ہوتی ہے جس کے حکم پر ہزاروں مکھیاں گردش کرتی ہیں مکھی ملکہ کا فرمان اشاروں ہی اشاروں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اس کو نہ گزٹ میں اعلان کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ وسیرائے اور ڈپٹی کمشنر کی معرفت کی تلاش۔ جب ذرا پروں کو حرکت دی اور آنکھوں کو سامنے کر کے بھنبھنائی۔ فوراً سب رعایا تعمیل کے لیے کھڑی ہو گئی۔ مکھی ملکہ کی خوش نصیبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے ملک میں نہ کوئی باغی ہے۔ نہ انارکسٹ شورش کنندہ۔ مکھیوں کی شہزادی بڑی کم خوراک ہے رعایا جس قدر شہد جمع کرتی ہے یہ اس میں سے صرف اپنے اور اپنے بچوں کی خوراک لے لیتی ہے۔ باقی رعایا کا حصہ رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی رعایا ایسی اطاعت گزار ہے کہ ملکہ کی خواہش اگر ہو تو سارا شہد اس کے حوالے کر دے یا کم سے کم جو زاید ڈنگیں ان پر لگایا جائے اسکو بخوشی برداشت کرے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ملکہ رعیت کے حصے پر بُری نگاہ نہیں ڈالتی اور قناعت سے اپنے حصہ پر زندگی بسر کر لیتی ہے۔

ذرا سننا یہ پھولوں کی ڈالیوں سے کیسی گونج کی آواز آرہی ہے۔ یہاں تو سوائے مکھیوں کے اور چیز نظر نہیں آتی۔ آہا سمجھ میں آیا۔ گونج انہی مکھیوں کے پروں کی ہے۔ مگر نہیں بہت

سی کھیاں پھولوں پر بیٹھی رس چوس رہی ہیں۔ پروں میں کسی قسم کی حرکت نہیں۔ اس پر بھی ان میں سے ایک آواز آتی ہے۔ یہ کس چیز کی صدا ہے۔ آپ کو خبر نہیں۔ یہ کھی کا ترانہ حمد وشکر ہے رزق کھاتی جاتی ہے اور رازق کا شکر ادا کرتی جاتی ہے۔ اسی پر بس نہیں انکے چھتے میں جاکر دیکھ لینا صبح شام ایک خاص آواز سنائی دیگی وہ ان کی حمد وثنا ہوتی ہے +

گھریلو مکھی

اب قسم دوم گھریلو مکھی کو لیجیے جس کو آپ کی اصطلاح میں مگس بے حیا کہتے ہیں کیسا ملنسار اور محبت کرنے والی چیز ہے آپ دھکے دیتے ہیں دھتکارتے ہیں اور وہ دامن نہیں چھوڑتی۔ چہرے سے اُڑایا تو وہ ہاتھ پر آبیٹھی وہاں سے جھٹکا تو قدموں میں آن گری بہت ہوا تو طواف کرنے لگی اور دو چار چکر لگاکر پھر پہلو میں آگئی +

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کے ایک پر میں زہر ہے اور دوسرے میں تریاق کھانے میں گرتی ہے تو پہلے زہر دار پر ڈالتی ہے اس لیے حکم ہے کہ اسکو غوطہ دیکر پھینکا کرو تاکہ تریاق کا اثر زہر کو معتدل کردے کون مسلمان ہے جو اس حدیث کے سُننے کے بعد بیچاری مکھی پر آنکھیں نہ نکالے گا۔ مگر اس میں اس غریب کا قصور نہیں یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک پر میں زہر رکھا گیا اور دوسرے میں تریاق جب وہ گرتی ہے تو اپنے اختیار سے نہیں گرتی بے قابو ہو کر غوطہ کھاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ محض قدرتی حکمت کا تقاضا ہے کہ زہر دار پر کے رخ پر گرائی جائے +

ہندو مذہب سے مکھی کی عداوت

ایک ہندو فقیر نے جو چھوت چھات کی قید سے آزاد تھا بڑی دلچسپ بات کہی کہ میاں ہندو مذہب والے خواہ مخواہ چھوت چھات کا غل مچاتے ہیں اور اپنے ہمسایہ

مسلمان بھائیوں سے الگ تھلگ رہ کر ان کے دلوں کو مکدر کرتے ہیں۔ پہلے کمبخت مکھی کا تو کچھ تدارک کریں جس نے چھوت کے تمام اُصول میں گڑبڑ ڈال رکھی ہے مسلمانوں سے تو انکی گوشت خوری کے سبب احتیاط کی جاتی ہے مگر مکھی کا کیا علاج جو گوشت پر بیٹھتی ہے اور اسی وقت اُڑ کر برہمن کی رسوئی اور دھال بھات کی تھالی میں آجاتی ہے۔ اس پہ بس نہیں۔ سارے جہان کے غلیظ اور میلے کچیلے مقامات میں مکھی کا گذر ہے۔ اور اسی حالت میں پاک صاف نہائے دھوئے ہندوؤں کے بدن کپڑے کھانے پر پہنچتی ہے۔ پھر چھوت کہاں رہی۔ اس ناہنجار نابکار نے تو گندے ستھرے کو ایک کر دیا ہے اس پر طرہ یہ کہ کچھ علاج سمجھ میں نہیں آتا مسلمانوں سے تو علیحدہ رہنا ممکن مگر اس موذی سے کسی طرح چھٹکارا اور بچاؤ ممکن نہیں ۔

فقیر نے کہا سُنتے ہیں کہ آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی کی لاش کوے سے سیکھ کر دفن کی تھی۔ لہذا ہندو مکھی سے نصیحت حاصل کریں اور چھوت کے خیال کو چھوڑ کر مسلمانوں سے شیر و شکر ہو جائیں ۔

مُردار خوار مکھی

مکھی کی تیسری قسم مُردار خوار ہے۔ یہ عموماً قبروں اور سڑی ہوئی لاشوں اور قتل گاہوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے زہر سے خدا بچائے بڑی خوفناک چیز ہے۔ میں تو جب کبھی اس سبز رنگ کی مکھی کو دیکھتا ہوں تو موت کے بعد کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ اور خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھکو اور سب بھائیوں کو مکھی کے عذاب سے بچائے ۔

مکھی کے صوفیانہ اوصاف

(۱) جس طرح صوفی لوگ انسان کی روحانی حفاظت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں مکھی بھی جسمانی

محافظ ہے گھروں کی زہریلی چیزوں کو چوس چوس کر صاف کر دیتی ہے۔

(۲) دل میں جذبۂ الفت رکھتی ہے گو پروانہ کی مانند جل مرنا اسکو نہیں آتا تاہم جس گھر میں پیدا ہوئی ہے اس سے دلی محبت رکھتی ہے۔ ہر وقت پاس رہنا چاہتی ہے۔ ہزار تدبیریں اس کو جدا کرنے کی کیجئے مگر یہ دامن نہیں چھوڑتی۔

(۳) متوکل ہے جو ملجائے کھا لیتی ہے۔ دربدر ماری ماری نہیں پھرتی۔

(۴) بہت سویرے بیدار ہوتی ہے اور اپنے محبوب انسان کو غافل دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔ اس لئے سوتے میں بار بار چہرہ پہ آتی اور بار بار پر مار کر بھنبھناتی ہے۔ اور زبان حال سے کہتی ہے۔ اُٹھ پیارے آدمی یہ وقت خدا کی حمد کا ہے۔ دیکھ کیسا سہانا سماں ہے۔ بیدار ہو اور دوگانۂ شکر بجا لا۔ تو اب تک پڑا سوتا ہے۔ مجھ کو دیکھ بڑی دیر سے جاگ رہی ہوں اور خدا کی دی ہوئی ہوا میں اُڑتی پھرتی ہوں۔

(۵) شہادت پسند ہے یعنی دانستہ مکڑی کے مُنہ میں چلی جاتی ہے تاکہ اس کا بھوکا پیٹ بھرے اور یہ مرتبۂ شہادت کمائے۔ آپ کہیں گے کہ اس میں مکھی کا کیا کمال ہے مکڑی تو بے خبری میں چھاپا مارتی ہے۔ مکھی کی خوبی تو جب تھی کہ جان بوجھ کر موت کے مُنہ میں چلی جاتی۔

یہ اعتراض درست نہیں۔ آجکل کے سائنس داں ڈاکٹروں نے خوردبین آلات سے مشاہدہ کیا ہے کہ مکھی کے جسم میں ہزاروں آنکھیں ہیں۔ تو بس جس کے دو نہیں ہزار آنکھیں ہوں وہ مکڑی کے داؤں سے بے خبر کیوں کر رہ سکتی ہے۔

نہیں جناب یہ صرف مکھی کا ذوق قربانی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ کاش ہم لوگ بھی مکھی ہی سے جاں نثاری کا سبق سیکھیں اور عشق حقیقی کے جالے میں گرفتار ہو کر فنائیت حاصل کریں۔

اُلّو

ازرسالہ صوفی سنہ ۱۹۱۰ء

اُلّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں ضرب المثل کے چلے بیچارے اس پرندے کے وجود پر بن گئے ہیں۔ جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں کہ وہاں تو اُلّو بول رہا ہے یعنی وہ مقام بالکل اُجاڑ ہے۔ آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں۔ اور فقط نحوست اور ویرانہ پن ہی میں ہی اُلّو بدنام نہیں ہے حماقت و بیوقوفی کے موقعہ پر بھی اُلّو ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ اُلّو کی آواز سے بہت بدشگونیاں منسوب ہیں۔

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائیگا کس کو رغبت ہوگی۔ کہ بلبل ہزار داستاں اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑ کر اس بدنام پرندے کے بیان میں مصروف ہو۔ مگر دنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج و طبیعت کے نہیں بستے ہزار اُلّو کو بُرا کہنے والے ہیں تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئینگے۔ خاصکر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفاتِ یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔

جو لوگ بلند آسمان۔ چمکدار ستاروں۔ روشن آفتاب و ماہتاب۔ لہلہاتے باغوں میں شانِ غیبی کا ظہور مشاہدہ کرتے ہیں جن کو چشمِ مستانہ میں جلوۂ راز نظر آتا ہے جو گل کی صورت میں حسنِ ازل دیکھتے ہیں جن کی زبان سے ان نظاروں کو دیکھکر ربنا ما خلقت هذا باطلاً نکلتا ہے۔ وہ پست زمین، اندھیری رات، سنسان بیابان، نگاہ مغموم اور نوکدار کانٹوں میں بھی حقیقت کی نمود پاتے ہیں۔ اور کل یوم ھو فی شان پڑھتے ہیں۔

لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس جماعت کے رسالے میں جس کا مذہب ہمہ اوست ہے اور جو خیر و شر دونوں میں محمل لیلیٰ کے جرس کی صدا سُنتے ہیں اُلّو کی سرگذشت نہ لکھی جائے جو صوفی کی

روش پہ ہونی چاہیئے کہ ہر اچھی بُری چیز میں منزل مقصود کو تلاش کرے۔ یہ مجاز صدنیت کا ہے اس لئے آئیں کبھی جہاں عام پسند عنوانوں پہ مضامین لکھے جاتے ہیں وہاں ان عنوانوں کو بھی زیر بحث لایا جائے جنپر توجہ کرنا قاعدے اور دستور کے قانون میں قابل نفرت ہے ؛

اُلّو کے اوصاف

اُلّو کی زندگی، بود و باش، ایک باخدا، تارک الدنیا درویش کی سی ہے وہ آبادی سے گھبراتا ہے۔ اسکو خلوت، تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں اور خل و شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھکر نغمہ سنجی نہیں کرتا جس سے فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ اُلّو سارا دن حریص پرندوں کی شکل پیٹ کی خاطر دربدر مارا مارا نہیں پھرتا۔ بلکہ وہ اُجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے۔ جہاں کوئی غیر مانوس آواز اس کی مشغولی میں خلل انداز نہ ہو۔ دن بھر صائم رہتا ہے اور شام کو سورج چھپنے کے بعد رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور جوں ہی نکلا خداوند تعالیٰ شکار کے چند لقمے دلوا دیتا ہے جن سے روزہ افطار کر کے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد یا جھکی ہوئی دیوار پر آ بیٹھتا ہو اور ہو ہو کے نعرے لگانے لگتا ہے۔ اسی ذکر و شغل اور یاد الٰہی میں صبح ہو جاتی ہے اور یہ پکا اور سچا صوفی ریاکاری کے ڈر سے خاموش ہو کر اپنے حجرے میں گھس جاتا ہے اور جبس دم کر کے مراقبہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر شام تک باہر نہیں آتا۔

یہ خود پسند آدمی یا دشاہی کا تاج پہنکر نوبت نقارے بجواتا ہے۔ نوبت خانوں کے لئے اونچے اونچے مکان تیار کراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ نوبت ہمیشہ بجے گی لیکن زمانہ کا چکر چند ہی روز میں اس سرکش کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھر دنیا والے اس کو اور اس کے نوبت نقاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں مگر اُلّو نہیں بھولتا۔ مٹنے والے تاجدار کے خاکی ڈھیر پہ جاتا ہے اور نقیب و چوبداروں کی آواز کو صدائے عبرت میں مرنے والے کے

وجود خاکی کو سُنتا ہے اور اس کے نوبت خانے پر بیٹھ کر ٹھیک رات کے بارہ بجے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ کی نوبت بجاتا ہے۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں راقم الحروف درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں حاضر تھا۔ پچھلی رات جبکہ چاند غروب ہو رہا تھا جی چاہا کہ قطب مینار کا نظارہ کروں اسوقت عجیب پُراثر وقت تھا چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی درگاہ شریف سے نکلکر مقبرہ ادہم خاں کے قریب آیا تو دسویں رات کے چاند کی صورت سامنے آگئی۔ بیچارہ ماندگی کے عالم میں افق تنزل پر چمک رہا تھا۔ اور اپنی افسردہ شعاعیں ویران در و دیوار پر ڈال رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں شاہی کھنڈرات کی صورت ایسی ہیبت ناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی کہ کلیجہ کانپنے لگا۔ تاہم ہمت کر کے ذرا اور آگے بڑھا۔ جوگ مایا کا مندر دور سے نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف جو پھر کر دیکھا تو غیاث الدین بلبن۔ محمد خاں شہید کے شکستہ مقبرے اور بیسیوں اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں جنپر پھیکی پھیکی چاندنی اور رات کی خاموشی نے خبر نہیں کس بلا کا اثر پھیلا رکھا تھا کہ بے اختیاری کی سی حالت پیدا ہوگئی لیکن ارادہ قطب مینار دیکھنے کا تھا۔ ان نظاروں میں تھوڑی دیر مصروف رہ کر آگے بڑھ گیا اور علاؤالدین خلجی کے مقبرے کے پاس پہونچ گیا۔ دیکھا کہ بیچارہ سلطان خلجی اکیلا تنہا۔ خوفناک کھنڈر کی گود میں پڑا سوتا ہے۔ کوئی پہرہ دار نہیں۔ پاسبان نہیں جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ کے قریب جانے سے مجھ اجنبی کو روکے زندگی کی تو خبر نہیں۔ مرنے کے بعد جب ابن بطوطہ نے اس مقبرے کو دیکھا ہے تو عجب شان تھی۔ زرین مخملی غلاف پڑے ہوئے تھے۔ اگر اور لوبان کی خوشبو سے مقبرہ مہک رہا تھا۔ عالیشان گنبد کے قریب بہت بڑا مدرسہ تھا جہاں سینکڑوں طلبا رہتے تھے۔

آج کی رات نہ گنبد باقی تھا۔ نہ غلاف نہ خوشبو۔ نہ مدرسہ۔ نہ طلبا۔ یہاں تک

قبر کا نشان بھی ناپید تھا۔ چونے اور پتھروں کے انبار میں خبر نہیں کس جگہ سکندر ثانی کی
سلطان علاؤالدین خلجی کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ اس منظر نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ بدن
ساکن کر دیا۔ آنکھوں کو دریائے عبرت میں غرق کر دیا۔ محو عبرت بنا کھڑا تھا کہ سامنے کی
شکستہ دیوار پر سے اُلّو کی صدا کان میں آئی جو سلطان کی گذشتہ شان و شوکت کا نوحہ
رُک رُک کر پڑھ رہا تھا۔

ان سب پُر اثر نظاروں سے زیادہ میرے دل پر صدائے بوم کی چوٹ لگی نہیں
کہہ سکتا کہ اُس وقت کیا حالت ہوئی اور اب جب اس کا خیال کرتا ہوں کیا کیفیت
دل کی ہو جاتی ہے۔ تو کیا ایسے ناصح اور بیکسوں کے دمساز جانور کو آپ بُرا کہہ سکتے ہیں۔
اگر اس کی محل شناسی پر غور کیا جائے تو بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے جن کو سب بھول
گئے۔ سب نے چھوڑ دیا ان کو اُلّو نے نہیں بھلایا اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُلّو کی آواز کو منحوس
ناحق کہتے ہیں۔ ذرا دھیان سے سُنو۔ اللہ ھو صاف سمجھ میں آئیگا۔ بعض دفعہ ہو ہو بھی
کہتا ہے اور بعض وقت پورا اللہ ھو پکارتا ہے۔ بنگالی مینا۔ ہیرامن طوطا۔ اور یہ ننھی ننھی
خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں مگر اُلّو اپنے نعرۂ حق سے
آپ کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ اس لیے آپ اس کو منحوس کہتے ہیں۔ نہیں نہیں ایسا خیال نہ کرو
یہ خوش نوا پرندے دل کو یاد حق سے ہٹا کر تکلفات دنیا میں مصروف کرتے ہیں۔ اور اُلّو کی جگہ
خراش فریاد انجام کار یاد حق دلاتی ہے۔ اور کہتی ہے ؎

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے   یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

آج سے آپ کو چاہیے کہ اُلّو کی نحوست کا خیال چھوڑ کے اس کی خوبیوں پر غور
کیا کیجیے۔ اور اُلّو پر کیا منحصر ہے۔ عالم موجودات میں جو شئے نظر سے گذرے اچھی ہو
یا بُری اس کے اچھے معنی نکالنے چاہئیں۔

رسولؐ کی من بھاتی غذا جَو

از اخبار زمیندار ۱۹۱۲ء

میرا چاہیتا زرد پوش جَو کیسا پیارا پیارا۔ پیدا ہوتے ہی عشقبازی کا بسنتی لباس پہن لیتا ہے اور مرتے دم تک اس کو تن سے جُدا نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ ستو کی چکی میں پس کر نابود ہو جاتا ہے۔ اس نکیلے دانے سے نفرت نہ کرنا۔ بھائی یہ تمھارے رسول صلعم کا مُنہ چڑھا دانہ ہے۔ یہی وہ ہستی ہے جسکے آگے کسی کھانے کو سرکار رسول تک رسائی نہ ہو سکتی تھی اس کی تعریف کون کرے۔ خلقت تو دیوانی ہو گئی ہے جس کو دیکھو

گندم گنہگار

پر جان دیتا ہے۔ روٹی تو روٹی محبوب بھی گندمی رنگ کا تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ وہی میاں دانۂ گندم ہیں جن کو نوش کر کے آدم جنت سے نکلے اور عتاب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مولانا روم ؒ ہوس پرست عشاق کی بوالہوسی کا سبب قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ ؎ ایں خمار از خوردنِ گندم بود۔

نہیں جناب ہم کو تو اپنے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی من بھاتی غذا جَو مرغوب ہے۔ اسکا تن بھی اچھا اور من بھی مزیدار۔

پالیسی کی تلاش

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک نئی پالیسی بنانے کی ضرورت ہے اگر واقعی یہ سچ ہے

تو بھئی میرے نزدیک پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ

جَو کھاؤ اور جَو کی رنگت بن جاؤ

لیگ وکانگریس، اسکول وکالج ہوش وخرد سب کو آگ لگا دو۔ گردش سے وقت آگیا کہ پیٹ بھرنے کو جَو کے چار دانے بھی نہیں ملتے۔ تو بس یہی پالیسی بہتر ہے کہ دیوانہ وار جَو کا چھلکا اُتارنے کی کوشش کرو۔

خبر نہیں میں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے۔ یہ کوئی معمّا نہیں ہے۔ جَو کو چاہتا ہوں جَو پر مرتا ہوں۔ اسی کا نام بار بار زبان پر آتا ہے۔ مدینہ شریف سے واپس آکر دونوں وقت جَو کی روٹی کھاتا ہوں۔ اس میں صحت ہے تندرستی ہے طاقت ہے۔ لذت ہے اور وہ یاد ہے جس کے بھولنے نے قوم کو تباہ وبرباد کر دیا۔ یاد رکھ۔ بھول مت۔ رسول جَو کھاتے تھے صحابہ جَو کھاتے تھے۔ تلوار چلانے والے ہاتھ اور ملک چلانے والے دماغ کو وہ معدہ خوراک دیتا تھا جس میں جَو کی روٹی کے سوا توس مکھن کا نام نہ تھا۔ ذرا کھا کر تو دیکھو کیسی مزے کی چیز ہے۔ ذرا سا خمیر ملا لیا کرو۔ روٹی نرم ہو جائے گی۔ اور ہضم میں دیر نہ ہوگی۔ سنا ہوگا۔ دلّی میں دربار تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ مرنے والے بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی چند شہزادیاں اپنے ٹوٹے ہوئے بوریے پر بیٹھی جَو کی روٹی کھا رہی تھیں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سردی چمک رہی تھی۔ سب سے چھوٹی سات برس کی عمر والی لڑکی اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ کیوں بی اماں۔ یہ انگریزوں کے بادشاہ بھی جَو کھاتے ہونگے۔ کیونکہ تم نے پرسوں کہا تھا کہ سب بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ ماں اس معصومانہ سوال کو ٹالنا چاہتی تھی۔ مگر بچی نہ مانی۔ اور بولی:۔

اچھی بی بتاؤ۔ جواب ملا۔ نہیں۔ جو دربار کرتے ہیں وہ جَو نہیں کھاتے۔ میں نے پرسوں تم سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن

بادشاہوں کا نام فقط بادشاہ رہ جاتا ہے اور کام چھین جاتا ہے ان کو جو کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ بیٹی یہ جو ٹکڑا میسر آجاتا ہے اس کو بھی غنیمت سمجھو۔ تقدیر تو اس قابل بھی نہیں۔ آج لاکھوں روپیہ آتشبازی اور خبر نہیں کن کن بازیوں میں سرکار انگریزی کا خرچ ہو جائے گا۔ مگر اس سے کہے کون کہ ہم تیمور کے گھر والے جو کی سوکھی روٹی سے بھی محتاج ہیں۔ ایک بازی ہمارے نام کی بھی۔ دلی میں تخت بچھا ہے ایک نظر ان پر بھی ڈالو جو کل کے دن اس تخت کے مالک تھے اور آج فرش خاک پر ذلیل پڑے ہوئے ہیں مگر ہوا کس کا کہنا کس کا سننا۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ شاہوں کے شاہ سلطان کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو کی روٹی کھاتے تھے ہم اور کسی بادشاہ کو کیوں دیکھیں۔ اپنے آقا و مولا کی مثال کیوں نہ دیں۔ کہتے ہیں دانہ دانہ پر مہر ہوتی ہے (سو لنما میں جو کے دانہ پر قبولیت کی مہر لگنی چاہیے۔ دیکھوں کتنے عاشقانِ رسول گندم ترک اور جو اختیار کرتے ہیں۔ یقین مانو کہ مسلمانوں کو غذا کا فیشن فوراً بدلنا چاہیے۔ سفید چپاتی پر مرنا چھوڑ دو۔ تم کالے ہو گوری چیز سے رشتہ جوڑ دگے تو قانون گھور کر دیکھے گا۔ اگر دس بیس خدا کے بندے جو کھانے کا عہد باندھ لیں تو میں سمجھوں گا۔ روحانی حکومت کی زندگی میں جان پڑ گئی۔ کیونکہ بزرگوں سے مروی ہے کہ روح کا رنگ زرد ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ روحانی حکومت کو دنیاوی حکمرانوں سے کچھ سروکار نہیں۔ ذوق و شوق کی اقلیم پر قبضہ کرنا اور اس میں اپنا سکہ و خطبہ رائج کرنا مقصود ہے تو اس خواہش کو زرد خطرہ نہ بنا لیا جائے۔ جیسے کہ چین و جاپان کی زرد قوموں سے بعض ولایتی مضمون نگار زرد خطرے کا عنوان قایم کر کے ڈرایا کرتے ہیں۔ میرا جو اندیشہ کی چیز نہیں صاف ہے چکنا ہے۔ ایسے ہی ہم اس کے چاہنے والے بھی پالٹیکس سے علیحدہ اور کسی دوسری دھن کے شیدائی ہیں۔

پھولوں کے شکوے

قسمت و تقدیر کی شکایتیں

(از توحید ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء)

میرٹھ کی نوچندی میں راقم فقیر نے پھولوں کی نمایش دیکھی۔ یہی سارے مجمع کی جان تھی۔ اِدھر پھول۔ اُدھر پھول۔ نیچے پھول۔ اوپر پھول چاروں طرف گل خانے ہی گل خانے نظر آتے تھے۔ آراستہ خیمے میں سفید فرش پر میزیں سجی ہوئی تھیں جن پر جدا گانہ سلیقہ و ترتیب سے چینی اور شیشے کے گملوں میں رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے تھے۔ نمایش اس کی تھی کہ کس نے نیچرل اور موزوں طریقے سے پھولوں کو چنا ہے چند ڈالیاں بھی جن کو انگریز مس بابا اور مڈم کہتے ہیں جگہ جگہ موجود تھیں اور فرش کے متحرک پھول ثابت ہو رہی تھیں۔ فقیر اس عالم "گل و گل" کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ یکایک ایک جھاڑو کی ٹوکری پر نگاہ پڑی جس میں چند نہایت خوش رنگ و خوبصورت پھول رکھے ہوئے تھے اور یہ ٹوکری زمین پر دھری تھی۔ ان کو دیکھ کر آگے بڑھا ہی تھا کہ تصور کے کان میں ایک شیریں آواز نے کچھ کہا۔ یہ صدائے گل تھی۔ جو اپنی قسمت و تقدیر کا شکوہ کرتی تھی جب میری اور میز کے سامنے والے گلدستہ کی ایک ذات ہے ایک نگت ہے ایک بو ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کو شیشے کے گملے میں شاندار میز پر لگایا گیا اور مجھ کو جھاڑو کی ٹوکری میں زمین پر ڈال دیا*

پھول کے اس شکوے سے دل پر چوٹ لگی۔ اور ڈاکٹر اقبال کا شکوہ یاد آگیا جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کہ اتنے میں دوسرے کان میں صدائے مخفی نے اس کا

جواب دیا۔ اور کہا کہدے۔ اے سُننے والے۔ ٹوکری کے پھول گوشہ اور خلوت کے امن میں ہیں۔ دیدار بازوں کی یورش میز پر ہے۔ مگر یہ سب ہوس پرست ہیں۔ پھول کی ظاہری خوشنمائی کو دیکھتے ہیں لیکن ٹوکری کے پھول کو دیکھنے کے لیے نظر عرفان بھیجی جاتی ہے۔ یہ ایسی بڑی عزت ہے جو میز کے پھول کو نصیب نہیں پس اے ٹوکری کے غریب گلدستے! تجھ کو بشارت ہو کہ تیری شان کو دوام ہے اور میز کے پھول کو زوال۔

دوسری طرف پھلوں کی میزیں تھیں۔ ہمہ قسم کے میوے اور پھل چنے ہوئے تھے ان میں بعض پھلوں کو تراشکر دکھایا گیا تھا۔ ایک ترشے ہوئے پھل نے کہا۔ مجھ کو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب آیا تیرا باطن اہل ظاہر کو نظر آجائے اور وہ بھی اپنے اندرون کو چیر کر دیکھیں کہ اس میں اور ظاہر میں کچھ فرق تو نہیں ہے۔

از توحید ۱۹ مئی سنہ ۱۹۱۳ء

کل رات کو ۴ بجے ۲۶ جمادی الاول کا چاند شب اول کے ہلال کی مثل ستاروں میں جھلملا رہا تھا۔ یہ آخری تاریخ تھی۔ اب دو روز تک یہ چاند مخفی رہے گا اور ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کو نمودار ہوگا۔ مگر جمادی الاول کے نام سے نہیں جمادی الاخری نام لیکر۔

راقم فقیر آسمانوں والے۔ زمینوں والے پہاڑوں اور سمندروں والے۔ نور و ظلمت کے رکھوالے خدا سے کچھ مانگ رہا تھا کہ احساس و ادراک کے کان میں ایک نطق ایک خطبہ۔ ایک لیکچر ایک تقریر کی آواز آئی۔ ہوش نے اپنے گوش ادھر لگائے اور سُنا۔

افسردہ اور اُداس چاند ستاروں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ستارے دل لگائے

سُن رہے تھے۔ بیان ہولناک تھا۔ لہجہ اندیشہ خیز تھا۔ دل نے کہا زمین کے قانون بنانے والے سُنتے نہ ہوں۔ صوت سرد نے جواب دیا نہیں وہ سب سوتے ہیں خفیہ نویس کارِ خاص کے اہل کار نسیم سحر کی آغوش میں پڑے ہوئے مدہوش ہیں پہرہ پر کوئی نہیں۔ چاند نے کہا:۔

ستارو! سُنتے ہو اب ہم تم چند ساعت کے مہمان ہیں۔ آفتاب افق مشرق سے طلوع ہونے والا ہے۔ نور کو انوار زیر و زبر کرنے آتے ہیں آج کی رات ہم نے تاریکی کا مقابلہ کیا۔ اس سے لڑے اسکو شکست دی۔ مگر اہل جہاں سوتے رہے۔ ہماری معرکہ آرائی کی سیر نہ دیکھی۔ اب سورج کی جنگ دیکھنے کے لیے سب کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

میرے درخشندہ بھائیو! آسمان کی خاموشی دور ہونے والی ہے۔ زمین کا سکوت ختم ہونے کے قریب آگیا۔ اس لیے میں اپنے مہینہ بھر کی روشن گویائی کو تمام کرتا ہوں اور حجرۂ خلوت میں جاتا ہوں۔ کل کی رات اور پرسوں کی رات اور شاید اس کے بعد ایک اور رات مجھ کو میدان فلک میں نہ پاؤ گے۔ تمہارا کمانڈر غروب ہوتا ہے۔ تمہارا لشکر تلوار میان میں کرتا ہے۔ تنہائی میں ہمت نہ ہارنا۔ ظلمت شب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا وہ دیو ہیکل ہے۔ تم نازک اندام ہو۔ ڈر نہ جانا۔ سیاہ باطن کور دیدہ کا فتح کر لینا دشوار نہیں۔ جب تاریکی کے لشکر سمندروں، پہاڑوں اور زمینوں کے غاروں سے نکلکر آسمان کے کناروں پر حملہ آور ہوں۔ تو مریخ اپنا منور دستہ لیکر میمنہ کو سنبھالے مشتری میسرہ کو روکے۔ زحل قلب میں جم جائے۔ زہرہ عطارد و کمسریٹ کی نگرانی کریں۔ باقی افسر کمینگاہوں میں رہیں۔

شہاب ثاقب کی سرچ لائٹ سے دیکھ بھال رکھنا۔ بے خبری بُری بلا ہے اور اس کے بعد فائر ہو۔

نورانی گولے اندھیرے پر برسائے جائیں۔ شعاع کی سنگینیں چلیں کرنوں کی

گولیاں سن سن کرتی نکلیں ؛

جب دشمن کا پاؤں ڈگمگائے۔ شکست کے آثار نمودار ہوں۔ سب سپاہی چمکیں۔ دمکیں اور ایک آخری حملہ کرکے اس کا کام تمام کردیں ؛

جب آسمان کا ملک صاف ہوجائے گا۔ تاریکی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا۔ تو فرشتے فتح کا جشن رچائیں گے۔ پروردگار کی نصرت غیب کا ترانہ گائیں گے۔ تم بھی اپنی زبان کھولنا۔ حمد سبحان ذی شان میں فرشتوں کی شرکت کرنا ؛

ستاروں نے کہا:۔

اے عثمانی ہلال کی صورت کے قمر! ہم کیا۔ ہماری بساط کیا۔ غریب غروب ہونے والے تارے ہیں۔ تو بھی چھپ جانے والا کرۂ نور ہے۔ دن کا صف شکن آفتاب ہم سب میں بڑا۔ ہم سب سے زیادہ شہ زور ہے۔ مگر شام کو ناپید ہوجاتا ہے اسپر کیا گھمنڈ اور غرور کریں۔ تاریکی بھی خدا کی پیدا کردہ ہستی ہے۔ اس سے کیوں لڑیں۔ خوں ریزی و سفاکی اپنا کام نہیں۔ خاموشی میں پیدا ہوئے۔ خاموشی میں مرجائیں گے پھر اس غل و شور فتنہ و فساد سے کیا سروکار۔ کچھ اور سُنا۔ اور کوئی بات کہہ۔ زہرہ کا ایک گیت سُن۔ نغمۂ ربانی میں جی لگا۔ گود میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے ایسی نصیحت کہ جو یادگار زمانہ رہے ؛

چاند مسکرایا۔ اپنی جگہ سے سرکا۔ اور جھک کر ستاروں کے کان میں کہا۔ اس پر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ اور ایک ایک کرکے نابودی کی رزمگاہ میں گھس گئے۔ اور ان کے پیچھے چاند بھی کن انکھیوں سے دُنیا کے سونے والوں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلا۔ اور آخر کہیں غایب ہوگیا ؛

خاکی جام

فنا کے بعد بقا

عشق کی خیالی داستان!

(از توحید یکم جولائی ۱۳ء)

جب فراق کی بے چینی آدم زاد سے برداشت نہ ہو سکی۔ جب ہجر کی بے قراری انسان کے وجود خاکی کی تاب و توانائی سے بڑھ گئی تو مایوس ہستی نے زہر کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیا۔ آسمان کو دیکھا۔ اور کہا۔ پیدا کرنے والے خدا۔ یہ مشت خاک اتنی بڑی امانت کے قابل نہیں ہے۔ اپنی امانت واپس لے۔ میرے بازوؤں کو اس بوجھ سے ہلکا کر۔ اور اگر تو ایسا نہیں کریگا۔ یا نہیں کرنا چاہتا تو میں خود اس بار سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ یہ کہکر زہر کا پیالہ پی لیا۔ اور تھوڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی اس کے بعد رسموں کے پابند لوگ آئے۔ بے جان لاش کو نہلایا۔ اور سفید کفن کا جوڑا پہنا کر جنگل بیابان میں ایک گہری قبر کے اندر لیجا کر دفنا دیا۔ کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ ہمارے اس ہمجنس پر کیا گذر گئی۔ اور ہم کیوں اس سعدوم ہستی نما پیکر کو خاک میں ملاتے ہیں۔

(۲)

بڑے زور کی آندھی آئی۔ بادل کڑکے۔ بجلی چمکی۔ طوفانی بارش ہوئی جنگل میں پانی زور شور سے بہنے لگا۔ پہاڑی ندی میں سیلابی کیفیت پیدا ہوئی۔ جس کی زد میں پرانا قبرستان بھی آ گیا۔ شہید محبت کی قبر ذرا اونچے مقام پر تھی سیلاب سے بچ گئی

تاہم سامنے کے غار میں کچھ دن کے بعد مع پٹاؤ کے یہ بھی گر پڑی اور گڑھے کے اندر مٹی کا انبار بنی رہی۔ اس کو بھی ایک سال گذر گیا۔ اتنے میں ایک اور طوفان آیا سردی کا موسم تھا۔ اسا زور سے اولے برسے کہ تمام صحرا سفید ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ اولے جب برستے ہیں تو پانی ان کو سمیٹ سمیٹ کر نشیبی مقامات میں جمع کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس گڑھے میں ہمارے مردہ عشق کی خاک پڑی ہوئی تھی۔ وہاں بھی اولوں کا انبار لگ گیا۔ یہ قصہ رات کا ہے صبحکو جب اولے گھل کر اور پگھل کر مٹی میں جذب ہو چکے تھے۔ ایک کمہار اپنے گدھوں کو لیے ہوئے اولوں کی مٹی کی تلاش میں آیا۔ یعنی جن گڑھوں میں اولے جمع ہوئے تھے وہاں کی مٹی کھود کھود کر بوروں میں بھر لی۔ ہمارے مرحوم عاشق کی مٹی بھی ایک بورے کے حصہ میں آئی۔ اور کشاں کشاں کمہار کے گھر میں پہونچی۔ مشہور ہے کہ جس مٹی میں اولے ملے ہوئے ہوں اس کے برتن میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور گرمی کے موسم میں دُنیا والے اس کی بہت قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ کمہار نے اس مٹی کے بہت سے برتن۔ مٹکے۔ ٹھلیا گلاس صراحیاں وغیرہ بنائیں۔

(۳)

برسات کا موسم تھا۔ سخت گھمس اور گرمی کے بعد ابر گھر کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اور درختوں میں لہرا رہی تھی۔ سبز ٹہنیاں آبادیوں میں ہوا پاشی کر رہی تھیں۔ یکایک دیکھا کہ ایک کمرہ آراستہ ہے جس میں ایک پری جمال حور لقا مستی نشۂ شباب میں مخمور انگڑائیاں لیتی ہوئی اُٹھی اور نوکر کو حکم دیا کہ کمہار کے یہاں سے ایک صراحی اور جام لیکر آئے۔ مگر یہ صراحی اور جام اولوں کی مٹی کے ہوں۔ تعمیل کی گئی۔ گنہگار ہاتھوں نے شراب کی بوتل کھولی۔ صراحی میں پانی بھرا۔ اور اس میں وہ شراب ڈالدی گئی۔ اس کے بعد پانی ملی ہوئی شراب گلاس میں نکالی گئی اور ایک انداز مستانہ سے وہ گلاس ہونٹوں تک پہونچا۔ جس وقت لب جاں بخش جام خاکی سے ہم آغوش ہوئے ایک صدائے غیب

نے یہ شعر پڑھا ؎

پسِ مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے
لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

او مغرور بے خبر۔ جفا کار مستانے شرابی۔ میں اس آدمی کی خاک ہوں جو تیری یاد میں پھڑک پھڑک کر مرگیا۔ میرا جسم۔ میری ہڈیاں۔ میری آنکھیں جو تجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرا وہ دل جس میں تیرے ملنے کی آرزو تھی۔ میرا وہ دماغ جو تیرے وصال کے تخیلات میں سرشار رہتا تھا سب خاک ہوگئے۔ لیکن پوری بربادی کامل تباہی۔ اور آخری فنا کے بعد آج یہ مقام بقا حاصل ہوا۔ اور میرے ہونٹوں کی خاک گلاس کے کنارے میں پیوست ہو کر تیرے لب سراپا حیات تک پہونچی۔ اور وصال کی گھڑی نصیب ہوئی۔ اگر یہ وصل جسم کی زندگی میں میسر آتا۔ تو ہرگز ہرگز وہ دوامی لطف حاصل نہ ہوتا جو آج کے دن محسوس ہو رہا ہے اور جو یقیناً ہمیشہ قایم و برقرار رہیگا۔

(۴)

عشق کی اس داستان کو سُنکر راقم درویش نے کہا او مسلمان! تو ہراساں اور پریشان نہ ہو۔ **دورِ حاضر** کی مصیبتیں تیری ابدی بقا اور پایدار زندگی کی نشانیاں ہیں ہیں غور کر اور خوش باش ہو۔

دوربین اور مکاشفاتِ غیب

(از توحید یکم جولائی ۱۹۱۵ء)

تمہاری آنکھ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی تو ایک دوربین منگالو۔ بُعد کی منزلیں قریب آجائیں گی۔

دوربین کیا چیز ہے؟ سب جانتے ہیں۔ آدمی نے ہنر اور علم کے زور سے ایک شیشہ ایجاد کیا ہے۔ جہاں اس شیشہ کو آنکھ کے سامنے لگایا بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوگز پرے کے در و دیوار چہرہ کے پاس آگئے +

بعض دوربینیں لاکھوں کوس کی چیز دکھا دیتی ہیں۔ آج کل یورپ والوں نے ایسی دوربین ایجاد کی ہے جس سے چاند سورج اور آسمان کے سب تاروں کی حقیقت نظر آجاتی ہے۔ لوگوں نے اس دوربین کے ذریعہ حساب لگا کے بتا دیا ہے کہ سورج کتنا بڑا اور ہم سے کس قدر دور ہے۔ چاند اور مریخ زمین سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ اور ان کی اندرونی حالت کیسی ہے۔ انہی دوربینوں سے قدرت کے نامعلوم بھید بھی کھل گئے۔ مثلاً پہلے زمانہ میں فقط ایک چاند سورج کا علم تھا اور نادان خلقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس ارشاد پر ہنستی تھی کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی متعدد عالم ہیں۔ جہاں یہاں کی طرح چاند سورج اور مخلوق آباد ہے +

مگر اب دوربین نے یہ دعویٰ سچا کر دکھایا۔ اور یورپ والے مان گئے کہ اس سورج کے علاوہ جو ہم کو نظر آتا ہے اور جس کے طلوع و غروب سے دنیا کے رات دن کا حساب مقرر ہے اور بھی بہت سے سورج ہیں اور ان کے ساتھ بھی اسی طرح ایک عظیم الشان نظام اور کائنات گردش کر رہی ہے۔ جس طرح ہمارے سورج کے ساتھ ہے۔ گویا دوربین نے غیب کی باتوں کو عیاں کر کے دکھا دیا اور مسلمانوں کے ایمان بالغیب کی تصدیق ہوگئی +

ان بڑی دوربینوں کے علاوہ میدان جنگ میں ایک اور دوربین استعمال کی جاتی ہے یعنی جنگی جہازوں اور خشکی کے لشکروں کے پاس ایک دوربین ہوتی ہے جس سے سینکڑوں کوس کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں کہ دشمن اس وقت کس حال میں ہے اور اس کے پاس کیا کیا ساز و سامان ہیں +

بہر حال دوربین ایک عجیب طلسم کشا لوح ہے جب آنکھ کے سامنے آتی ہے
تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دور کی چیز بالکل سامنے کھڑی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ وہاں
نہیں ہوتی + دیکھنے والے کو صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز قریب آگئی تو کیا دوربین

دھوکہ کی ٹٹی ہے ؟

نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دوربین صداقت کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ دکھاتی ہے
بے کم و کاست سچ اور واقعی ہوتا ہے لیکن دوسرے آدمی جن کی آنکھ پر دوربین
نہیں ہوتی اس میں شک کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی
کہ اتنی دور کی چیز آنکھ کے پاس آگئی +

چنانچہ صوفیائے کرام کے مکاشفات غیب پر ایسے ہی لوگ جو ظاہری دوربین کے
کمال سے بے خبر ہیں لعن طعن کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یہ بات بالکل عقل کے خلاف
اور عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت وہ لوگ
جن کی آنکھیں بصیرت کی دوربین سے محروم ہیں اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آن کی آن میں ساتوں آسمانوں کو طے کرکے عرش اعظم
پر پہونچ گئے۔ پروردگار عالم سے ملاقی ہوئے۔ دوزخ جنت کی سیر دیکھی اور واپس
آئے تو بستر گرم تھا۔ دروازہ کی کنڈی ہل رہی تھی یعنی اتنے عظیم الشان سفر میں
چند سکنڈ سے زیادہ عرصہ نہ لگا +

مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ دوربین کے اندر سے نگاہ آن کی آن میں لاکھوں کوس
کیونکر پہونچ جاتی ہے اور بڑے بڑے مقامات کی سیر کرکے چند سکنڈ میں واپس بھی آجاتی ہے
تو آیا یہ مشاہدہ عقل کی موافق ہوتا ہے یا خلاف ؟ +

اصل یہ ہے کہ نئے زمانہ کی تمام ایجادیں اور سائنس کے آلات بظاہر تو لوگوں کو

تقدا سے بے خبر کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے باطنی حقائق
بھی چیزیں مذہبی عقائد کی مستحکم دلیلیں اور خدا پرستی کے

سگنل

بن جائیں اور پھر حیات انسان کی سب ریل گاڑیاں دُنیا کے سٹیشن سے بے خطر
پاس ہو کر منزل آخرت تک پہنچنے لگیں*

گلاب تمہارا ایکسر ہمارا

از توحید ۲۴ جولائی ۱۹۱۳ء

ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ جو گلاب کے پھول پر مرتے ہیں سینکڑوں
برس سے ایک ہی چہرے کے طلبگار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ مقلد ہیں۔ سنی سنائی
تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں*

میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔ مجھ کو ایک اور آنکھ ملی ہے جو ان سب سے اونچی ہے
میرے دل کی ہمنشینی و ہمسری کے ان میں سے ایک بھی قابل نہیں۔ میں بندہ ہوں۔
سب بندوں کی مثل ہوں۔ میں بشر ہوں۔ تمام بنی آدم کے برابر درجہ لیکر آیا ہوں۔
میں نبی نہیں ہوں۔ ملی نہیں ہوں۔ مہدی اور عیسیٰ نہیں ہوں۔ دعویٰ خود نمائی۔ و
خودستائی سے بھی انکار ہے۔ مگر میں عالم تعین و ہستی مثالی کی ایک تصویر ہوں۔ جس میں
رنگِ فطرت کی قلمکاریاں ہیں۔ اس واسطے میں خود اپنے وجود کا طلبگار ہوں اور
اسی لیے یہ تعلی یہ خود آرائی ہے تاکہ میں خود کو اپنی خودی دکھاؤں اور خطاب کروں
کہ جتنے یہ تک جوڑنے والے شاعر ہیں۔ سب نے گلاب کے پھول کو تختۂ مشق بنایا ہے

کوئی اس کی بھینی بھینی بُو پر فدا ہے۔ کوئی اس کی نازک پتیوں پر نثار ہے
کسی کو اس کے رنگ سے رخسار محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے۔ کسی کا دل اس کے کھلنے
اور مرجھانے کے انقلاب میں اسیر ہے۔ بعض ہیں کہ جو گلاب کے خار سے خار کھائے
بیٹھے ہیں۔ خیر یہ عشقی باتیں ہیں۔ ان میں تو شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے
کہ انہوں نے خدا کی بے شمار

مخلوقات کی حق تلفی

کی۔ ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دیے۔ ایک ہی آئینہ کی دید میں مدہوش ہو کر رہ گئے
اور ان بے شمار جلووں کو نہ دیکھا جو ان کے لیے صفحۂ ہستی پر نمودار کیے گئے تھے یہ
انہوں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اس میں ان سے ایسی خطا سرزد ہوئی ہے جس کی سزا
نہایت ہولناک ہونی چاہیئے۔ گلاب کی اُلفت میں باغ لگائے۔ چمن بنائے۔ مالی محافظ
بسائے۔ پانی کھچوائے اور زمین کے تختوں کو سیراب کیا۔ پھولوں کی ٹہنیوں کے سامنے
اپنے تخیل کے ذوق کو سجدے کرائے۔

یہ نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خود رو پھولوں کو دیکھتے جن کا مالی خدا ہو
جن کا چمن صحرا ہے جن کی سیرابی قدرتی سیلابی سے ہے ان میں ایک

کیکر تھا

کیا چپ چاپ تھا۔ کیا مضبوط و توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں۔ اس کی
پتیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے
والی شاخ ہے جس کو آجکل کے

شہ زور زمانہ

ہیں بقول ڈارون رہنے کا کوئی حق نہیں ہے یہ وقت اُن کی زندگی کا ہے جو حوادث ایام کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے اعضاء دوسروں کے کام آتے ہیں۔ کیکر کی چھال مفید جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑی سینکڑوں کام میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں۔ اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں +

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو گلقند کھلاؤ ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ۔ مر جاؤ تو قبر پر چڑھاؤ اور بھی کوئی کام اس منحوس وجود سے نکلتا ہے +

گلاب کے کانٹوں کو دیکھو کیسے دھوکہ باز ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ ہاتھ لگاتے ہی چبھ جاتے ہیں۔ کیکر کے کانٹے دُور سے نظر آتے ہیں۔ کیا مجال کہ بے خبری میں کسیکو ستائیں +

گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینک دینے کے قابل۔ کیکر کے کانٹے سوکھکر گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اسپر طرہ یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سیدھا سادہ اور نکیلا ہوتا ہے رنگ دیکھو تو وہ بھی انوکھا۔ نرالا۔ شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں میسر +

گلاب کے درخت میں پتے بالکل بدشکل اور بیکار۔ کیکر کی پتیوں کے کیا کہنے۔ کیسی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پتیاں ہیں کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے +

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایکدن کی تیز دھوپ میں کھلا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں زندہ سلامت رہے +

گلاب کا پھول سُرخ یا سُرخی مائل اور ایسا کچا کہ مالیوں کی استادی سے رنگ بدل دیتا ہے مالی جس کو چاہیں سرخ رکھیں۔ جسکو چاہیں سفید بنا دیں +

کیکر کا پھول اپنے رنگ میں پختہ۔ سارے جہان میں ایک ہی زرد رنگ کیا مجال جو کوئی

شخص اس کے رنگ کو بگاڑ سکے +

شاعر کہتے ہیں گلاب کے پھول سے معشوق یاد آتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کیکر کے پھول سے عشق یاد آتا ہے۔ جس سے انسان کی رنگت زرد ہو جاتی ہے +

اب بتاؤ عشق اچھا یا معشوق۔ عشق نہ ہوتا تو نہ عاشق کو کوئی پوچھتا نہ معشوق کی کچھہ وقعت رہتی۔ یہ عشق ہی کی بدولت سب بستیاں آباد ہیں +

ارے نادان تجھے شاعروں سے کیا کام پہلے اپنے وجود کے تخیلات کو درست کر ان میں فطرت شناسی کا ملکہ نمودار ہونے دے۔ آج گلاب کو چھوڑکر کیکر کے آگے جھوتا ہے۔ کل اسکو بھی چھوڑ دیگا کسی اور ہیکر کے جلوے میں دھیان جائیگا۔ ساری دنیا میں کانٹے پھیلے ہوئے ہیں۔ کس کس جگہ جھاڑو دے گا۔ خود جوتی پہن لے اور رستہ چلنے لگ۔ ہاں تو حق پر ہے۔ ہاں یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو منزل جاناں تک جاتی ہے۔ من و تو کا حجاب اٹھا۔ اس کے بعد خود اپنی خودی کا پردہ کھول کر اندر گھس جا۔ پھر یہ آواز نہ آئے گی کہ

گلاب ہمارا اور کیکر ہمارا

اوس

(از توحید ۸ اگست ۱۹۱۳ء)

مَیں شبنم نہیں کہتا۔ یہ فارس والوں کا لفظ ہے۔ فارس پر ادبار کی اوس پڑچکی وہ وقت اب کہاں ہے جب ایران کے چمن آباد تھے۔ سعدی و حافظ کی حقیقت شناس نظریں پھولوں کی ڈالیوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کی بہاریں دیکھتی تھیں۔ اب تو روسی ظالموں کے جور و ستم سے بیوہ اور یتیموں کی آنکھیں قطرات شبنم کی شکل

آنسوؤں کی اوس پلکوں پر جماتی ہیں +

برسات کے موسم میں کوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا خواستگار ہے۔ کسی کو اودی اودی کالی کالی گھٹائیں پسند ہیں۔ کسی کا دل بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے مست ہو جاتا ہے۔ مجھ کو تو برسات کی یہ ادا بھاتی ہے کہ مینہ برس کر کھل جاتا ہے۔ اور صاف آسمان کی رات گزر جاتی ہے تو صبح کے وقت درختوں۔ پھولوں اور جنگل کی گھاس کی عجیب شان ہوتی ہے۔ اوس کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر ایسے چپ چاپ نظر آتے ہیں جیسے رات کو آسمان کے تارے تھے۔ کیا خبر ہے کہ رات کے وقت تارے ٹوٹ پڑے ہوں۔ یہ انہیں کی گل افشانیاں ہیں +

کہتے ہیں کہ اوس میں سونا۔ اوس میں پھرنا جسم انسان کے لئے مضر ہے۔ خبر نہیں یہ کیوں کہتے ہیں۔ خدا کی ساری مخلوق تو اوس باری سے تر و تازہ اور نہال ہو جاتی ہے انسان بھی ایک مخلوق ہے اُس کو اس سے کیوں نقصان پہنچتا ہے +

یہ تو سائنس والے بتائیں گے کہ اوس کیا چیز ہے۔ کہاں سے آتی ہے کیوں آتی ہے۔ فقیر تو اتنا جانتا ہے کہ اوس قدرت ربانی کا ایک عجیب و غریب جلوہ ہے جن کی آنکھ بہت سویرے بیدار رہنے کی عادی ہے۔ وہ صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے اوس میں ذات الٰہی کے ہزاروں جلوے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا باغ میں جوہی کے پھولوں کے پاس جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا اور ایسا مستغرق تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں تھی۔ درحقیقت جوہی کے پھول پر اوس کا انداز قیامت کا ہوتا ہے چھوٹا سا پھول۔ نازک پتیاں۔ اور اس پر اوس کی ننھی ننھی بوندیں۔ حس و حرکت کرنے والے دل کے لئے دورِ محشر سے کم نہیں اوس کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ رات کو پیدا ہوتی ہے۔ اور سورج نکلتے وقت مر جاتی ہے۔ اوس کی سیرابی باران رحمت کی طرح ہر خاص و عام چھوٹے بڑے سینچا پنچے کے لیے یکساں مفید ہے مگر مینہ سورج کا مقابلہ کرتا ہے

بادلوں کے لشکر لاتا ہے تو آفتاب کو پوشیدہ ہونا پڑتا ہے۔ مگر اوس بیچاری بڑی ڈرپوک صلح کل ہے۔ آسمان پر جب سورج کا عمل دخل نہیں رہتا۔ اور بادل بھی اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں اسوقت یہ نمودار ہوتی ہے اور سورج کے نکلنے کے ساتھ ہی جان دیتی ہے

اوس کی شکایت

انسان اگر یہ شکایت کرے تو حق بجانب ہے کہ اوس تمام در و دیوار کو شجر و حجر کو تر کر دیتی ہے۔ مگر کسی پیاسی زبان کی تشنگی دور نہیں کر سکتی۔ اردو زبان میں ایک مثل ہے کہ اوس جب پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے گویا ہاتھی اوس میں نہا لیتا ہے مگر چڑیا کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہ قدرت کا ایک گہرا راز ہے۔ اس میں اوس کی کچھ شکایت نہ کرنی چاہیے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے اوس بھی ایک نشانی ہے جس کو دیکھکر دل حق پرست میں عرفان یزدان کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔

رمضان میں سیاہ و سفید ڈورے کی رہنمائی

(از توحید ۱۶ / اگست ۱۹۱۳ء)

دنیا کی سب سے بڑی کتاب میں رمضان کی نسبت خدا نے فرمایا کلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ کھاؤ اور پیو جبتک کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے نمایاں نہ ہو جائے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق نمودار ہونے لگے تو کھانا پینا ترک کر دینا چاہیے۔ ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ صبح صادق جب ہوتی ہے کہ نور سحر کے سبب آنکھ کالے سفید ڈورے میں تمیز کرنے لگے ۔

یہ تو اہل علم کے مسائل ہیں۔ گدڑی پوش بے نوا کو یہ بحث مقصود نہیں ہے وہ تو قرآن بھیجنے والے کی اس ادا کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے۔ جو خیط ابیض اور خیط اسود یعنی سفید کالے ڈورے کے الفاظ میں نظر آتی ہے +

اگر زخمی دل والوں اور تیر خوردہ جگر کو معلوم ہوجاتا کہ روزے کی سحری میں نور و ظلمات کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں اور رخ و زلف کے جلووں سے رہنمائی ہوتی ہے تو ساری عمر روزہ ترک نہ کیا جاتا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے جو بعض مست الست بارہ مہینے لگاتار روزے رکھتے ہیں ان پر انہی کالے سفید ڈوروں نے ڈورے ڈالے ہیں۔ خلقت ولایتی گھڑیوں۔ گولوں اور نقاروں پر آسرا جمائے بیٹھی رہتی ہے ہزار میں شاید ایک آدمی کو بھی سحری کے وقت خدا کی بتائی ہوئی گھڑی کا خیال نہ آتا ہوگا +

اگر وہ مجازی حیثیت سے ہی صبح کاذب اور صبح صادق کو محض وقت سحری معلوم کرنے کے لیے دیکھا کرے تو وقت سحر کے ہزاروں جلوے آسمان پر نظر آئیں +

چشم حقیقت ان سیاہ و سفید ڈوروں میں رات دن کی سیاہی و سفیدی سے علیحدہ ایک چیز دیکھتی ہے۔ اس لیے اس کو رمضان کی سحری میونسپل کمیٹی کی ممبری۔ چھوٹے لاٹ کی کونسل کی ممبری۔ بڑے لاٹ کی کونسل کی ممبری اس سے بھی آگے عہدہ ججی اور اگر میسر آئے تو منصب وائسرائے یا وزیر ہند اس سے بھی بڑھ کر ہفت اقلیم کی بادشاہی سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہے +

دُنیا کے حریص بادشاہوں اور امیروں سے کہو کہ اپنی طمع کاریوں کو چھوڑ دیں اور پچھلی رات بیدار ہوکر کالے سفید ڈوروں کی بہار دیکھیں کہ کیونکر رات کی تاریکی میں نور کی سپیدی نمودار ہوتی ہے۔ اور اس ظہور کے وقت دل کو اگر اس میں حس ہو کیسی لذت آتی ہے۔ اگر وہ اس لذت کا ایک بار بھی معائنہ کریں تو دُنیا کے

یہ تمام جھگڑے فساد مٹ جائیں۔ مگر وہ سیاہ سفید ڈوروں والے جناب تو خیر و شر کے قبضہ دار ہیں وہ کب گوارا کریں گے کہ یہ آنکھ ان کی شان کو دیکھ کر لطف اٹھائے +

گیان کتھا

(از توحید ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء)

اپنے گیانی دیس ہندوستان کو کیا کہوں۔ بدیسی سنگت سے اگیانی ہو گیا۔ یونیورسٹی کی کتابوں میں صبر سنتوش شانتی و اطمینان کا راستہ ڈھونڈھتا ہے +

کل پچھلی رات آکاش بانی صدائے ہو میرے کان میں آئی۔ کہا۔ علم کاغذی کتاب میں نہ دیکھ۔ سنسار کائنات ہستی موجود کا ورق کھول۔ اس میں دھیان کر۔ اور گیانی بن۔ میں نے کہا تو آ۔ اور مجھ کو پڑھا۔ میرے پرم گیان پربھو۔ عالم اسرار خداوند نے اس کو مانا اور مجھ پر نازل فرمایا +

پانی دیکھنے میں ایک۔ مگر مزا سمندر کا کھاری۔ کنویں دریا کا میٹھا۔ گلاب کی جڑ اور تخم ایک۔ لیکن پھول۔ پتے کانٹے میں جدائی۔ پانی کی افراط درخت کو گلا دیتی ہے مگر کنول کے پھول کی زندگی لبریز پانی سے ہے +

تو دیکھ بگلا سفید ہے۔ کوئل کالی ہے۔ طوطا سبز ہے۔ تو سن۔ انجن کی سیٹی کان کو ناگوار ہے۔ اور پپیہے کے نغمے دلنواز۔ تو چکھ۔ املی کھٹی ہے۔ نیم کڑوا ہے۔ گھر سے نکل پہاڑ اونچے ہیں۔ زمین نیچی ہے۔ دریا بہتے ہیں۔ کنارے ساکن ہیں۔ غور کر۔ سورج نکلتا اور روز چھپ جاتا ہے۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور و ظلمت کی دو حکومتیں پلٹ جاتی ہیں +

یہ کیوں ہے؟

تیرے صبر و قرار کے لئے سنسار بے قرار ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ دریا بہتے ہیں۔ سمندر موجیں مارتا ہے۔ ہوا چلتی ہے۔ بادل آتے جاتے برستے برساتے ہیں۔ بجلی چمکتی کڑکتی ہے بوندیاں اعلیٰ سے اسفل ہوتی ہیں۔ تاکہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے اور جانے کہ گردش ہر موجود کی ڈیوٹی ہے۔ بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے۔ سمندر ہلتا اور نشیب و فراز کے عالم اپنی صحت کی خاطر برداشت کرتا ہے۔ ورنہ اس کا پانی سڑ جائے۔ دریا اپنی زندگی کے لیے رواں دواں ہے۔ ورنہ تالاب کا گندہ پانی کہلائے۔ ہوا نہ چلے تو کمزور زہریلی اور بھاری ہو جائے۔ شعلہ آتش نہ بھڑکے تو دھوئیں کی تاریکی میں نابود ہے۔ بادل نہ برسیں تو دوسرے سال سمندر میں ابخرے پیدا نہ ہوں اور ان کی نسل منقطع ہو جائے بجلی چمکنا گرجنا چھوڑ دے تو فلک کے اعیان و اشراف میں بے آبرو ہو جائے بوندیاں خاک کی پامالی سے انکار کریں تو ابر رحمت کے خطاب سے محروم کر دی جائیں +

انسان! آدمی!! خیال کر۔ جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لئے متحرک ہے تو تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر۔ عمل کر۔ گیان۔ موکش۔ نجات۔ سرور ابدی۔ عمل و حرکت میں ہے +

دُنیا کی بنیاد خوشی و راحت پر ہے

دیوانہ ہوا ہے۔ زندگی کو آلام و مصیبت کی پوٹ سمجھتا ہے۔ تو کیسا نادان ہے۔ میں نے نیچر و فطرت کی بنا خوشی و راحت پر رکھی ہے۔ جب تو بیمار ہوتا ہے۔ ابر سورج پر آجاتا ہے دریا کنارے سے اُبل پڑتا ہے۔ تو تو صحت۔ روشنی اور سیلاب سے سلامتی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تکلیف میں ہوں۔ کہ بیماری کے جاتے رہنے۔ بادل کے پھٹ جانے طوفان کے تھم جانے سے کیا کوئی نئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ بیماری گئی تو وہی تندرستی آئی۔ جو پہلے تھی۔ بادل پھٹا تو وہ سورج چمکا جو پہلے اسی طرح چمکا کرتا تھا۔ طوفان رکا۔ دریا سمٹا

تو وہی کنارہ نظر آیا جو ہمیشہ خشک رہا کرتا تھا۔ کوئی نئی چیز تجھ کو حاصل نہیں ہوئی اسکو سوچ۔ میں نے تجھ کو تندرست بشاش مطمئن پیدا کیا ہے تیرے اعمال تیرے کرم تجھ کو تکلیف دیتے ہیں۔ جو عارضی ہوتے ہیں اور اس کا دور ہونا اور اصل بنیاد کا ازسر نو نمودار ہونا میرا اٹل قانون ہے۔ اسواسطے عارضی تکلیفات سے مضطرب اور مایوس نہ ہوا کر۔

پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے۔ بھوک پیٹ بھرنے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اسکو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے۔

میں نے آدم کو اپنے وجود محیط الکل کا آئینہ بنایا ہے۔ اس میں میری کبریائی دیکھ میری رعنائی اور قہاری مشاہدہ کر۔ میری رحمدلی و ملنساری کو محسوس کر۔ اسرار مخفی کے نمود و ظہور کی خاطر یہ کارخانہ بنا ہے۔ ان کو نمودار ہونے دے۔ جب تو آئینہ ہے تو میرے ہاتھ میں رہ اور جو کچھ تجھ میں نظر آئے اس میں دخل انداز نہ ہو۔

معبود و عبد نواز کے اس الفاظ کے بعد میں نے اپنے جسم۔ اپنی قوم کے جسم۔ اپنے ملک کے جسم۔ اعضا سے خطاب کیا۔ جو حوادث ایام سے آشفتہ تھے اور روح سے نادانی کے مطالبات کر رہے تھے۔ اور کہا ظہور صفات کے کرشموں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو اور اپنے رب پر توکل و اعتماد رکھو۔ جس میں راحت و ایمان ہے۔

ہردواری گنگا کے کنارے چنتامن مرتی

(از توحید ستمبر ۱۹۱۳ء)

کیسا اچھا وقت تھا۔ جب اس مضمون کا لکھنے والا ننگے پاؤں۔ ننگے سر بغل میں جھولی

کندھے پر کمبل۔ ہاتھ میں ڈنڈا لیے۔ ہردوار میں ہر کی پیڑی کے سامنے گنگا کے عالم آب کی بہار دیکھ رہا تھا۔

دریا لہریں مارتا نہانے والوں کے میل کچیل کو صاف کرتا۔ پختہ سیڑھیوں کو گلے لگاتا۔ اٹھکھیلیاں کرتا ہوا جارہا تھا۔

مجھ کو عالم محویت و استغراق میں دیکھ کر ایک سادھو مورتی ادھر آن نکلی۔ میں سمجھا کوئی پوجاری ہے۔ اس لیے توجہ نہ کی۔ اور منہ پھیر لیا۔ کیونکہ تین روز سے پوجاریوں نے میرے اطمینان کو غارت کر رکھا تھا۔ اجنبی دیکھ کر نذرانے مانگتے تھے۔ اور سکوت کے لطف کو برباد کرتے تھے۔

سادھو وا تاڑ گئے۔ اور بولے۔ گنگا جی کی لہروں میں دکھ سکھ دونوں ہیں۔ دکھ سے گھبرانا سکھ سے ہاتھ اٹھانا ہے۔

کانوں کو اس مزیدار بات نے متوجہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھا۔ عجب مستانی صورت تھی ساٹھ ستر برس کی عمر۔ مگر آنکھیں عہد شباب کی مستی سے مخمور۔ چہرہ ماہتاب کی مانند پرنور میں بولا۔ جا بابا اپنا کام کر۔ یہاں دکھ سکھ سے غرض نہیں۔ ہر کا نام سنا تھا۔ دوار کے لفظ نے بیتاب کیا تھا۔ اِدھر بھی آ گئے۔ دکھ سکھ کا قصہ ان کو سنا۔ جنہوں نے یہ سامنے کا کتبہ لگایا ہے۔ جس میں گنگا جی کے مناقب ہیں۔ سادھو نے منہ پھیر کر اس پتھر کو دیکھا جس پر اردو زبان میں گنگا کی تعریف کے اشعار کندہ تھے۔ اور ہنس کر میری طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ ان لکیروں سے تو مجھ کو بھی کچھ سروکار نہیں۔ اپنی جھولی کو ٹٹولو۔ اس میں کیا ہے میں نے کہا اس کو نوٹ بک کہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تو اس میں کچھ لکھ لیتا ہوں کہنے لگا۔ اس کے پانچویں ورق میں کیا یادداشت لکھی ہے؟ اس سوال نے متعجب کیا نوٹ بک نکالی۔ دیکھا لکھا تھا۔ ہردوار یا رشی کیش میں کوئی کام کا فقیر ملے۔ تو اس سے خواب کا بھید دریافت کرنا چاہیے۔

سادھو کے مکاشفے سے حیرانی ہوئی۔ مگر اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ میں نے وہ ورق دیکھا۔ آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

بولے۔ ہاں میں اسی لیے آیا ہوں۔ تم ابھی بیدار ہو۔ اور دُنیا کے بیدار کرنے کا گھمنڈ دل میں ہے۔ اس کو چھوڑو۔ آنکھیں بند کرو تاکہ نیند کا طلسم کُھل جائے۔

میں نے کہا۔ کس کا سونا۔ کیسا جاگنا۔ بات کو چکر میں نہ ڈالو۔ میں نے بہت سی آنکھیں دیکھی ہیں۔ جو کہنا ہو صاف صاف کہو۔ فرمایا۔ گنگا میں اشنان کیا؟ عرض کی گئی ہاں فرمایا کچھ دیکھا؟ کہا۔ کچھ نہیں۔ ارشاد ہوا اب نہاؤ۔ دل میں خطرہ گذرا کہ ڈبکی چڑھ رہتو۔ مگر کی نقدی کو بھانپ کر کپڑے اُتروانے چاہتا ہو۔ اس لیے عذر کیا کہ اس وقت نہیں نہاؤنگا بولے اچھا جانے دو۔ دل کو شبہ کے گناہ سے بچاؤ۔ اور لو سنو۔ کان میں کچھ کہوں۔ میں نے سر جھکا دیا۔ اور سادھو داتا نے خواب کی نسبت کچھ کہا۔

بات معمولی تھی۔ جس کو میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ مگر اس انداز کی تھی کہ جی بے قرار ہو گیا فرمایا لو جاتے ہیں۔ اور اُٹھکر چلنے لگے۔ میں نے بے اختیار ہو کر دامن پکڑ لیا۔ اور عرض کی نام بتاتے جایئے ٹھکانے کا نشان فرمایئے تاکہ پھر درشن ہو جائیں۔ بولے چنتا من اس مورت کا نام ہے۔ اور مقام کا کچھ ٹھیک نہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ ہردوار میں دھوکر بازوں سے بچنا۔ رشی کیش جاؤ تو وہاں بھی اچھی صورت پر فریفتہ نہ ہو جانا۔ بہت سے دوکاندار فقیری لباس میں ملیں گے۔ مگر جو بات کان میں کہی ہے۔ اس کو یاد رکھو گے تو گنگا کے کنارے آنے کا پھل مل جائے گا

گنگا جس کا نام ہے۔ وہ یہ دریا نہیں جو پانی کی صورت میں رواں دواں نظر آتا ہے گنگا کی عظمت کو اس خیال سے کیا سروکار۔ جدید روشنی کے لوگ مادی صورت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ گنگا کی حقیقت بڑے سوچ بچار سے معلوم ہوتی ہے یہ کہا اور چل دیئے۔

انگلی کا کشف

از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۲ء

دل۔ دماغ۔ اور روح کا کشف سب نے سنا ہوگا۔ انگلی کا کشف عجیب ہے۔ مگر اُن کے لئے جو انسانی اسرار سے بے خبر ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اس بولتی چالتی مورت میں اللہ میاں نے کیا کیا بھید رکھے ہیں۔

کشف کے منکر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی انسان میں کشف غیب کی طاقت نہیں جو اولیاء اللہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کو کشف کے ذریعہ امور مخفی معلوم ہو جاتے ہیں سب غلط اور توہم پرستی ہے۔

لیکن ہمیں انکار اقرار سے کیا سروکار۔ ہم تو کشف پر عقیدہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ جو قصہ اس قسم کا سنتے ہیں۔ ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اور اسرار ربانی کی عظمت بڑھتی ہے دہلی میں میرے ایک دوست ڈاکٹر سراج الدین نامی ہیں۔ حبش خاں کے پھاٹک میں مطب کرتے ہیں۔ طبی اور جراحی قابلیتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ باعتبار مشرب اہل حدیث یعنی غیر مقلد ہیں۔ لیکن ان کی عادات و خصائل سچے اور پکے درویشوں کی سی ہیں یعنی بے طمع سادگی پسند فقیر دوست۔ صلح کل۔ ہزاروں غریب ان سے فیض پاتے ہیں۔ قصہ مختصر چار صدی اول کے درویشوں کا نمونہ ہیں۔

میں بیمار تو زیادہ ہوتا ہوں۔ مگر علاج زیادہ نہیں کرتا۔ اور کرتا ہوں تو اس غیر مقلد درویش کا۔ خدا تعالیٰ نے بھی ڈاکٹر صاحب کی صادق بندگی کو محروم نہیں رکھا اور ہاتھ میں وہ اثر دیا ہے کہ ان کے بیمار عموماً اچھے ہو جاتے ہیں اور سب سے عجیب کمال یہ عطا ہوا ہے کہ ان کی انگلیوں کو کشف ہوتا ہے۔ جسم ٹٹو لکر بتا دیتے ہیں کہ

یہاں پھوڑا ہے۔ اتنا بڑا۔ اتنا گہرا۔ اور اتنی پیپ اس کے اندر ہے۔ اتنے عرصہ میں اس کا
مواد پختہ ہو جائے گا۔ بظاہر یہ امر ایک معمولی معلوم ہوتا ہے۔ ہر جراح اور تجربہ کار
ڈاکٹر اس قسم کی باتیں بتا سکتا ہے۔ مگر تعجب تو اس کا ہے کہ کبھی ان کی رائے غلط نہیں
ہوتی بڑے بڑے سند یافتہ ڈاکٹروں کے مقابلہ میں ان کی رائے درست نکلتی ہے اور
ایسی درست کہ ذرہ بھر فرق نہیں رہتا۔ دہلی و بیرونجات میں جن لوگوں کو ان سے سابقہ
پڑا ہے وہ ایسے سیکڑوں واقعے جانتے ہونگے۔ لیکن ابھی حال میں جو معرکہ پیش آیا
ہے وہ سب سے عجیب ہے۔ دہلی میں ایک مشہور و معروف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب
ہیں جن کو شاید سرکار سے ہزار روپے کے قریب ماہوار پنشن ملتی ہے۔ سُنا ہے کہ ان کے جسم
میں کہیں پھوڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سراج الدین کو بلایا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ پیپ پڑ گئی ہے
نشتر لگانا چاہیے۔ انگریز سول سرجن اور دیگر چند ڈاکٹر بلائے گئے۔ ان سب کی رائے
ہوئی کہ پیپ نام کو نہیں۔ نہ ابھی پھوڑا پکا ہے۔ آخر بڑی حجت اور پورے غور و خوض
کے بعد چیرا دیا گیا تو ڈاکٹر سراج الدین کی رائے صحیح نکلی ۔

رمزِ حقیقت

ڈاکٹر سراج الدین کی یہ قابلیت رمزِ حقیقت ہے۔ خدا تعالیٰ دکھانا چاہتا ہے
کہ کسب اور کوشش سے انگلی تک کاشف حقیقت بن جاتی ہے روحانی کشف تو اس
سے بھی بڑھ کر کشاف حقیقت ہوتا ہوگا ۔

ڈاکٹر سراج الدین ناراض نہ ہوں ان کے عقیدے پر حملہ کرنے کی نیت سے یہ نہیں
لکھا جاتا۔ وہ اگر اپنے مشرب اہل حدیث کے سبب کشف کے قائل نہ ہوں تو مضائقہ نہیں
ہم ان کی انگلی کے کشف کے دل سے قائل ہیں اور قدرت ایزدی کے کرشموں
پر سر ہلانے والے متانوں کی اطلاع کے لیے اس خبر کو درج کرتے ہیں اُمید ہے کہ اس

بات کا علم بہت لوگوں کے باطنی لطف وطرب کا باعث ہوگا۔

اینٹ چونے کا وصال

(از نظام المشائخ جون ۱۹۱۲ء)

ایک دن کا ذکر ہے کہ انبالہ شہر میں کسی شاندار مکان کے اندر آدم کی اولاد جوق جوق جمع ہورہی تھی۔ ہر ابن آدم کا چہرہ بشاش تھا۔ آنکھیں شگفتہ تھیں گویا وہ کسی ایسی چیز کے دیکھنے کو آئے تھے جو ان کے دل و دماغ پر شوق و اشتیاق کے عالم میں چھائی ہوئی تھی۔

ایک آدم زاد ان میں ایسا بھی تھا جو مکین سے پہلے مکان کے تماشے میں محو حیرت تھا اور کہتا تھا۔ او مکان! تو مجھ سے قد میں بھی بڑا جسم بھی تیرا بہت چوڑا چکلا۔ مگر زبان بالکل نہیں۔ مجھ کو دیکھ سوا دو گز اونچا ہوں لیکن زبان بارہ ہاتھ کی رکھتا ہوں میرے پاس آنے آدمی مہمان آتے تو خوب جی کھول کر باتیں کرتا۔ اپنی کہتا۔ ان کی سُنتا۔ تیری طرح ساکت و صامت رہکر یہ نہ کہواتا کہ میزبان منہ سے نہیں بولتا۔ شاید اسکو مہمانوں کا آنا ناگوار ہوا ہے۔

آدمی کے اس اعتراض کا مکان نے تو کچھ جواب نہ دیا البتہ خود اس کے دل نے اس سے کہا۔ من عرف اللہ کل لسانہ جو پہچان لیتا ہے اس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے اور کبھی بھید کی بات لب تک نہیں آنے پاتی۔ اس مکان کے جتنے اجزا ہیں سب نے اپنے مقامات فنا سے گزر کر یہ مقام بقا حاصل کیا ہے۔ اب اس کو کیا ضرورت ہے کہ باتونی آدمی کو منہ لگائے۔ وہ آدمی جو دعوے اشرف المخلوقات کے باوجود امتحانات فنائی سے دم چُراتا ہے اور بغیر امتحان دیے بقا کی ڈگری مانگنے پر آمادہ ہے۔

آدمی اپنے دل کی اس گفتگو سے خفا ہوا۔ تیوری چڑھائی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اللہ میاں نے انسان کو سب طاقتیں دیں۔ مگر ایسی کوئی قوت نہ دی جس سے

یہ آستین کا سانپ خیال قابو میں آجاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں وہی بات پیدا ہوا کرے جو مجھ کو اچھی معلوم ہو۔ یہ نہیں کہ میاں خیال رہیں تو میرے دل و دماغ میں اور تعریف کریں دوسروں کی۔ میں ہاتھ سے کماتا ہوں۔ پکاتا ہوں۔ کھاتا ہوں۔ دانت سے چباتا ہوں اور پیٹ سے ہضم کرکے دل اور اس کے تخیلات کو غذا پہنچاتا ہوں پھر اسکو کیا حق ہے کہ کھائے پیئے میرے دسترخوان پر اور مدح سرائی دوسروں کی کرے +

بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ میں اپنی کوئی حسرت پوری کرنا چاہتا ہوں تو یہ خیال دامن پکڑتا ہے۔ اور دوسری طرف لے چلنے کی ضد کرتا ہے، میں عالم تصور میں ایک نقشہ جمانا چاہتا ہوں۔ یہ اس کا رنگ بگاڑ کر دوسرے رخ متوجہ ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسی مشین نہ نکلی جس کے ذریعہ سے دل و دماغ کے باشندے خیالات قبضہ میں آجاتے اور آزاد انسان اس نظر نہ آنے والی ہستی کی قید سے رہائی پا جاتا +

آدمی اتنا ہی سوچنے پایا تھا کہ اس کو صورت سرمدی میں ایک قہقہہ کی آواز آئی۔ ہنسنے والے نے کہا۔ تسخیر تخیل کی مشین مدت سے موجود ہے۔ تو کہاں تھا۔ کس حال میں تھا جو آج تک اس کی خبر نہ ملی۔ ارے نادان۔ اگر تو ایک دروازے کو مضبوط پکڑ لے دربدر مارا مارا نہ پھرے تو تیرا دل اور اس میں رہنے والا خیال بھی ہرجائی پنا چھوڑ دے اس مکان کو نظر غور سے دیکھ جس پر بحث کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ کہ جب اس کے منتشر اجزا۔ اینٹ۔ چونہ۔ شہتیر۔ ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ کثرت کا نام فنا ہو گیا (یعنی اب کوئی اینٹ چونے کا نام علیحدہ نہیں لیتا سب کے مجموعہ کو مکان کے نام سے پکارتے ہیں) تب اسکو یہ درجہ حاصل ہوا کہ اشرف المخلوقات آدمی اس کی دید کو جمع ہوتے +

تو بھی اگر اپنے ارادے و خیال پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حرص و ہوس۔ بغض و نفاق کی ہستی کو آتش عشق سے جلا ڈال۔ اور اپنے جذبات پراگندہ کو ایک بنیاد پر جمع کر کے پھر دیکھ کہ خیالات قابو میں آتے ہیں یا نہیں +

ذرا پھر غور کر۔ اس مکان میں لکڑی ہے۔ اینٹ ہے چونا ہے۔ لوہا ہے لکڑی کو فنائی امتحان کے کتنے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اول ہرا بھرا درخت تھا۔ جنگل میں آزادی وخودمختاری سے ٹھنڈی ہوا کھاتا اور پاؤں کے ذریعہ زمین کا پانی پیتا تھا۔ جب داخلہ امتحان کا وقت آیا۔ کلہاڑی سے کاٹا گیا۔ آری سے چیرا گیا۔ برمے سے برمایا گیا۔ رندے سے چھیلا گیا۔ جب کہیں یہ رتبہ ملا کہ ایک شاندار مکان کا حصہ وار زینت ہے۔ اینٹ کو زمین کا سینہ چاک کر کے کدال اور پھاوڑے مار مار کر مٹی باہر نکالی گئی۔ پانی ملا کر خوب روندی اور مسلی گئی۔ سانچہ میں ڈھال کر اس کی ایک شکل مرتب ہوئی۔ مٹی نے ہر چند کہا کہ سب کچھ منظور۔ مگر میرے ہمجنس ذرات خاک کو باہم جدا نہ کرو۔ ایک ہی جگہ رہنے دو۔ الگ الگ اینٹیں بنائی جائیں گی تو خانہ وحدت کے ذرے جلاوطن اور خانہ ویران ہو جائینگے لیکن اس کی فریاد کسی نے نہ سُنی۔ یہاں تک کہ وہ دھوپ سے تپ تپ کر خشک ہو گئی۔ اس کے بعد بیچاری آگ کے گھر میں بھیجی گئی۔ یا یوں کہئے کہ ناری قبر میں دفن کی گئی۔ لوگ اس آتشی مقام سے گذرتے تھے مگر کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کے اندر کون جل رہا ہے جب اینٹ پر یہ بے کسی۔ کس مپرسی اور سوخت کامل کا وقت گذر گیا تو امتحان کی سند دی گئی۔ خاکی پیراہن کے بدلے سُرخ رنگ کا لباس مرحمت ہوا۔ ٹھیلے پر سوار کر کے شہر میں لائی گئیں۔ حوض میں غسل دیا گیا اور ان سب کو جو امتحان سے پہلے ہم جنس کی فرقت سے پریشان تھیں۔ ہم آغوشی کی گھڑی نصیب ہوئی۔ کنکر زمین کا لختِ جگر کدال کی نوک سے پارہ پارہ ہو کر باہر کھچا۔ آگ میں بھُنا۔ چونہ کہلایا۔ چکی میں پسا۔ پھر کہیں یہ نوبت آئی کہ عرصۂ دراز کی فرقت کے بعد اپنے ہموطن اینٹ سے وصال یابی نصیب ہوئی۔ اسی طرح لوہا بھی جلنے کٹنے پٹنے کی متعدد منازل کے بعد اس قابل ہوا جو اس مکان میں جگہ پائی۔

جب یہ بے جان اشیاء کوفت و سوخت کے بغیر مرکز وحدیت و طمانیت پر نہیں آسکتیں تو پھر اشرف المخلوقات کہلا کر ان امتحانوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے

تو نے سنا بھی۔ کہنے والا کہتا ہے۔ خام بودم۔ پختہ شدم۔ سوختم۔ پہلے کچا تھا۔ پھر پکا۔
اس کے بعد جلکر منزل حاصل کی۔ یہی کیفیت۔ اینٹ۔ چونے۔ لوہے کی ہوئی کہ ابتدا میں
وہ بھی کچے تھے۔ پکنے اور جلنے کے بعد وصال نصیب ہوا۔ جس کی خوشی منانے آج
اتنے آدم زاد جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں میں جو لوگ خامی سے گذر کر پختگی و سوختگی
حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی قبروں پر بھی لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس اجماع کو عرس کے نام
سے پکارتے ہیں۔ عرس کا لفظ عروس سے ہے جس کے معنی شادی و خوشی کے ہیں۔
گویا عرس منزل رسیدہ لوگوں کی اصطلاح میں اس موت کی یادگار ہے۔ جو پختگی و سوختگی
کے بعد مقام وصال و بقا تک لی جاتی ہے +

نتیجہ

آدمی اور اس کے دل کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب تک امتحان فنائی کی تکلیفات
و مصائب کو برداشت نہ کیا جائے یوم الوصال میسر نہیں آتا۔ اور خیالات مرکز
توحید پر جمع نہیں ہوتے +

لہٰذا ہم سب کو بھی اسلامی خدمت کے معاملے میں اس بے جان مگر معصوم ہستی
کی مثال بغرض تقلید پیش نظر رکھنی چاہیئے اور مردانہ وار آگے بڑھ کر دکھانا چاہیئے۔
کہ ابن آدم اینٹ چونے سے گیا گزرا نہیں ہے +

دو آکی شیشی کے باطنی اشارے

آنکھ نے دیکھے کان نے سُنے

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۲ء)

جب ڈاکٹر انصاری نے اپنے کان میں وہ آلہ چڑھایا جس کو کان کی عینک کہنا چاہیئے

اور حسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری ساز وسامان سے باتیں شروع کیں اور ان سے کچھ سُنا۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا۔ اور حسن نظامی کی آنکھ نے سُنا۔

ڈاکٹر نے کہا معدہ و جگر میں ورم ہے۔ پھیپھڑہ اپنے غنیم امراض کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا۔ اسکو سکون کی ضرورت ہے۔ دماغ ترک مشاغل کا خواستگار ہے یہ نسخہ استعمال کرو اور چپ چاپ ہو کر بیٹھو۔

کان کی تشخیص سے ڈاکٹری زبان تقریر کر رہی تھی۔ مگر اس کے جواب میں حسن نظامی کی آنکھ نے دخل نہ دیا۔ وہ برابر اُن اشیاء کو دیکھتی رہی جو میز پر مراقبہ ربانی میں مصروف تھیں۔

قلم آزادی سے دوات کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹری ہاتھ نے اس کو گرفتار کیا۔ اور کہا لکھ۔ اس نے تعمیل کی۔ اور کاغذ پر حرکت کرنے لگا۔ پوچھا گیا کیا لکھتا ہے۔ بولا کچھ خبر نہیں۔ ہاتھ کا تابعدار ہوں جو چاہتا ہے لکھواتا ہے۔ ہاتھ کی آواز آئی۔ نہیں میرا اس میں کچھ دخل نہیں۔ آنکھ کے اشارے سے لکھ رہا ہوں۔ آنکھ نے بگڑ کر کہا۔ کان نے مرض کی شناخت کی ہے وہی لکھواتا ہوگا۔ کان نے کہا نہیں جناب مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ یہ تو کسی اور طاقت کا کام ہے۔

حسن نظامی اس انکاریہ بحث کو سُن رہا تھا کہ نسخہ تیار ہو گیا۔ کاغذی پُرزا تھا دوا فروش نے پڑھکر دو شیشیاں دیدیں جنپر ولایتی لاکھ کی سُرخ مہر لگی ہوئی تھی۔

جب یہ شیشیاں گھر میں آئیں کاغذی خرقے سے برہنہ ہوئیں۔ واحدی صاحب نے بستر بیمار کے قریب لا کر رکھا۔ چاقو منگایا۔ تاکہ بھید کی مہر شیشی کے منہ سے تراشیں تو ایک صدائے سرمدی آنکھ میں آئی۔ پہلے مجھ کو دیکھو اور میری سنو۔

کانچ کی معمولی شیشی ہوں۔ دیکھنے میں چھوٹا سا ظرف رکھتی ہوں مگر انسان

اشرف المخلوقات سے زیادہ صاحب تحمل برداشت ہوں۔ اگر آدمی وہ سب دوا ایک ہی دفعہ پی جائے جو میرے اندر ہے تو مر جائے۔ مگر میں خود زندہ ہوں اور دوسروں کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے +

یہ تمہارے منہ پر مہر کیسی ہے ؟

ہائیں تم نہیں جانتے۔ باطنی تاثیر کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ سر بمہر ہو۔ درویش کے منہ پر سکوت کی مہر اسی غرض سے لگائی جاتی ہے کہ وہ امراض روحانی کی دوا ہے۔ منہ کھلی شیشی کی دوا قابل اعتبار نہیں +

اچھا تو کاغذی لباس تمکو کیوں پہنایا گیا تھا +

اس کا جواب بھی سن لو۔ الناس باللباس۔ آدمیت کی پہچان لباس سے ہوتی ہے تو میں دائرہ شائستگی سے کس طرح باہر رہتی۔ خرقہ کمتوبی پہنکر نمودار ہوئی تب معلوم ہوا کہ میں کس مرض کی دوا ہوں +

کیوں بی شیشی! تمہاری شکل تو گوری ہے۔ اگر تم کالی ہوتیں تو دوا کی تاثیر میں کچھ فرق پڑجاتا یا نہیں ؟ +

واہ کیا مجکو یورپین خیال کر لیا۔ گو میری نمود یورپ میں ہوئی لیکن اصل نسل مسلمان اور اس پر صوفیانہ عقائد رکھنے والی۔ میرے ہاں گورے کالے کی بحث گناہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ باطن صاف ہونا چاہئے۔ رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر میرا تن سیاہ ہوتا تو دوا کی تاثیر کو کیا نقصان پہونچتا۔ اصلیت ہم دونوں کی کانچ ہوتی ہے۔ دوا دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ پھر سیاہ سفید کی بحث سے کیا حاصل +

درویش کی مہر سکوت ٹوٹ جائے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ تمہاری لاکھی مہر دور ہوجائے تو بیکار ہوجاتی ہو یا نہیں ؟

میری مہر سکوت کھلتی ہے تو دوسرے کے فائدہ کے لیے کھلتی ہے۔ ایسا ہی

درویش اگر دوسرے کی فائدہ رسانی کی خاطر سکوت کی مہر توڑ ڈالے تو ہرج نہیں بلکہ مہر لگنی اسی واسطے ہے کہ کسی کے فائدے کے لیے ٹوٹے۔ میرے منہ پہ مہر نہ ہو تو کوڑی کے کام کی نہیں۔ کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ مثلاً اگر کسی حادثہ سے میرا منہ کھل جائے تو دوا فروش مجھکو پھینک دیتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اب بازار میں اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اندیشہ ہے کہ بیرونی زہریلا اثر اس میں نہ ہو گیا ہو۔ جو بیمار کو نقصان پہونچائے اسی پر درویش کو قیاس کرنا چاہیئے کہ جب اس کا منہ نفسانی و دنیاوی خواہشات کے لیے کھل جاتا ہے۔ تو روحانی اسپتال میں وہ پھینکنے کے قابل ہو جاتا ہے ؞

واحدی کو دیکھو۔ ابھی باتیں ختم نہ ہوتے پائی تھیں کہ انہوں نے شیشی کا منہ کھولکر چمچہ میں دوا نکال لی۔ اور اس زبان و حلق کو تلخ کر دیا۔ جس کے پڑوسی آنکھ کان شیشی کے باطنی اشاروں کا مزیدار لطف اٹھا رہے تھے ؞

برف

(از نظام المشایخ اگست ۱۹۱۲ء)

یہ تشنگی آلود ایام کیسی بہار کے ہیں جو لوگ حبس دم کے بھید سے واقف نہیں۔ قدرت ان پر معنوی حبس طاری کرتی ہے۔ اس کے بعد ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھیجکر دیکھتی ہے کہ آزادی حبس سے ان کی زبان پر شکر الٰہی جاری ہوا یا نہیں۔ مگر یہ غافل ہستیاں شکریہ ادا کرنے کے بجائے اور غفلت کی طرف جھکتی ہیں۔ یوں تو ہر موسم شان یزدانی کا ایک کرشمہ ہوتا ہے۔ مگر گرمی ملک ہندوستان میں ایک بے بہا نعمت ہے جہاں

ہمیشہ سردی رہتی ہے یا گرمی تیز نہیں ہوتی۔ وہاں کے باشندے اس لطف سے ناآشنا ہیں کہ لو کی گرم بازاری ہے۔ پسینے بہ رہے ہیں۔ یکایک کسی گھنے درخت کے سایہ میں پہونچے اور خنک ہوا بدن کو لگی۔ بس اس وقت جو کیفیت جسم و روح دیکھتی ہے وہ زبان یا قلم سے اَدا ہونی محال ہے۔ اللہ میاں نے ہر چیز حکمت سے پیدا کی ہے موسم گرما میں بھی ہزاروں اسرار ہیں۔ جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ ان چیزوں کی حقیقت پر غور کرکے ذات باری کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ربنا ما خلقت هٰذا باطلا +

اور تو اور ذرا گرمی کے تحفے برف کا خیال کرو کیا صاف۔ شفاف۔ پیاری صورت والی چیز ہے۔ مگر آپ تو اس کو پی جانا جانتے ہیں۔ کبھی اس کے گھلنے والے وجود کے رموز پر غور نہیں کرتے۔ آیئے آج دو گھڑی اس میں جی بہلائیں +

برف کیا چیز ہے؟

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آسمانی دوسری مصنوعی۔ آسمانی برف اونچے مقامات پر از خود نازل ہوتی ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ وہ ابخرے جو سمندر و زمین سے اُٹھ کر اوپر جاتے ہیں اور مینہ کی صورت بنکر دوبارہ زمین پر برستے ہیں وہی ابخرے شان الٰہی سے پہاڑوں پر برف کی شکل اختیار کرکے گرتے ہیں اور جم جاتے ہیں +

نئے زمانے والوں نے قدرتی برف پر غور کرتے کرتے بناوٹی برف کا بھید معلوم کر لیا۔ مشین کے ذریعہ سے معمولی پانی کے وہ اجزا نکال لیے جاتے ہیں جن کے سبب پانی میں نرمی اور پتلا پن ہے۔ ان اجزا کے نکلتے ہی پانی سخت اور پتھر ہو کر ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں ہر شخص ان پر جان دیتا ہے +

برف میں صوفیانہ نکات

اس مختصر بیان کے بعد جس سے برف کی ظاہری حقیقت معلوم ہوتی اس کا

باطنی کیفیت پر توجہ کیجئے ۔

جب تک پانی کے اندر نفسانی و کثیف اجزاء شامل تھے اس کے جسم کو قرار و یکسوئی میسر نہ تھی۔ بہتا تھا۔ ہلتا تھا۔ ذرا سی گندگی سے میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا۔ جو رنگ اس میں ڈالا جاتا فوراً اس کا اثر قبول کر کے وہی رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن مجاہدہ مشین نے اس کے تفرقہ انداز اجزاء کو فنا کر کے ایسا یکا متحد کر دیا کہ جس رخ سے دیکھئے ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اوپر بھی پانی۔ نیچے بھی پانی۔ اندر بھی پانی۔ باہر بھی پانی اور سب خنک و سرد۔ اس کو کہتے ہیں وحدت کاملہ۔ اب اس پر گندگی ڈالئے تو پھسل کر بہ جائے گی۔ رنگ ڈالئے تو وہ بھی اوپر اوپر اتر جائے گا ۔

صوفی بھی جب برف کی طرح اپنے باطن کو مجتمع کر لیتا ہے۔ تو پھر وہ خواہ کیسے ہی بدنما مقام میں جائے۔ اس پر کسی برائی کا اثر نہیں ہو سکتا ۔

اور یہ بھی سن لیجئے کہ برف میں ایسی خنکی کہاں سے آگئی۔ کہ انسان اسکو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ حالانکہ جب تک وہ پانی کی شکل میں تھی۔ ہر شخص آسانی سے اس میں ہاتھ پاؤں ڈال سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نفسانی کثافت دور ہو جاتی ہے تو قدرت ایک ایسا جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ پھر ہر کس و ناکس اس پر آسانی سے قبضہ نہیں پا سکتا ۔

رہی یہ بات کہ پھر انسان اسکو کاٹ کر اور گھل کر شربت میں ملا کر کیوں پی جاتے ہیں۔ اس کا جواب صاف یہ ہے کہ جس طرح صوفی دوسروں کی فائدہ رسانی اور تسکین کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح برف بھی پیاسوں اور تشنہ کاموں کو تسلی دیتی ہے اور طرہ یہ کہ اپنی ہستی قربان کر کے تسلی دیتی ہے ۔

ہائے غفلت شعار آدمی شیشے کے گلاس میں برف کا ٹکڑا ڈال کر گھونٹ لے رہا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ پارۂ برف تیری خاطر اپنی چمک دار ہستی مٹا رہا ہے

گھلا جاتا ہے اور پانی کو سرد کام کر رہا ہے۔ مگر ابن آدم اس ذات ترحم صفات کا شکرانہ نہیں بھیجتا۔ جس نے کائنات کے بے شمار جلوے اس کے لئے پیدا کیے اول اول تو پروردگار ڈھیل دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شاید یہ بندہ مجھ کو یاد کرے۔ مگر جب وہ بے خبری سے باز نہیں آتا۔ تو پھر وہ تماشہ دکھاتا ہے۔ جو ابھی حال میں پیش آیا۔

کرٹانانک نامی جہاز اہل مغرب نے بنایا۔ اور سمجھا کہ اب اس سے بڑا کوئی جہاز دُنیا میں نہیں ہے۔ اس میں ہوائی کرے بنائے تاکہ وہ پانی کے طوفان سے محفوظ رہے اور ڈوبنے نہ پائے۔ لیکن قدرت نے خیال کیا کہ یہ سرکش آدمی یوں نہیں مانیں گے۔ اس واسطے اس نے اُس جہاز کو برباد کرنے کے لیے برف کا ایک ٹکڑا بھیجا۔ جس نے دُنیا کے سب سے بڑے جہاز کو ایک ہلکی سی ٹکر مار کر ٹکڑے کر دیا۔

اب انسانوں کی آنکھ کھلی کہ جس برف کو سوڈے کے پانی میں گھول کر پی جاتے تھے۔ جس برف کو موگری سے کچل ڈالتے تھے۔ اس برف کے ٹکڑے نے سیکڑوں قیمتی جانوں کو سمندر کے کھاری سوڈے میں ملا کر نوش جان کر لیا۔

جلال وجبروت والے کی ثنا

برف کی یہ گرم کہانی سُن کر ان لوگوں کا فرض ہے جو جنگل میں درختوں کے پتوں پر معرفت الٰہی کے دفتر لکھے دیکھتے ہیں کہ اپنے جلال وجبروت والے خدا کی حمد وثنا کریں۔ اے رب العزت۔ اے رب الحکمت۔ اے رب الاسرار۔ جان تجھ پر صدقے۔ دل تجھ پر واری۔

برف سے گرنے والے ٹھنڈے قطروں کی قسم۔ ہم ان پر تیرے فیضان کی بہار دیکھتے ہیں۔ یہ قطرے زبان کی پیاس کو بجھاتے ہیں۔ ایسا قطرہ عنایت فرما جو دل کی تشنگی کو سیراب کرے۔

برف ہوا سے بچائی جائے۔ گرم کمبل میں چھپائی جائے تو جلدی نہیں گھلتی ہمکو اپنی گلیم معرفت کے دامن میں ڈھک لے۔ تاکہ حوادث ایام کی ہوا ہماری روحانی ہستی کو برباد نہ کرنے پائے۔ الٰہی برف کے عذاب سے بچا۔ اور اس کو ہمارے جسم و روح کے لیے عذب شیریں کا کام بنا۔

از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۲ء

میاں سنتے ہو؟ دہلی میں گورنمنٹ ہاؤس بنتا ہے۔ دن رات کام ہو رہا ہے آنکھیں جاگتی ہیں اور جگائی جاتی ہیں۔ تم بھی اپنا دل ہاؤس بناؤ۔ ویرانے کو آباد کرو گورنمنٹ ہاؤس کا راتوں رات بننا ایک غیر معمولی جلدی کا سبب ہے ورنہ ظاہری عمارات کے بنوانے والے صرف دن کو کام لیا کرتے ہیں۔ لیکن دل ہاؤس ایک ایسی عمارت ہے کہ یہ رات کے اندھیرے ہی میں چنی جاتی ہے۔ جس وقت سارا سنسار سوتا ہے۔ اس وقت پروردگار اور اس کے وہ بندے جو دل ہاؤس کی تعمیر کے طلبگار ہیں۔ جاگتے ہیں۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں بجلی کی روشنی ہے۔ غل ہے۔ شور ہے۔ مگر دل ہاؤس کی تعمیر کے واسطے تاریکی اور سکوت کی ضرورت ہے۔ جب گورنمنٹ ہاؤس بنجائیگا اس کے دروازوں پر پہرے دار ہوں گے کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے۔ لیکن دل ہاؤس ایک ایسا وسیع مکان ہے۔ جس میں کائنات کے تمام جلوے بے روک ٹوک آسکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں اگر قبریں کھدواکر پھینکدی جائیں مندروں اور مسجدوں کی مسماری ہو۔ وہ تاریخی مقامات جن سے دہلی کا چپہ چپہ معمور ہے

بے نام ونشان ہوجائیں۔ تب بھی تم اس کی تقلید میں کسی کی دل آزاری نہ کرنا کیونکہ دل ہاؤس کی تعمیر دلداری و دلجوئی کی بنیاد سے شروع ہوتی ہے یہ ہاتھ سے گئی تو مکان بنانا دشوار ہو جائے گا۔ اول تو گورنمنٹ ہاؤس کے بنوانے والے بھی ایسے ستم شعار نہیں ہیں۔ جو خواہ مخواہ کسی کے دل دکھائیں اور مذہبی یادگاروں کو مٹا کر اپنا گورنمنٹ ہاؤس بنائیں اور اگر بفرض محال کوئی ایسی جگہ آبھی جائے تو کافی معاوضہ دیدیا جائے گا۔ لیکن تمہارے گھر کے دل کی بنیاد اف نہ اسی دل شکنی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ یہاں معاوضہ سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ ہاؤس کے رہنے والے زمین اور اہل زمین کے جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دل ہاؤس کی جہانداری اس سے وسیع ہے۔ اس کا حکم جسم و روح دونوں پر چلتا ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے اہل کار اور شہریار بھی دل ہاؤس کے تابع و فرمان ہیں۔

دل ہاؤس دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک دیسی اور ایک بدیسی۔ دل بے چارہ ایشیا میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہتا ہے۔ علی الخصوص مسلمانوں کے سینہ میں رہتا ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں اس کی خوب خاطر داریاں ہوتی ہیں اور اس کے جذبات کی بہت بڑی قدر کی جاتی ہے۔ یہی دل گو یورپ والوں کے سینے میں بھی رہتا ہے۔ مگر وہاں یہ اپنے گھر کے کام دھندے میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ دوسرے دل سے سروکار نہیں رکھتا۔ اسی واسطے ایشیا والے کہتے ہیں کہ یورپ کا دل خود غرض اور بکار خودی مصروف ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کوئی خود غرض ہو یا نہ ہو۔ ہم تو اس کو دیکھتے ہیں کہ دل میں اپنے پیدا کرنے والے کی بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ اگر ایشیا والوں میں یہ بات یورپ

سے زیادہ ہے تو ہمیشہ انہی کا بول بالا ہوگا۔ اور اگر اہل یورپ کے دل واقعی اس نعمت سے محروم ہیں تو ان کے علاقے اجڑ جانے کے قابل ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ دیسی کے بعد بدیسی ہاؤس کو دیکھئے۔ خبر نہیں لوگوں نے دیسی بدیسی کا کیا جھگڑا لگایا ہے۔ ہاؤس کے معنی انگریزی زبان میں گھر کے ہیں۔ خانہ دل نہ کہا۔ بیت القلب نہ پکارا۔ دل ہاؤس کہہ دیا۔ مفہوم و مقصود و حقیقت تینوں کی ایک ہی ہے۔ فرق صرف زبان اور بولی کا ہے ؛

ایک زمانہ تھا کہ دہلی کو دل لی کہتے تھے۔ یعنی دل لینے والی بستی۔ اب وہ وقت کہاں۔ نہ دل ہی رہا۔ اور نہ دل لینے والی ہی رہی۔ وہ اجڑ گیا۔ یہ مٹ گئی وہ برباد ہوگیا یہ تباہ ہوگئی۔ شکر ہے کہ انگریزی سرکار نے جھاڑو ہاتھ میں لیکر اس کی صفائی شروع کی ہے۔ شاید کورٹ کرکٹ دور ہونے سے اس کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن ابھی تک تو دل لی کا نام اسپر صادق آنے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا ؛

خدا بخشے میری بیماری کو جس کے طفیل ڈلہوزی پہاڑ پر جانا ہوا تھا ایک انگریزی داں نے کہا۔ ہوزا اور ہاؤس ایک ہی چیز ہے جس کے معنے گھر کے ہیں گویا یہ پہاڑ دل ہاؤس یا بیت القلب تھا۔ کانوں کو یہ نام بہت بھلا معلوم ہوا۔ اور اس لفظ میں اسرار حقیقت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ جب اس پہاڑ کی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ بہشت جس کی مومن اور نیکوکار لوگوں کے نام رجسٹری نہیں ہوئی۔ اس میں ہندو مسلمان نیک و بد اوسنے اعلیٰ بغیر روک ٹوک کے آسکتے ہیں۔ امتحان صرف اتنا ہوتا ہے کہ بادن میل کے پل صراط سے گزرنے کے بعد یہ بہشت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا نام رحمت خداوندی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کافر و سرکش بندے قیامت کے بعد

ابد اللباد دوزخ میں رہیں تو دنیا میں بھی ان پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا اور ہوٹلوں کے باراحت عیش سے محروم کردے۔

کیسی بہار ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ خبر نہیں کتنی مدت سے اپنے پروردگار کے سامنے پاؤں باندھے کھڑے ہیں۔ آنسوؤں کے چشمے سے وضو کرتے۔ اور حضوری قلب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ خدا نے بھی ان کے دل کو آباد کیا ہے جدھر دیکھو ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ پرندے ٹہنیوں پر میٹھے نغمہ سنجیاں کر رہے ہیں۔

آدمی بھی جب کوہ وقاری سے یکسو ہو کر خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی یہ خنکی۔ یہ سرسبزی۔ یہ شادابی پیدا ہو جاتی ہے جس کو انگریزی اصطلاح میں دل ہاؤس کی آرائش کہنا چاہیئے۔

اور وہاں اس پر بھی توجہ کی ؟ پہاڑوں میں انسان کو نشیب و فراز کے رستوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ جب بلندی پر چڑھتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔ ہانپتا ہے۔ لڑکھڑاتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ اب کتنا راستہ باقی رہ گیا۔ اور جس وقت بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے۔ اس وقت بھی یہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ کہیں زور و تیزی رفتار میں آس پاس کے کسی کھڈ یا غار میں نہ گر پڑوں۔

ڈاکٹروں کی رائے میں پہاڑوں پر ترقی صحت کا یہی راز ہے۔ جو لوگ نشیب و فراز کی مشکلات میں شریک نہیں ہوتے۔ گھر میں آرام سے بیٹھے رہتے۔ یا سواری پر چلتے پھرتے ہیں ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اسی طرح دل ہاؤس کے معماروں کا خیال ہے کہ نفی اثبات کے نشیب و فراز میں چڑھنا اترنا صحت باطن کے لیے لازمی ہے۔ اس کی تکلیفات کا خیال کر کے جو لوگ گھبراتے ہیں ہمیشہ قلبی امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

چڑھو لا الٰہ کی بلندی پر اور اُترو الا اللہ کی وادی میں۔ دل ہاؤس کی تعمیر کے لیے موسم رمضان خوب زمانہ ہے۔ جذبات یکسو۔ ارادے پاکیزہ۔ نفسانیت کی سرد بازاریاں ان دنوں میں تم بھی اپنا دل ہاؤس بنالو۔ پھر خبر نہیں کل کیا پیش آنے والا ہے۔
دل ہاؤس کا فرنیچر روزہ نماز اور ذکر الٰہی ہے گورنمنٹ ہاؤس کے لیے میز کرسی چاہیئے۔ دل ہاؤس کے لئے ایک سجدہ یا اخلاص اور حمد کا ایک سچا جملہ درکار ہے روزے سب رکھتے ہیں مگر جسم کی زبان بھوکی پیاسی رہتی ہے اور نفس کی زبان کھانے پینے سے باز نہیں آتی۔ ایسا روزہ کس کام کا۔ دل ہاؤس کی آرایش چاہتے ہو تو ہوا و ہوس کی زبان بند کرو۔ اس کو روزہ رکھواؤ۔ مسجدیں خوب آباد ہیں نمازیوں کی صفیں بھی بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ کی جگہ کوہ ہمالیہ کی صفوں کی مثل ہوتی ہیں لیکن ان میں اکثر لوگ میز۔ کرسی۔ کالر۔ ٹائی۔ بوٹ۔ سوٹ۔ چھری کانٹا۔ نوکری و خدمتگاری۔ غلامی و اطاعت شعاری۔ ممبری اور مجسٹریٹی۔ خان بہادری اور شمس العلمائی کے نشہ میں چور ہو کر اس وعید کے مستحق ہوتے ہیں۔ جو لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کے پردہ میں مخفی ہے۔ پروردگار نہیں چاہتا کہ اُس کے بندے غیریت کے نشہ سے مخمور ہو کر حضوری میں آئیں اس واسطے ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ یعنی میرے سامنے نہ آؤ جب کہ تم نشے میں مدہوش ہو۔ سرکش انسان نے سمجھ لیا کہ نشہ نماز سے چھٹکارے کا نام ہے۔ کیونکہ خدا کہتا ہے کہ مخموری میں نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ کاش وہ ارشاد ربانی کے ناز محبوبیت تک رسائی پا سکتے۔ اور معلوم کرتے کہ نماز محبوب کی نزدیکی کا نام ہے۔ غیریت کا نشہ پئیں گے تو ہجر و فراق میں پھینک دیے جائیں گے۔ پس اگر دل ہاؤس کی بنا کو مستحکم کرنا اور اُس کی آرایش و زیبایش کو مکمل دیکھنا چاہتے ہو تو رمضان شریف میں ایسی ترشی سے روزہ افطار کرو جو غیریت کے تمام نشے اُتار دے اور تمہارے

دل کو خدا کا گھر بنا دے۔ ورنہ جناب اکبر الہ آبادی کا یہ شعر تم پر صادق آئے گا +

خدا کا گھر نہ رکھا اول کو بنگلوں میں مکیں ہو کر
بھلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہو کر

(از نظام المشائخ اکتوبر ۱۹۱۲ء)
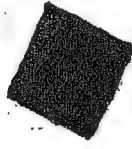
معدوم و نابود چیز کو صفر کہتے ہیں۔ نقطہ بھی اسی شکل کا نام ہے۔ حساب دان اقلیدس و ہندسی رموز دانوں کی خبر نہیں کہ وہ اس محیط بے سر و پا ہستی کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فقیر کو علم و فضل کی باتیں یاد نہیں۔ اس کو تو یہ بے تعلق و تعلق دار نکات سے لبریز نظر آتا ہے +

کسی نے حرف بے سے کہا۔ تجھ میں اور تے ثے میں کیا فرق ہے؟ صورت تینوں کی یکساں ہے۔ تفاوت فقط اس کا ہے کہ بے کے نیچے ایک نقطہ اور تے کے اوپر دو نقطے۔ ثے پر تین نقطے بے نے جواب دیا۔ یہی سوال میں نے الف سے کیا تھا کہ جب تو اکیلا تھا تو تیرا مطلب بھی ایک نکلتا تھا۔ لیکن جس وقت تیرے پہلو میں ایک نقطہ بڑھایا گیا تو معانی دس گنے ہو گئے۔ دوسرا نقطہ اور زیادہ کیا تو ایک سے سو ہو گئے تیسرا بڑھا تو ہزار بن گئے۔ یہ کیا بھید ہے +

الف نے جواب دیا۔ خاموش۔ کائنات کی پیدایش کا راز اسی کے اندر مضمر ہے الٰہی گورنمنٹ نے لارڈ کرزن کی سرکار سے پہلے اس راز کو قانون رازداری کی مہر سے مخفی کر دیا ہے۔ زبان سے افشار کا ایک حرف بھی نکلا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے +

حروف کی باتیں سنکر حسن نظامی نے کہا۔ میں نے لارڈ کرزن کے قانون

رازداری کو ہمیشہ بام سے نیچے گرتے دیکھا اس کی تشبیہ یزدانی قانون سے ناجائز ہے مادہ پرست آدمیوں کے قوانین دو چار دن کے مہمان ہیں۔ اقبال کی آنکھ دیکھتی ہے مگر وہ لب پر نہیں لا سکتے۔ میری آنکھ دیکھتی ہے زبان بولتی ہے اور ہاتھ حرکت کرنے کو تیار ہے ؛

سنو میں تم سے کہوں۔ یہ صفر جسکو عنوان میں دیکھا۔ ایک ہولناک انقلاب کا علم دار ہے۔ بسم اللہ اس کتاب کی ابتدا ہے اور حروف والفاظ کی سب کتابوں سے افضل ہے۔ لیکن اس بسم اللہ کی بھی ایک ابتدا ہے اور وہ بے کا نقطہ ہے۔ اس نقطہ کی تشریح آج کے دن مقصود ہے جس دن تم اسکو پڑھو گے عید الفطر کو سات آٹھ دن گذر چکے ہوں گے۔ خوشی کمال زوال میں ہوگا۔ لہٰذا اس مشکل اور باریک مضمون کو ذرا غور سے پڑھنا ؛

اللہ ہمارا معبود اس کے لفظ میں کوئی نقطہ نہیں۔ محمدؐ ہمارے رسول۔ اس مبارک نام میں بھی نقطہ معدوم۔ آخری نجات اور عروج جس ذات پر منحصر ہے وہ امام ہے وہ بھی بے نقطہ ؛

دل کہتا ہے تم میرے مقصود کے مفہوم تک اتنے کم لفظوں میں نہیں پہونچ سکتے کہو گے کیا۔ لکھا ہم نہیں سمجھے۔ دماغ میں کچھ خرابی تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف سب سے آسان کتاب ہے مگر اس کے شروع میں الف لام میم کو عام فہم کیوں نہ ہونے دیا۔ پس انسان کی طاقت اتنی ہی ہے کہ دور سے اشارہ کردے یہ تو ہوا خاص فہم حصہ ؛ اب عام دلچسپی کی باتیں سنئے۔

بے کار ہم و باکار ہم چوں بحساب اندر

حساب کی رقموں میں میاں صفر کی ہستی بیکار بھی ہے اور باکار بھی۔ تاہم یہ مسلّم ہے کہ اصل رقم سے اس کے وجود کو کچھ سروکار نہیں۔ ایک دن ایک مرید نے حسن نظامی

کے ہاتھ پاؤں کو چوما۔ اور سمجھا کہ میں نے حسن نظامی کے متبرک جسم سے برکت حاصل کر لی۔ لیکن جسم میں برکت کہاں وہ تو حساب کی رقموں کا مد ہے۔ ذات اور روح کے لین دین کا حساب کتاب ہے۔ اور جسم کمبخت کی مفت میں کھینچا تانی کی جاتی ہے ہمیشہ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہوں کہ وہ دماغ کے کہنے سے کاغذ پر کچھ لکھا کرتا ہے دنیا کی غفلت ہاتھ و دماغ کے عمل کو کتاب و اخبار میں پڑھ کر حسن نظامی کو اس کا ذمہ دار تصور کر لیتی ہے۔ اور یہ نہیں جانتی کہ مد کو حساب کتاب سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ صفر اور نقطہ کا بھی یہی عالم ہے۔ کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں۔

قربان اس دائرہ حقیقت کے۔ کیا کیا تماشے پردہ کائنات پر برپا کیے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق آفتاب اور ادنےٰ سے ادنےٰ ہستی ذرے کو دیکھئے۔ یہ بھی حساب کے مد اور صفر و نقطے کی طرح بے کار بھی ہیں اور باکار بھی۔ آفتاب گرم ذرات کا مجموعہ زمین کے سب کارخانوں میں دخیل ہے۔ اس لیے باکار ہے لیکن رات کو جب یہ غروب ہو جاتا ہے تو دنیا کے کارخانے بند نہیں ہو جاتے اس واسطے بیکار ہے ذرہ عالم مرکب کا انتہائی اور آخری نقطہ ہے۔ اس کی جنبش نہ ہو تو ساری کائنات بے کار ہے۔ لہٰذا اس کا وجود باکار۔ مگر ایک ذرے کا ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں پھر اس کے ناکارہ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اسی پر نقطہ اور صفر کو قیاس کرو عنوان میں اس کی صورت دیکھ کر کوئی مطلب سمجھ میں نہ آئے گا اور بے کار چیز معلوم ہوگی۔ لیکن جس وقت جسمی تعلقات کو یکسو کر کے اس کے حقایق و معارف پر غور کروگے تو یہی فانی سی چیز محیط الکل نظر آئے گی۔

نظام المشائخ کے مضامین اور حلقہ کی تمام تحریروں کے شروع میں ۷۸۶ کے نیچے دو لکیریں کھینچی جاتی ہیں۔ خیال ہوتا ہوگا کہ یہ ایک بے کار فعل ہے۔ پر جو اس کے بھید سے واقف ہیں وہ ان کو بیکار اور نکمی لکیروں سے زیادہ کارگر پاتے ہیں۔ جس تحریر پر یہ

نشان ہوگا۔ خدا نے چاہا تو وہ کبھی بے اثر نہ رہے گی۔ یہ دو لکیریں نہیں ہیں تاثیر تحریر کے قوتوں کے لیے ایک قوت دار معجون ہے*

نقطہ اور صفر بھی ان ربانی اسرار و مفاد سے لبریز ہے۔ اگر تم اس کی روحانی اور فلسفیانہ باریکیوں پر غور نہیں کر سکتے تو ایک کاغذ پر نقطہ کی گول شکل بناؤ اور تنہائی میں اس پر نگاہ جماؤ۔ اور اپنے خیالات کو نقطے کے چاروں طرف پھیلا دو پھر دیکھو کیا لطف اور مزہ آتا ہے۔ بشرطیکہ چند روز تک اس کی مسلسل مشق کرتے رہو*

اس مضمون کی سرخی پر نظر جماؤ۔ اور سوچو۔ یہی سب کا مرکز اور محیط ہے۔ ہر دکھ۔ غم اس کے اندر فنا ہو رہا ہے۔ اٹلی کی فوجیں۔ روس کے لشکر اس غار جہنم میں گر رہے ہیں۔ اب اس کو گردش ہوگی تو گرد و پیش کے تمام مستحکم قصر متحرک ہونگے اوہام۔ خوف۔ رعب کو شکست ہوگی*

موسیٰ نے درخت اور پہاڑ کی آڑ میں دیدار دیکھا تھا مسلم دیدار دیکھنا چاہتا ہے تو نقطہ اور صفر کو سامنے لائے۔ جو کرہ خاک کی خیالی پیکر ہے جو قلب جسمانی کی تصویر ہے۔ جو ازل و ابد کے درمیان بے تار کا محکمہ پیام رسانی ہے*

بندوق کی گولی نقطہ اور صفر کی شکل سے مشابہ ہے مگر گولی پیام مرگ ہے۔ اور نقطہ و صفر رشتہ زندگانی۔ زندگی کو پر لطف بناؤ۔ اور اس مجذوبانہ بڑ کو سمجھو*

آنکھ کی پتلی۔ خال رخ یار۔ اور ان تمام صورتوں کی قسم جو نقطہ و صفر کی ہمشکل یا قریب الشکل ہیں۔ نقطے کے وجود میں نکات کا خاموش دریا موج میں آنا چاہتا ہے۔ جب یہ لہر آئے گی تو میں تم کو عید کی مبارک باد دونگا*

یا

عرفان کی لکیر
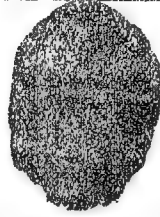
از نظام المشائخ دسمبر ۱۹۱۲ء

یا عباد اللہ الصلحین آج کل دنیا کہتی ہے میں پریشان ہوں۔ آشفتہ خاطر ہوں۔ زندگی سے بیزار ہوں۔ میرا چین آرام جاتا رہا۔ مصائب و آلام نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ کیونکہ جدھر نگاہ جاتی ہے خود غرضی۔ حرص ہوس کا دور نظر آتا ہے۔ اخلاق و مروت کا نام نہیں۔ رحم و انصاف مفقود ہو گئے۔ ایک قوم دوسری قوم کو ایک ملک دوسرے ملک کو۔ ایک شہر دوسرے شہر کو ایک کنبہ دوسرے کنبہ کو۔ یہاں تک کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔ سب آپس میں ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں۔ طاقتور کا خیال ہے کہ کمزور کو اس زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں اسے مٹا دو۔ فنا کر دو۔ ناتوان چاہتا ہے اوروں کی توانائی بھی جاتی رہے۔ سارا عالم یکساں ہو جائے۔ فقیر نے سوچا۔ کیا یہ شکایت ٹھیک ہے۔ دل نے جواب دیا "کچھ صحیح اور کچھ غلط" اللہ تعالیٰ نے انسان اور اس جہان کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ پہلے اپنی ہستی پر غور کرے اور وجہ پیدائش کو پہچانے مگر بھول چوک کا پتلا آدم زاد دوسروں کو دیکھنے لگا۔ ان کے نیک و بد میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنی ذات کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا آپ نے نہیں سنا یورپ کی طاقتیں

ایران و مراکو۔ طرابلس و ترکی پر حملہ آور ہوئی ہیں کہ ان ملکوں کی تہذیب کو بزور تلوار
درست کریں۔ مگر خود اپنی ذاتی اصلاح و اندرونی خرابیوں کی درستی کی طرف سے
ان کی آنکھیں بند ہیں اور یہی وجہ تکلیفات و صعوبات کے بڑھنے کی ہے۔ اگر ہر
آدمی پہلے اپنی ذاتی اصلاح و بہبودی کی طرف متوجہ ہو تو خدا کی بنائی ہوئی زمین
فتنہ و فساد اور غم و آلام سے چھٹکارا پا جائے۔ انسان خدا کی حکمتوں کا ایک خزانہ ہے
کون انسان؟ وہ جو کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ کالر نکٹائی لگاتا ہے۔ پاؤں کو بوٹ
سے آراستہ کرتا ہے۔ اور چرٹ منہ میں دبا کر نیم فرعونی شان سے اکڑتا ہوا چلتا ہے
اور وہ جو ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ بوسیدہ میلا کرتہ پہنا منڈے ہوئے سر پر
ڈھائی گز کا دوپٹہ لپیٹ لیتا ہے اور وہ جس کی ٹانگیں گھٹنوں تک دھوتی سے برہنہ
نظر آتی ہیں۔ اور ہاتھ کے بنائے ہوئے معبودوں کے آگے سر جھکاتا ہے یہ سب
زمین پر حرکت کرنے والی مورتیں خزانہ الٰہی کی تھیلیاں ہیں۔ ان سب کے اندر
دولت لازوال بھری ہوئی ہے۔ لیکن غافل ہستیاں اس کی قدر نہیں کرتیں
اور نفسانی و شیطانی خواہشوں پر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو برباد کر رہی ہیں۔
ان بادشاہوں سے پوچھو۔ جب تم لاکھ آدمیوں کا لشکر لیکر اپنے دشمن پر
حملہ کرتے ہو۔ اور بے شمار جانوں کو نقصان کر کے صرف اپنی ناموری کماتے
ہو تو وہ ناموری تمہارے کس کام آتی ہے۔ جاڑے کا گرم لحاف اچھا۔ یا تمہاری
یہ ناموری۔ اگر سردی کے وقت لحاف اور کمبل میسر نہ آئے تو یہ ناموری تمہارے جسم کو
سردی سے بچا سکتی ہے؟ مگر بادشاہوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ختم اللہ
علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ۔ وہ اس کا جواب
نہیں دے سکتے۔ ان کے خیال میں زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک انسان اپنی
ذاتی عزت و شان کے لیئے لاکھوں انسانوں کو قربان کر دے اور ان قیمتی وجودوں

کو موت کے گھاٹ اتار دے جن کو برسوں کی مشقت کے بعد امتا بھری گود نے پال پوسا تھا۔

دایاں ہاتھ ان خیالات کو قلمبند کر رہا تھا کہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے کچھ اشارہ کیا۔ اس نے کہا مجھ میں کیا لکھا ہے؟ اس کو پڑھو۔ میں ربانی دستاویز کی شہادت ہوں۔ خدا نے فرمایا تھا۔ قیامت کے دن آدمیوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی لوں گا۔ اور وہ انسان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ قیامت تو دور رہی۔ اس کا نمونہ زمین کے اس دور پر آشوب میں جو درحقیقت محشری زمانہ ہے۔ اعضائے جسم گواہی کے لیے طلب کیے جا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جبکہ دستاویز کی تکمیل مہر و دستخط سے ہوتی تھی۔ اب قیامت قریب آ گئی۔ مہروں اور دستخطوں میں جعلسازیاں ہونے لگیں اس واسطے خدا نے ایک نیا ذریعہ تکمیل صداقت کا پیدا کیا۔ اور وہ انگوٹھے کا نشان ہے۔ تمام معاملات جن کا عملدرآمد تحریر میں آتا ہے انگوٹھے کے نشان سے مکمل کیے جاتے ہیں دائیں ہاتھ کے فخر کو قرن گزر گئے تھے وہ کہتا تھا کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میرے بل پر سب کام ہوتے ہیں۔ خدا کو انانیت کسی کی نہیں بھاتی۔ آج دایاں ہاتھ بیکار ہے اور بائیں ہاتھ کے کرتب کا سارے جہان میں دور دورہ۔ اس میں نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو غرور و تکبر و خود پرستی کے ستائے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری انترائیاں ہمیشہ برقرار رہیں گی۔ دوام اور ہمیشگی صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی ہر ایک کے لئے انقلاب و زوال ہے۔

اللہ کے بندو! اپنے جسم پر غور کرو۔ تمہارے رونگ رونگ میں اسرار ربانی کے نوشتے ہیں۔ تمہارا بال بال یزدانی رموز میں بندھا ہوا ہے۔ انگوٹھے کی لکیریں جس طرح تمہارے معاملات دنیاوی میں کام آتی ہیں اسی طرح ان سے عرفان الٰہی کا

کام نکالو۔ لین دین کے کاغذات پر انگوٹھے کا نشان کرتے وقت ذرا یہ بھی سوچ لیا کرو کہ تم کس انگشت حقیقت کا نشان ہو۔ کھانے۔ پینے۔ لڑنے۔ جھگڑنے۔ خود بینی خود ستائی کے لیے تمکو نہیں پیدا کیا گیا۔ پروردگار کو تمہاری پیدائش سے اپنی طاعت و عبادت مقصود ہے۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کا ارشاد اس کا شاہد ہے۔ کائنات کی دستاویز قلم تکوین سے جب لکھی گئی تو کن کہنے والے نے مخلوقات کے کاغذ پر ایک انگوٹھے کا نشان لگایا تا کہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ وہ سند کیا ہے اور وہ ضرورت کیا ہے اور وہ انگوٹھے کا نشان کس سے مراد ہے۔ نشان انگشت وجود انسانی ہے۔ سند خلافت رحمانی ہے۔ ضرورت موت کے بعد وہ گھڑی جو سب کو پیش آنی ہے ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے باطنی و اندرونی انتظام کے لیے پروردگار کی جانب سے ایک شخص مقرر ہوتا ہے جس کے عہدے کا نام قطب عالم یا قطب مدار ہے۔ قطب عالم کے دائیں بائیں دو وزیر ہوتے ہیں۔ دست راست کے وزیر کا نام عبدالملک اور دست چپ کے وزیر کا عبدالرب۔ عبدالملک کا یہ کام ہے کہ خدا پرستوں کے معاملات کو قطب عالم کے حضور میں پیش کرے اور عبدالرب ان لوگوں کی مہمات بارگاہ قطب عالم میں پیش کرتا ہے جو دائرہ توحید خدا پرستی سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس زمانے میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ دشمنان توحید تمام دنیا پر چھائے چلے جاتے ہیں اور خدا پرست ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دست چپ کے وزیر کے لیے اپنی نعمتوں کا دروازہ کھول دیا ہے مگر صفات الٰہی کی مختلف شانیں ہیں۔ آج ہمارے شامت اعمال کے سبب صفت قہاری کا ظہور ہے۔ اور قطب عالم کے وزیر دست چپ برسر حکمرانی ہیں۔ جس کی

وجہ سے دُنیاوی دستاویزوں پر انگوٹھے کا نشان بھی بائیں ہاتھ کا لگایا جاتا ہے۔ تو کل ہماری تو بائیں قبول ہوں گی صفت رحمت فرمائے گی اور وزیر عبدالملک برسر حکومت ہوں گے۔ اس کو انگریزی پارلیمنٹ کی دو شاخوں لبرل اور کنسرویٹو کے تحت میں نہ لائے۔

ربانی حکومت جمہوریت سے اسی قدر تعلق رکھتی ہے کہ کبھی شان قہر کا دور ہے اور کبھی شان رحم کا دور لیکن قہر ایک کے لئے زہر ہوتا ہے اور دوسرے کے لیے آب حیات۔ اس کی سرکار میں لبرل اور کنسرویٹو حکومتوں کی طرح پالیسیاں نہیں ہیں اس کی حکومت کا مدار محکوموں کے اعمال پر ہے۔ جیسے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی حکمرانی کی جاتی ہے۔ اس کے دربار میں دائیں ہاتھ کے نشان کی دستاویز مقبول ہے وہ ارشاد فرماتا ہے فاما من اوتی کتبہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا جس کے پاس دائیں ہاتھ کی دستاویز اعمال ہے اس کا محاسبہ آسان اور سہل ہوگا یعنی جس طرح دُنیاوی عدالتوں میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان سے دستاویز قبول کی جاتی ہے۔ عدالت دین میں قبول نہیں کی جاتی۔ اس کے ہاں دائیں ہاتھ کی دستاویز پیش کرنے سے نجات ہے لہٰذا اے آدمیو! اگر تم خدا کو چاہتے ہو۔ اگر تم اس کی توحید کے قائل ہو تو دائیں ہاتھ کی دستاویز تیار کرو۔ دایاں ہاتھ تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ میدان جہاد میں تمہارے بہت سے بھائی قبضۂ شمشیر اور کھٹکۂ تفنگ سے دائیں ہاتھ کا حق ادا کر رہے ہیں۔ تم اس امن کے ملک میں جیب میں ہاتھ لے جاؤ اور اس کا حق ادا کرو۔ تمہارے دائیں ہاتھ کی لکیریں بھی اگر تم غور کرو اس عظیم الشان معاملہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ جو سب خدا پرستوں کو خوشی و خرمی کے ساتھ عنقریب پیش آنے والا ہے۔ لکیر عرفان کو پہچانو تاکہ لکیر کے فقیر اور عارف حق کا رتبہ پاؤ۔

لال ٹین

(از نظام المشائخ مارچ ۱۹۱۳ء)

وہ لال ٹین اک قفس میں رہنے والی روشنی کا نام ہے۔ شیشے کے اس قفس کو کہتے ہیں جس کے اندر شعاع آتشیں قید ہے۔ ایک زمانہ تھا آندھیاں۔ پروانے اور چلنے پھرنے والوں کے دامن۔ چراغوں کے دشمن تھے۔ بھرے پُرے چراغ ہوا کے جھونکے سے گل ہو جاتے تھے۔ پروانے اپنی عاشقانہ پر اندازی سے اس غریب روشنی کی ہستی کو بے جان کر دیتے تھے۔ بے احتیاط دوپٹوں کے آنچل کبھی تو ایسا ہوتا کہ نور چراغ ان کے صدمے سے بجھ جاتا اور کبھی دوپٹہ خود چراغ بنجاتا تھا اور بے احتیاط اوڑھنے والے کو سزائے سوخت مل جاتی تھی۔

آج وہ وقت ہے کہ روشنی کو سب سے زیادہ ترقی اور امن و امان نصیب ہے۔ کیا مجال جو آندھی آنکھ ملائے۔ پروانہ قریب آئے اور آنچل کا دامن حملہ آور ہو۔ روشنی اطمینان و بے فکری سے چمنی کے گنبد میں رات بھر پاؤں پھیلا کر سن سناتی ہے۔

اس نئی روشنی کے زمانہ میں کائنات کی ہر چیز کا ظاہر روشن ہے مگر باطن تاریک بجلی کی روشنی کانچ کے ہنڈوں میں ظاہر ہو کر چمکتی ہے۔ اور تار کے باطن میں تاریک رہتی ہے۔ گیس کی روشنی کا بھی یہی عالم ہے۔ مگر ہمیں اس سے کیا بحث۔ سیاہ باطن ہو یا سفید باطن۔ ہمیں تو یہ ہماری لال ٹین پیاری ہے۔ چلتا پھرتا نور ہے۔ اور اس زمانہ میں برکت وہیں ہے کہ جہاں حرکت ہو۔ ایک رات میں نے لال ٹین سے پوچھا۔ کیوں بی! تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی؟ بولی۔ آپ کا خطاب کس سے ہے؟ بتی سے، تیل سے، ٹین کی ڈبیہ سے،

کانچ کی چمنی سے، یا پیتل کے اس تار سے جس کو ہاتھ میں لیکر لالٹین کو لٹکائے پھرتے ہیں؟

لال ٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی۔ یہ میری ایک بھول تھی اگر میں پہلے اپنے وجود کی لالٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا۔ میں حیران ہو گیا کہ اگر لال ٹین کے کسی ایک جزو کو لال ٹین کہوں تو یہ درست نہ ہوگا۔ اور اگر تمام اجزاء کو ملا کر لالٹین کہوں تب بھی موزوں نہ ٹھہرے گا کیونکہ لال ٹین کا دم روشنی سے ہے۔ روشنی نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر دن کے وقت جب لال ٹین روشن نہیں ہوتی اس وقت بھی اس کا نام لال ٹین ہی رہتا ہے تو پھر کس کو لال ٹین کہوں۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجبوراً لال ٹین ہی سے پوچھا۔ میں خاکی انسان نہیں جانتا کہ تیرے کس جز کو مخاطب کروں اور کس کو لال ٹین سمجھوں۔ یہ سنکر لال ٹین کی روشنی لرزی ہلی۔ کپکپائی۔ گویا وہ میری ناشناسی و نادانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی۔ اور کہا اے نور خدا کے چراغ آدم زاد سن لال ٹین اس روشنی کا نام ہے جو بتی کے سر پر رات بھر آرا چلایا کرتی ہے۔ لال ٹین اس شعلے کو کہتے ہیں جس کی خوراک تیل ہے۔ اور جو تاریکی کے دشمن سے تمام شب لڑتی بھڑتی رہتی ہے۔ دن کے وقت اگرچہ یہ روشنی موجود نہیں ہوتی۔ لیکن کانچ اور ٹین کا پنجرا رات بھر اس کی ہمنشینی کے سبب لال ٹین کہلانے لگتا ہے تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے اگر تو اس کی قدر جانے اور اس کو پہچانے تو سب لوگ تجھکو روشنی کہنے لگیں گے خاک کا پتلا کوئی نہ کہے۔ دیکھ خدا کے ولیوں کو جو رات بھر اپنے پروردگار کی نزدیکی و قربت کی خواہش میں کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں تو دن کے وقت ان کو نور خدا سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد ان کی قبروں کی بھی وہی شان رہتی ہے پہلے چمنی کو صاف کر۔ یعنی اپنے لباس ظاہری کو گندگی و نجاست سے آلودہ نہ ہونے دے

اس کے بعد ٹپہ میں صاف تیل بھر۔ یعنی حلال کی روزی کھا اور پھر دوسرے کے گھر کے اُجالے کے لیے اپنی ہستی کو جلا جلا کر مٹا دے۔ اس وقت تو بھی قندیل حقیقت اور فانوس ربانی بنجائے گا ۔

بے تار کا تار

(از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۳ء)

تم نہ کہتے تو میں بھی خاموش رہتا۔ بادہ فروش اور بادہ نوش کے ہاتھ میں اپنا بھید دیدیا۔ میں بھی دنیا پر تمہارے راز کو فاش کر دوں گا ۔

پہلے تم نے یہ کیا کہ بجلی کے اسرار کو طشت از بام کیا۔ اس سے گاڑیاں کھچوائیں پنکھے جھلوائے۔ سڑکیں کٹوائیں۔ ہرکارے کا کام لوایا۔ پھر بے سلسلہ و بے تعلق نشان بھی ان کے قبضے میں دیدیے۔ بے تار کے تار کا علم بتا دیا۔ اور وہ بھی کس کو جو تمہاری شان میں گستاخ ہے۔ بے ادب ہے۔ مغرور ہے۔ چور ہے۔ ڈاکو ہے دغا پیشہ اور جفا کار ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم کو بندہ نوازی کا اتنا شوق کیوں ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا اس راز کے زور سے یہ لوگ تمہارے پسندیدہ گھر پہ چڑھ کر جائیں گے گولے گولیاں برسائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا تکلیف تو ہم کو ہو گی۔ جن کے دلوں میں اپنے گھر کی محبت بھر دی ہے ۔

نادان و ناسمجھ بندہ بگڑتا ہے۔ ارے بے خبر تو کیا جانے پروردگار کی حکمت پروردگار ہی خوب جانتا ہے۔ علم و ہنر کے آم کا رس تو تجھ کو دیا ہے چھلکے ان گستاخوں کو مل گئے۔ اس پر تیرا یہ کہنا سراسر بے بنیاد ہے۔ چور کو چوری کرنے کے اوزار دیے ہیں تو اس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ چوری کے بغیر بھی ہم تجھ کو رزق دے سکتے

ہیں یہ اوزار امتحان کے لئے ہیں۔ اگر تو نے چوری کے کام میں ان کو استعمال کیا تو ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اور اگر دوسروں کو آرام دینے کے کام میں لایا تو انعام پائیگا۔ کردگار عالم جانتا ہے کہ یہ گو مغربی دنیا گستاخ و ناسزا ہی ہے۔ مگر اس کو یہ بھی علم ہے کہ انہیں میں بہت سے میرے دروازے پر سر جھکانے آنے والے ہیں ایک وقت پر جرمن اسلام قبول کرے گا۔ انگلستان مسلمان ہو جائے گا۔ فرانس میں بھی نور وحدت کی روشنی نمودار ہوگی۔ ابتدا کو دیکھ کر بے قرار نہ ہو۔ ازل کے حالات سے مایوس نہ بن۔ انجام و ابد میں دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کیا کیا جاتا ہے۔ آج دیا ہے کل لے لیا جائے گا۔ آج سرفراز کیا ہے۔ کل برباد کر دیا جائے گا۔ اگر نہ مانے اور گمراہی کی چال چلتے رہے۔ بے تار کا تار تم لوگوں کی دلیل بنایا گیا ہے۔ اس کو دیکھو۔ سوچو۔ سمجھو۔ اور دشمن سے کہو یہ بھی ہمارے مولیٰ کی شان کا ظہور و نمونہ ہے۔

مراقبہ میں کیا ہوتا ہے۔ مکاشفہ کسے کہتے ہیں۔ لاکھوں کوس کی خبر آن کی آن میں دل کی لوح پر کس طرح نقش ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب بے تار کے تار میں ہے چند اونچی اونچی لکڑیاں کھڑی کر دیں۔ برقی ذخیرہ کا خزانہ ان کھمبوں کو پہنا دیا۔ اس کے بعد اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ ایک لندن میں ہے ایک دہلی میں۔ دونوں کو آواز آنے لگی۔ لیکن کس کو؟ اس کو جو تار کے بھید سے واقف ہے۔ ہر ایک کو نہیں۔ خواہ ہزاروں آدمی تار کی بلی سے لگے بیٹھے رہیں جیسے مراقبہ کرنے والے کے پاس بیٹھنے والے بے خبر رہتے ہیں۔

مگر یاد رکھ بے تار کی خبر رستہ میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی جب وہ بجلی کے کندھے پر سوار جا رہی ہو اور رستہ میں کوئی اور کھمبا مل جائے تو وہاں کے رہنے والے خبر کے بھید کو پکڑ سکتے ہیں بس اس میں بھی انسان کو عاجز رکھا گیا ہے اور وہ

پوری اور کامل قدرت نہیں دی جو مراقبہ کرنے والے کو عطا ہوئی ہے مراقبہ کرنے والے کا کشف کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ تو پھر تو خدا کی ان مکمل طاقتوں کو بھی سیکھ اور ان کو حاصل کر کے دشمنوں کی ان چھچھوری۔ ناقص قوتوں کو حاصل کرنے۔

میں تو تیرا ہوں۔ ذرا آگے تو بڑھ سب کچھ دوں گا۔ ہاتھ پاؤں تو ہلا۔ سب کچھ بخشوں گا۔ گھر میں بیٹھا بیٹھا کوستا ہے۔ تیوری چڑھاتا ہے۔ اور بھوکے بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ۔

ہاں سچ ہے۔ حسن نظامی

سل اور دق

کے

عارفانہ نکات

(از نظام المشایخ جون ۱۹۱۳ء)

سل اور دق دو دو حرف کے دو لفظ یا دو نشتر ہیں جو انسان کی رگ حیات کو چپکے ہی چپکے بے خبری میں زخمی کر کے اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اولاد آدم گوری ہو یا کالی۔ ان بیماریوں کے نام سے کانپتی ہے۔ لرزتی ہے۔ اور ڈھونڈتی ہے کہ اپنی عقل اور علم کے زور سے ان موذی اور نامراد بیماریوں کا علاج مل جائے۔

انگریزوں کے شاہی خاندان میں یہ امراض موروثی ہو گئے ہیں دولت نے ڈاکٹروں نے مل جل کر مہینوں برسوں ان سے وجہ دیگر موجود۔ بودوگر نا بعد امراض کی تحقیقات میں سر کھپایا۔ غیب کا بھید ہاتھ نہ آیا۔ کسی نے تھتھیار کر ہنسنا اس کا علاج ہے۔ کوئی بولا کھلی ہوا میں رہنا۔ فکر کو پاس نہ آنے دینا ان کی دوا ہے

کوئی اپنے سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہا عقل کچھ کام نہیں دیتی۔ علم کی رسائی موت کی ان ہولناک مشینوں کے پرزوں کی حقیقت تک نہیں ہو سکتی۔ گویا ان سب مادہ پرست ہستیوں کو اقرار ہے کہ سل اور دق کے امراض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں یعنی شرطیہ اور حکمیہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بعض باتوں میں یہ مادہ پرست لوگ لن ترانی سے دعویٰ کیا کرتے ہیں۔

خدا کی شان ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والی عقلیں معمولی معمولی باتوں میں کس طرح عاجز اور لاچار ہو جاتی ہیں۔ آؤ ذرا آج صوفیانہ نقطہ نظر سے ان پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے لفظوں پر غور کریں۔

سل اس بیماری کا نام ہے جو پھیپھڑے کو غموں کی چھری سے زخمی کر دیتی ہے اور آدمی خون تھوکتے تھوکتے مر جاتا ہے۔ دق ایک خفیف اور باطنی حرارت کو کہتے ہیں جو جسم کے خون کو جلا دیتی ہے۔ پھیپھڑہ اس کی ہلکی ہلکی آنچ سے جلکر کباب ہو جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں مریض کا ظاہری چہرہ اندرونی اور باطنی سوختہ کاری کو ظاہر نہیں ہونے دیتا جس طرح عشق کی آگ جب خانہ باطن میں بھڑکتی ہے تو انسان کے اعضائے ظاہری پر اس کا ظہور بس اتنا ہوتا ہے کہ ہونٹ خشک ہو جائیں۔ چہرہ زرد نظر آنے لگے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس ہوں۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہیں۔ اسی طرح سل اور دق چہرے کو افسردہ اور فکرمند بنا دیتی ہے۔ مگر ہلاکت اور فنا کا بھید صفحہ رخ پر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ سیاست شناس لوگ کہتے ہیں چالبازوں کی حکومت سل اور دق کا مرض ہے۔ جو قوموں اور ملکوں کا اندر ہی اندر کام تمام کر دیتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ آدمی ان معمولی جسمانی بیماریوں سے تو اتنے پریشان اور آشفتہ خاطر ہیں جن کا علاج اور جن کی تشخیص چنداں دشوار نہیں کبھی انہوں نے روحانی

سل اور دق پر بھی توجہ کی۔ جو روح کے جوہر زندگی کو اندر ہی اندر فنا کر دیتے ہیں۔ اور وہ نفس کی حرص و ہوس ہے۔ حرص ایک سل ہے اور ہوس ایک دق ہے۔ جب یہ عارضے روح کو لاحق ہوتے ہیں تو انسان نفس اور شیطان کے اغوا سے یہ سمجھتا ہے کہ حرص و ہوس درحقیقت انسانی ترقی اور حصول کمالات کے لیئے لازمی چیزیں ہیں۔ جو قومیں صابر اور قانع ہوتی ہیں۔ ان کو ترقی اور کمال میسّر نہیں آتا۔ ایک ہی جگہ ٹھٹھری کی ٹھٹھری رہجاتی ہیں۔ اور جب کوئی شخص بیماری کو بیماری نہ سمجھے۔ بلکہ امراض کو زندگانی خیال کرے تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہلاکت اور موت کے گڑھے میں گرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ آخر زمانے میں مکاریاں۔ دغا بازیاں عقلمندی اور ہوشیاری سمجھی جائیں گی۔ وہ زمانہ آج کل ہے۔ جو شخص دُنیاوی اُمور اور فانی دولت کے حاصل کرنے میں غدارانہ جوڑ توڑ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو اس کو بہت بڑا عاقل اور دانا مانا جاتا ہے۔ اور جو چالاکیوں اور فریب کاریوں کو ناجائز خیال کر کے صبر و قناعت سے خدا و رسول کے احکام کی پیروی اور تعمیل کرتا ہو وہ اعلیٰ درجہ کا بے وقوف۔ احمق۔ وحشی بے تہذیب اور فلشٹین کہلاتا ہے۔ مگر بے وقوفوں اور احمقوں کی روحیں جن کا ابھی ذکر آیا ہمیشہ تندرست اور زندہ سلامت رہتی ہیں۔ اور عقلمندوں اور ہوشیاروں کی ارواح سل اور دق کے مریضوں کی طرح افسردہ اور اُداس اور بے چینی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ذرا سے صدمے اور دُنیاوی پیچیدگی سے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور خودکشی کے سوا اتنے لمبے چوڑے آسمان زمین میں تسلی اور اطمینان کا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

پس جن لوگوں کی روحیں سل اور دق کے امراض میں مُبتلا ہیں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ جسم کی سل اور دق کا علاج معلوم کر سکیں۔ یہ حصہ ان لوگوں کا ہے

جن کی ارواح توکل ربانی سے حقیقی مضبوطی اور توانائی اور وہ قوت رکھتی ہیں جن کے آگے مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفات کمالیہ ہیچ ہیں جس شخص کی روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علوم مخفیہ کی بصیرت عنایت فرمائی ہے وہ جسمانی سل اور دق کے امراض کا علاج اچھی طرح جانتی ہے۔ اس کو مرض کی حقیقت اور اصلیت کا بھی بھید معلوم ہوتا ہے اور ان اسباب کا بھی علم ان کو دیا جاتا ہے۔ جن سے جسم کے یہ عارضے دور ہو جائیں +

سل اور دق پھیپھڑے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھیپھڑے کی زندگی سانس پر منحصر ہے۔ اور سانس فضائے عالم کی ہوا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مادی فلسفیوں نے نتیجہ نکالا کہ دق اور سل کے مریضوں کے لیے صاف ہوا ہونی چاہیے تاکہ صاف سانس پھیپھڑے میں جائے اور اس کی کدورتیں دور ہو جائیں۔ لیکن جب پھیپھڑے میں زخم پڑ چکے ہوں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ پھر صاف ہوا کچھ فائدہ نہیں پہونچا سکتی یعنی جب سل اور دق کا درجہ ابتدائی مقامات سے آگے بڑھ گیا ہو تو مرض لا علاج ہو جاتا ہے یہ ان لوگوں کی بڑی بھول ہے۔ تندرست روح کو بتایا گیا ہے کہ ہر مرض کا ایک علاج ہے۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا۔ اندھیرے کے ساتھ روشنی ہے +

کسی چیز کا عرفان اس کی ضد سے ہوتا ہے اور ہر چیز کی ایک ضد پیدا کی گئی ہے یہ کہنا کہ جب پھیپھڑہ زخمی ہو جائے اور زخموں کا گھراؤ بڑھ جائے تو پھر اندمال کسی صورت سے ممکن نہیں۔ ڈاکٹروں کی روحانی سل و دق کی مرض میں رائے ہے اور بالکل غلط اور جھوٹ ہے +

ایک دفعہ راقم فقیر بیمار ہوا۔ کلکتے کے سب سے بڑے انگریز ڈاکٹر نے کہا۔ پھیپھڑہ خراب ہو چکا۔ اب کوئی علاج فائدہ نہ دے گا۔ باطنی ڈاکٹر بولا۔ اور اپنے فکر مند مریض کو

سمجھایا کہ ڈاکٹر پر ایمان نہ لانا۔ پاس انفاس کا شغل کھلی ہوا میں جا کر کرو۔ سارا پھیپھڑہ گل بھی گیا ہوگا تو اچھا ہو جائے گا۔ میں نے اس پر عمل کیا اور آج پانچ برس سے زندہ سلامت ہوں ۔

عزیزم ملا محمد الواحدی اڈیٹر نظام المشائخ کو آج کل کسی ایسے ہی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم کو سل ہے۔ جلدی علاج کرو ورنہ خیر نہیں۔ سنتا ہوں بشریت کے تقاضے سے واحدی ملا پر اس کا اثر ہوا۔ اور وہم کے نشتر نے اچھے بھلے پھیپھڑے کو زخمی بنا دیا۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سانس پر حیات جسم کا مدار ہے سانس ہی وہ چیز ہے جس سے زندگانی کی کامرانیاں تعلق رکھتی ہیں۔ سانس پر قابو پا جانا صحت روحانی و جسمانی کے لیے از حد مفید ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ذکر الٰہی سانس کے اندر جاری کھلی ہوا میں خوب چہل قدمی کریں۔ خدا کا ذکر ہمارے سب ظاہری باطنی جراحتوں کا مرہم ہے۔ سانس کے ذریعہ اس مرہم کے پھائے پھیپھڑے پر لگائے جائیں اور اطمینان کے لیے دوا کا استعمال بھی ہو تو مضائقہ نہیں ۔

سل اور دق کی اصل جڑ تفکرات خانگی ہیں عارف کو دنیا کے نشیب و فراز کے تردوات و تعیشات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے اس دنیا کی خوشی و تکلیف سب عارضی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں خوش اور ہشاش بشاش رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات حاصل نہ ہوگی۔ جب تک کہ خدا تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ اور اعتماد پیدا نہ ہو۔ جب توکل اور صبر و رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی تکلیف اذیت نہیں دیتی اور جب مصائب میں ایذا کا احساس باقی نہ رہے تو ان کا اعضائے جسم پر یعنی دل۔ دماغ پھیپھڑہ وغیرہ پر کوئی نقصان رساں اثر نہیں پڑنے پاتا اور اگر بشری کمزوری سے اثر پڑ جائے تو بہت جلدی اس کی اصلاح

ہو جاتی ہے۔

سانس کا ذکر سینہ اور پھیپھڑے کے امراض کو بہت جلدی دور کر دیتا ہے۔ تم کو چاہیے۔ صبح نماز پڑھکر سورج نکلنے سے پہلے کھلے میدان میں نکل جاؤ اور وہاں ایک مطمئن مقام پر بیٹھکر قابل برداشت وقفہ سے لمبا سانس اندر لیجا کر روکے رکھو اور آہستہ آہستہ باہر نکالو۔ اور اس سانس میں لفظ اللہ کو جماؤ۔ یعنی جب سانس اندر جائے تو تمام سینہ اور شکم کو اس سے بھر دو اور خیال کرو کہ لفظ اللہ باطن کی ہر سمت چھایا ہوا ہے۔ اور جب باہر کا سانس لو تو ہو کہو اور آہستہ آہستہ سانس کو خارج کرو۔ اس طرح سل و دق کی تمام جسمانی و روحانی کثافتیں دور ہو جائیں گی والدعا۔

الکبریت ما الکبریت

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۴ء)

جون ۱۹۱۴ء میں بمقام احمد آباد گجرات۔ راقم درویش دیا سلائی کے ایک نئے کارخانہ کے افتتاح میں شریک کیا گیا تھا۔ جلسہ بہت شاندار اور عظیم تھا۔ پیر صاحب بغدادی اور کلکٹر احمد آباد صدارت کی کرسی پر بازو سے بازو ملائے خبر نہیں کس قسم کا قران بنے بیٹھے تھے۔ ایڈریس بازی اور اسپیچ نوازی ہو رہی تھی۔ اس وقت میرے تخیل نے عرب و انگریز و گجرات کو مخاطب کر کے چند الفاظ جوڑ لیے۔ ناظرین دیکھیں یہ جوڑ توڑ کیسا ہے۔

(حسن نظامی)

الکبریت ما الکبریت وما ادراک ما الکبریت۔ میچز۔ ویچ میچز۔ ہو ڈول یو ڈاسٹ میچز۔ آر دیا اسٹری۔ کیوی دیا اسٹری۔ تم نے شی کھبر کہ دیا اسٹری

شول پچھے +

دیا سلائی کیسی دیا سلائی۔ تمھیں کیا خبر کہ دیا سلائی کیا ہوتی ہے وہ ایک
تنکا ہے جو جلنے اور مرنے کو پیدا ہوا وہ جنگل کے ہرے بھرے درختوں کا
لخت جگر ہے جو انسان کی خاطر ملیامیٹ ہونے گھر سے باہر نکلا۔ کٹ کر آیا۔
گرم چشمہ میں اُبلا کھال کھنچی مشین کی قینچیوں نے پرت پرت کرتے تنکے بنائے
اور مسالہ میں غوطہ دیکر بکس بنائے جب یہ میاں تنکے دیا سلائی کہلائے +

ناروے سویڈن جاپان کی دیا سلائی گوری ہندوستان کی کالی۔ مگر دونوں
کالے گورے کے لقب سے آزاد۔ کبھی نہیں سنا کہ کالے تنکے کو گورے
تنکے نے کینیڈا اور سائوتھ افریقہ کے گوروں کی طرح اپنے ملک میں
آنے سے روکا ہو +

یہ بیچارہ تو ہندو، مسلمان، عیسائی، موسائی۔ نیک و بد کا فرق بھی نہیں کرتا
جس کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ خدمت بجا لاتا ہے۔ مندر، مسجد، گرجا میں اسی
کے دم سے روشنی ہے۔ مسٹر کلکٹر اور پیر صاحب بغدادی کے سگریٹ
بھی سلگاتا ہے +

آج اس کی مشین کھولی جاتی ہے۔ یہ اس کا یوم الست ہے سب تنکوں
کی روحیں بتائیں ان کا عارف کون ہے۔ خدا کا اقرار تو وہ ازل کے دن بلیٰ
کہکر کر چکے۔ اب اپنے واقف اسرار کو سمجھیں +

وہ کون ہیں؟ اس جلسے میں کوئی نہیں۔ بیچارے پیر بغدادی بھی کبریت
کے رموز سے بے خبر ہیں۔ سگریٹ جلانے کے سوا کبھی اس غریب کو ہاتھ میں
نہیں لیتے۔ مسٹر کلکٹر کو صدارت کی کرسی اور اسپیچ بازی سے فرصت نہیں
مجمع عام میں بھی جس میں ہندو مسلمان، پارسی، یہودی، عیسائی، گورے کالے

سب ہی موجود ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ دیا سلائی کی اصلی شان کیا ہے وہ کیسا ایک ہی سجدہ میں مقبول ہو جاتا ہے۔ کہ بکس کے پہلو میں بچھی ہوئی خاکی جانماز پر سر جھکایا اور شعلہ غیبی دوڑ کر آیا۔ غریب تنکا جل کر گر پڑا۔ اور تمہارا گھر روشن ہو گیا +

یہ شعلہ کہاں سے آیا۔ کس نے بھجوایا۔ کوئی ہے جو بتائے۔ نہیں تو کوئی ہے جو بتانے والے سے یہ بھید سنے۔ مگر نہ کوئی بتانے والا ہے۔ نہ کوئی سننے والا ہے۔ آسمان اپنے اشاروں کو دل کے پردوں میں چھپا رہنے دے۔ ورنہ یہ شرمائیں گے۔ جو میری سی شکل و صورت لیکر آئے ہیں مگر تجلی کے حق سے محروم ہیں +

لوہے کی طریقت

(از طریقت جولائی ۱۹۱۶ء)

خاک کی مورت۔ مٹنے والی صورت اور زور کا یہ عالم کہ سمندر کی چھاتی پر مونگ دلنے کو تیار۔ بجلی وہ اسکے سر پر سوار۔ جنات و حیوانوں کی تو کیا مجال کہ اس سے آنکھ ملائیں۔ فرشتے اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ خدا کے سامنے اس کی طاقت کا لوہا مانتے ہیں +

ذرا دیکھنا۔ اس خاکی پتلے کو۔ زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔ لوہے کی نہریں بناتا ہے اور ان میں کاٹھ کی ناؤ چلاتا ہے۔ کاغذ کی شریعت پر لوہے کے قلم سے آہنی طریقت کی گلکاریاں دکھاتا ہے +

عشق کا انکس نہ ہوتا تو یہ مست ہاتھی خبر نہیں کیا خون خرابے کرتا۔ کن کن

نیم جانوں کو پاؤں کے نیچے دلتا۔ خدا کی شان ہے محبت کی ننھی سی چیونٹی اس دیو اسنے ہاتھی کے اوسان باختہ کر دیتی ہے +

یہ موسم برسات خاک کے ہر ذرہ میں ایک جان پیدا کر دیتا ہے۔ آسمان سے جو بوند زمین پر آتی ہے۔ اپنے اندر ایک روح لاتی ہے۔ مگر آدمی کے لیے یہ زمانہ قیامت ہے وہ اپنے کلیجہ کو مسوستا ہے۔ اور بے قرار ہو کر آسمان کو دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے اے ابر تو آیا میرے پیارے کو نہ لایا۔ کبھی کہتا ہے برسات ہی۔ برسات نہیں جنیسال کرنا۔ اس البیلے نوجوان کی حالت کا۔ جو بارش سے پہلے فلسفہ الہیات پر غور کر رہا تھا۔ اپنی غیر معمولی قوتوں پر اترا رہا تھا۔ اور کہتا تھا میں سمندر کو خشک کر سکتا ہوں۔ پہاڑ میرے ہُنر سے خاک بن جاتے ہیں۔ میں ہوا کے اوپر اپنے بنائے ہوئے پروں سے پرواز کر سکتا ہوں۔ بجلی میری تابعدار ہے۔ بھاپ پر میری حکمرانی چلتی ہے۔ مجھ میں ہر بڑی طاقت کے مسخر کر لینے کا مادہ موجود ہے۔ میں اپنی کوشش سے آسمان کو زمین پر لا سکتا ہوں۔ اور زمین کو فلک پر پہونچا سکتا ہوں +

اور اب جوں ہی کالی گھٹا نمودار ہوئی ہلکی ہلکی گرج کی آواز آئی اور بجلی نے بادلوں سے جھانکنا شروع کیا۔ جنگل کے مور جھاڑیوں سے نکلکر میدان میں آگئے اور جھوم جھوم کر بولنے لگے۔ حضرت ابن آدم نیم وحشیوں کی طرح مجنونانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کبھی داغ کا دیوان اُٹھاتے ہیں کبھی تھیٹر کا کوئی گیت گن گناتے ہیں۔ سامنے چمن میں گلاب اور چنبیلی کی ٹہنیوں میں خیالی جھولے ڈال رہے ہیں۔ اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ان نازک انداموں میں اتنی سہار نہیں +

شنتا دل سے کیا مزے کی باتیں ہو رہی ہیں +

وہ ابھی باغ میں کیونکر آئیں گے راستہ خراب ہے۔ فقط ایک بلیا ہے۔ اس پر کیچڑ ہوگی۔ اُن کا پاؤں نہ پھسل جائے۔ آس پاس گھانس ہے۔ کوئی جانور نہ نکل آئے۔ کالی چھتری پر بجلی نہ گر پڑے۔ وہ بہت ڈرپوک ہیں۔ بجلی کے ڈر سے آنا موقوف نہ کر دیں۔ رقیب کا گھر کچی سڑک کے پاس ہے۔ اُس کے ہاں نہ ٹھہر جائیں۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ باغ کا راستہ پہلے سے درست نہ کرا لیا۔ میں یہاں لوہے کی پٹری بچھوا دیتا۔ تاکہ وہ آج کی رات اسپیشل ٹرین میں چلے آتے۔ موٹر خریدنے کا ارادہ ہی کرتا رہا آج ہوتی تو کام آتی۔

کہتے ہیں ایسے موقع پر خدا کو پکارنا چاہیئے۔ وہ بھی کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے میں نے تو آج تک اُس کا احسان نہیں اُٹھایا ہے۔ تو کیا اُسی کو آواز دوں۔ مگر وہ بھی کیونکر آئے گا۔ اُس کے پاس ہوائی جہاز تھوڑی ہے۔

اتنے میں بادل پھٹ گیا۔ سورج نکل آیا۔ تخیلات کا سیلاب اُترنے لگا۔ جذبات کا طوفان تھمنے لگا۔ ہوش ٹھکانے آئے تو جنگل کی جھونپڑی میں رہنے والے شاہ صاحب کے پاس پہونچے۔ اور اپنی تازہ حالت کا استفسار کرنے لگے۔

شاہ صاحب نے کہا بابا مٹی کی طریقت رکھنا اور عشق کا دم بھرنا عقلمندی نہیں۔ محبوب سنگدل ہے۔ اس کے لیے لوہے کی سڑک بناؤ۔ پیارا پارہ ہے تو آگ بنکر اُڑاؤ۔ لکڑی کا قلم توڑ دو لوہے کے قلم سے رشتہ جوڑو۔ یہ قلم ہر سنگی لوح میں نقش کندہ کر دیتا ہے۔

میاں شریعت علم ہے۔ اور طریقت عمل۔ اور معرفت اس عمل کا نتیجہ۔ برسات کی ہوا نے عشق کو جگایا۔ اور ایک طلب دل میں پیدا کی۔ یہ شریعت تھی۔

مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑتے۔ کرٹک۔ چھک۔ کیچڑ پانی کی پروا نہ کرتے تو سالک طریقت کہلاتے در جاناں تک رسائی ہل جاتی۔ جس کے لیے ہاتھ ملتے ہو وہ ہاتھ آجاتی۔ تو مقام معرفت میں حق الیقین کا درجہ پاتے کتابوں کے کاغذ۔ طریقت کی کاغذی سڑکیں ہیں۔ ریل کی پٹریاں آہنی راستے ہیں اُن کو دیکھو اور سمجھو +

انسانی ارادہ قلم دوات کی مدد سے حروف کی شکل میں کاغذ پر نمودار ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کے سلوک کے لیے طریقت بنتا ہے۔ ریل کی پٹریاں زمین پر بچھ جاتی ہیں اور اپنے سینے پر رات دن گاڑیوں کی آریاں چلاتی ہیں۔ تب دور کی منزلیں قریب ہوتی ہیں اور فراق وصال کی شکل اختیار کرتا ہے +

بھائی یہ زمانہ لوہے کا زمانہ ہے اگلے دفتروں میں زبان نصیحت کرتی تھی اَب توپ کا مُنہ لیکچر دیتا ہے۔ سُنا نہیں ؎

شاہ جرمن نے کہا ہنس کر جناب پوپ سے
وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے

توپ کا لفظ جلدی اثر کرتا ہے اور جلدی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے خاکی طریقت کے مقابلہ میں آہنی طریقت یعنی سڑک سواریوں کو جلدی مقام مطلوب تک پہونچا دیتی ہے +

طریقت کا کوچہ بڑا سخت ہے۔ اِس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں آج کل کی آہنی ایجادیں ہم کو اشارہ کرتی ہیں۔ کہ ہم بھی اپنے دینی راستہ کو پختہ اور آہنی بنائیں۔ اور اپنے سلوک کی گاڑی جلدی اس دورِ ظلمات سے گزار کرلے جائیں +

مگر لوہے کی طریقت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بہت سی گرم بھٹیوں میں جلنا کٹنا پڑتا ہے۔ اس لوہے کی طریقت کے بھی درجے ہیں۔ جو باطنی طریقت کے درجوں کو ثابت کرتے ہیں۔ پہلا درجہ فولادی ہے۔ اس کے اندر کوئلہ کی کثافت نہیں ہوتی۔ یہ بہت نازک تن اور نازک آواز چیز ہے۔ ذرا سے صدمے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کو توڑو تو ننھے ننھے ذرے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسر درجے کا لوہا ظلماتی اثر زیادہ رکھتا ہے۔ اسکو توڑو تو لکڑی کے سے ریشے نکلتے ہیں۔ تیسری قسم اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ قدرت نے ہر درجے کی ایک نوکری رکھی ہے۔ جس میں وہ مصروف رہتا ہے۔ پانی لوہے کا ملک الموت ہے۔ پانی کے اندر اس کو ڈال دو اور کچھ دن کے بعد نکال کر دیکھو، دیکھو۔ زنگ کی چادر چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ چادر اندر ہی اندر لوہے کے جسم میں گھسی چلی جاتی ہے۔ اور آخر کار لوہے کو خاک کر دیتی ہے۔ یہی حال باطنی طریقت کا ہے۔ اس کے بھی مختلف درجے اور حصے ہیں۔ مگر ہر دو حصے کو خام خیالی اور بے اعتقادی کا پانی فنا کر دیتا ہے۔ تم اگر پختہ ہوتے اور آہنی طریقت سے واقف ہوتے تو خدا تعالیٰ کی نسبت ایسی بے سر و پا باتیں خیال میں نہ لاتے۔ جس نے تم کو اور تمہارے علم و ہنر اور طاقت خیال کو پیدا کیا ہے۔

پتھر کی طریقت

(از طریقت، ستمبر ۱۹۱۴ء)

یہ رسالہ جس کا نام طریقت ہے۔ کیونکر چھپا۔ اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ڈاک میں پیکٹ آیا۔ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اور رائے زنی شروع ہوگئی۔ کاغذ

ذرا خراب ہے۔ چھپائی بھی چندی چندی آنکھوں سے دیکھتی ہے لکھائی بھی
بہت خوبصورت نہیں ۔

ہاں مضامین کی ترتیب اچھی ہے۔ جذبات عوام و خواص کو یکساں ملحوظ رکھا
گیا ہے۔ یہ کہا اور پرچہ رکھ دیا۔ مگر کسی نے یہ نہ سوچا کہ کاغذوں پر یہ حروف
کس طرح نقش ہوئے۔ اور کن کن منزلوں کو طے کر کے ہم تک آئے اور ان کے اندر
کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں ۔

یہ عذر کس کے حصے میں ہے۔ اس کے جو پہلے خود اپنے وجود پر فکر کرنے
کا عادی ہو۔ جز سے پہلے کل، شاخ سے پہلے جڑ پر خیال لے جاتا ہو۔ وہ جب
رسالۂ طریقت کو دیکھے گا تو کہے گا کہ اس کا آنا پتھر کی سڑک سے ہوا ہے ۔

پہلے کاپی نویس نے لوگوں کے خیالات کو قلمبند کیا اور زرد رنگ کے کاغذ
پر لکھا زرد رنگ اس لیے منتخب کیا کہ ہر چیز کی بنیاد عشق و محبت پر ہے اور زردی
شانِ اُلفت ہے۔ عشق عاشق کو زرد بنا دیتا ہے۔ لہٰذا ان حروف کو جو آخری
منزلوں میں اپنی شکل سے سینکڑوں ہزاروں حرف بننے والے تھے۔ زرد کاغذ
پر لکھا گیا ۔

اس کے بعد پتھر کی طریقت کا سلوک درپیش ہوا۔ پتھر کی طریقت یعنی چھاپہ
کا پتھر بلایا گیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ ان حروف کو جو کاپی کے کاغذ پر شانِ یکتائی
میں ہیں رنگِ کثرت عنایت کر۔ پتھر نے کہا۔ توبہ توبہ میری کیا مجال ہے جو کسی کو
کچھہ دوں یہ قدرت تو کسی اور ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے علاوہ ابھی میرے
سینے پر نقش غیر کندہ ہیں۔ جب تک یہ نہ مٹ جائیں کوئی سلوک کامیاب
نہیں ہو سکتا ۔

یہ سُنکر دستِ غیبی آگے بڑھا۔ دو پتھروں کو سینے سے ملا کر رگڑنا شروع کیا۔ یہاں

گیا کہ تھوڑی دیر میں نقشِ غیر فنا ہو گئے ۔

جب پتھر سے نقشِ غیر مٹ گیا تو کہا گیا کہ اب ان نئے حرفوں کو سینے میں جگہ دیدو۔ پتھر نے آہ سرد بھر کر کہا کہ ابھی ایک امتحان اور باقی ہے۔ امانتِ عشق کو سینے میں رکھنا آسان نہیں پہلے آتشِ شوق سے سینہ گرما لوں۔ مہمان کے قابل گھر بنا لوں۔ تو اپنا کہہ کر خیر مقدم کو آگے بڑھوں ۔

پتھر کو آگ سے سینکا گیا۔ سوز و ساز کا مزا چکھایا گیا۔ انگلیوں سے اس کے بدن کو چھو کر دیکھ لیا کہ ہاں نارِ ذوق اس کے اندر خوب سرایت کر چکی۔ تو کاپی کا کاغذ منگایا گیا اور پتھر کی چھاتی سے اسکو چپٹایا گیا۔ کاغذ گرمی کی تاب نہ لایا اور پتھر پر حروف کے اسرار وصال میں شرکت کو برداشت کر کے کہیں غائب ہو گیا۔ اب جو حرفوں نے آنکھ کھولی تو اپنے سوا کسی کو نہ پایا ۔

باہر والوں نے غلیظ کثافتوں کو صاف کیا۔ اور لوہے کے قلم لے کر حروف کی نوک پلک تراشنے بیٹھے۔ اس وقت دیکھا تو حروف اُلٹے نظر آئے۔ گھبرا کر پوچھا۔ تمہارا کیا حال ہے۔ حروف نے جواب دیا۔ جس کا باطن سیدھا ہے۔ اس کا ظاہر اُلٹا نظر آتا ہے بندہ اس کو نہیں سوچتا۔ اس واسطے تغیراتِ عالم سے گھبراتا ہے ۔

تزکیہ ظاہری ہو چکا تو پتھر کو مشین کے اوپر رکھا گیا۔ اور اسپر سیاہی کا بیلن پھیرا گیا۔ اور اوپر ایک کاغذ ڈھک کر مخفی حجرے میں دھکیل دیا گیا۔ اور فوراً باہر بلا لیا گیا۔ دیکھا تو حروف کا دوسرا ہمشکل اوپر کے کاغذ پر موجود تھا ۔

اسی طرح سینکڑوں ہم شکل بنتے چلے گئے۔ اور ان سے یہ رسالہ طریقت تیار ہوا گویا یہ طریقت پتھر کا طریقت ہے۔ منزل سنگ کو طے کر کے ہم تک آئی ہے۔ دیکھئے پتھر کی طریقت آئندہ زمانہ میں کیا گل کھلاتی ہے۔ ابھی تک تو اطمینان ہے کیونکہ ڈاکٹر اقبال کا بیان ہے کہ فقیر اور طریقت آپ لوگ پالٹکس میں حصہ نہیں لیا کرتے

اگر یہ شہادت عیسیٰ کا اظہار نہیں ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سنگ لرزاں بنا ہوا ہوں ۔

کھوپڑی کی صدا

(از رسالہ مرشد دہلی۔ ۵ مارچ ۱۹۱۸ء)

مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلوی کے ملاقات خانہ میں طاق کے اندر ایک کھوپڑی رکھی ہے۔ اسپر شیشہ کا خوبصورت سرپوش ڈھکا ہوا ہے اور سنہری ہار اوپر پڑے ہوئے ہیں یہ بہت پرانی ہے یورپ سے لائی گئی ہے۔ کسی رومی یا یونانی کی ہے ۔

یہ فطرتی ظرف ہے اس منظروف کا جو اُمیدوں، خواہشوں اور اولوالعزمیوں کا طوفان خانہ تھا۔ مگر اب خالی کھنڈر ہے، اب ویران گنبد ہے۔ اسکی آبادیاں اُجڑ گئیں اس کی ہستیاں نابود ہوگئیں۔ اس کھوکھلے وجود میں اب خودی باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ ہم اپنی مستعار خودی کو اس کے اندر لیجائیں اور ذرا آزادی کے جوش کو اپنی آوازیں بھر کر زور سے بولنا شروع کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ گنبد خاموش بھی صدائے بازگشت سے ہم کو جواب دے گا ۔

اگر ہم نے ہستی کی مستی میں الحیات الحیات پکارا تو کھوپڑی بھی الحیات الحیات کہیگی مگر اسکی جوابیہ حیات میں اثر ممات ہوگا۔ ہمارا سوال غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کے ماتحت پیش کیا جائے گا، کھوپڑی کے جواب میں اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ کی کیفیت ہوگی ۔

اور یہ سچ ہے کہ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ جن کھوپریوں پر حکومتوں کے تاج ہیں وہ بھی مبتلائے حیات غرور ہیں، اور جن کھوپریوں پر غربت و بیکسی کا بوجھ رکھا ہوا ہے اُن کو بھی (اپنی حیثیت کے بموجب) زیست چندروزہ کا غرور مطلوب ہے ۔

تنازع بالبقاء کا مسئلہ فلسفیوں نے اسی نکتہ سے پیدا کیا ہے کہ کائنات کا ہر جزو اپنے بقاؤ قرار کے لیے حرب و ضرب میں مصروف ہے لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب متاعِ قلیل کے لیے یہ رزم کاریاں ہیں تو متاعِ کثیر جو حیاتِ آخری اور زیستِ عقبیٰ ہے کیسی سخت جد و جہد کی طلبگار ہو گی۔ اس بقائے فانی کی خاطر کائنات گیر نزاع برپا ہے تو بقائے لافنا کے لیے تو سینکڑوں ہزاروں حصے زیادہ رزم کاری چاہیئے"۔

آج یہ کھوپڑی ہڈی کا تابوت ہے۔ کل اسکو ایک دل پر۔ دو آنکھوں پر۔ زبان پر ہاتھوں پر۔ پیروں پر۔ ایک شاہانہ اقتدار حاصل تھا۔ اب وہ اقتدار فنا ہو گیا۔ اور یہ ہیکل پیام عبرت بن گئی اور اس نے کہا فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (پس تجھ کو ان کی دولت و اولاد سے متعجب نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خدا تعالےٰ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ حیاتِ دُنیا کے عذاب میں ان کو مبتلا کرے)۔

اس کھوپڑی والے کو بھی اچھا کھانے۔ اچھا پہننے۔ عیش کرنے۔ اکڑ کر زمین پر چلنے اور عزت والا بننے کی تمنا تھی، یہ بھی چاہتا تھا کہ حیاتِ دنیا آرام سے گزر جائے اور عاقبت سے بے پروا تھا۔ اسکو بھی اسباب دُنیا کے سوا زندگی کی کشمکش میں کسی دوسری بات کا خیال نہ آتا تھا۔ اس کے اندر بھی رات دن دُنیاوی حریت و آزادی کی آندھیاں چلتی تھیں اور آخرت کے سب چراغ گُل کر دیے گئے تھے آج اسکو معلوم ہو گیا کہ حیاتِ دُنیا تو پانی کا ایک بلبلا تھا جس کے اندر غرور کی ہوا زور کر رہی تھی وہ ٹوٹ گیا تو کچھ بھی باقی نہ رہا"۔

اَیْنَ الْمُلُوْكُ الْمَاضِیَةُ۔ بَانُوْا قُصُوْرًا عَالِیَةً۔ صَارُوْا عِظَامًا بَالِیَةً۔ (کہاں ہیں گزرنے والے بادشاہ، جنہوں نے اونچے اونچے محل بنائے تھے وہ تو بوسیدہ ہڈیاں ہو گئے)

"ا"
الف خالی

(از رسالہ صوفی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء)

حرفوں کی فوج کا کمانڈر سب کے آگے کیا تنا ہوا سیدھا کھڑا ہے۔ اس کا نام الف ہے۔ اور بچے اس کو الف خالی پڑھتے ہیں۔

حرف جتنے ہیں سب اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی شریک نہیں۔ الف کو بے سے غرض نہیں بے تے سے سروکار نہیں رکھتی تے جیم اور دال سے بے تعلق ہے۔ لیکن معانی کا مقابلہ پیش آتا ہے تو یہ سب حرف آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور موقع موقع کی کمینگاہوں میں پرے جما کر نمودار ہوتے ہیں۔

حروف کا حال اور ہے اور قال اور۔ حال تو یہ ہے کہ ان کی شکل مفرد نظر آتی ہے اور قال میں ہر حرف کسی حروف کا مرکب ہے۔ مثلاً اس مضمون کے عنوان کو دیکھئے۔ سب سے اوپر ایک صورت "ا" کی ہے۔ اس کو دیکھو۔ اور زبان سے نہ پڑھو۔ تو ذہن میں مفرد دیکھ ہے۔ لیکن جب زبان سے پڑھوگے تو الف۔ لام۔ فے۔ تین حرفوں کی ترکیب سے ایک ذات مرکب معلوم ہوگی۔

ایک دن میں نے سپہ سالار افواج حروف سے دریافت کیا کہ "ہو آر یو؟ تم کون ہو؟" الف نے جواب دیا "آئی ڈونٹ نو" میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔

میں نے کہا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری ایک شکل و صورت ہے۔ تم سے دنیا کی بول چال میں زندگی پیدا ہوتی ہے ہر حیوان ناطق تمہارا محتاج ہے۔ تم نہ ہوتے تو سارا جہان گونگا ہوتا۔

الف بولا۔ جناب عالی! آپ کو میرے وجود کی تحقیقات کا فکر ہے۔ اور میں درد عشق سے تڑپ رہا ہوں۔ اس بیکلی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور بے اختیار یہی زبان سے نکلتا ہے۔ کہ میں آپ کے سوال کے متعلق کچھ نہیں جانتا +

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مکتب کے ایک بچے نے پڑھا۔ الف خالی بے کے نیچے ایک نقطہ۔ مجکو تو یہ صدا معمولی معلوم ہوئی۔ مگر الف آہ کہکر بیتاب اُٹھا +

تعجب۔ حیرت۔ تو کیوں بے قرار ہوگیا۔ بے کے نقطے نے تجھ پر کیا اثر ڈالا +

نہیں مجھے بے کے نقطے سے تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھ کو اس کا ملال ہے کہ میں خالی ہوں۔ ہائے میں خالی نہ تھا۔ مگر اب خالی ہوں۔ میں اکیلا نہ تھا۔ مگر اب تنہا ہوں۔ تم نے وصل کی لذت ہی نہیں چکھی تو فراق کی تلخی کیا سمجھو گے۔ میں وصال کی بہار دیکھ چکا ہوں۔ مجکو یہ زمانہ میسر آچکا ہے +

آہ اب خالی ہوں۔ بچے بھی خالی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہجر بڑی بلا ہے۔ اسکی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اس ہجر کی ہے جس میں آرزوئے وصل ہوتی ہے۔ اور دوسری وہ جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ یہ بہت سخت ہے۔ ناقابل برداشت ہے۔ پہلی قسم میں صرف شوق و اشتیاق ہوتا ہے۔ ارمانوں کے ولولے طوفان اُٹھاتے ہیں۔ آنکھوں کو رُلاتے ہیں۔ آنسو برساتے ہیں۔ دل میں تڑپ ہوتی ہے۔ اُمیدیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ مگر یہ تکلیف نہیں ہوتی جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ وصل کے بعد جو ہجر ہو وہ گذشتہ ذوق شوق کو سامنے لاتا ہے۔ تخیلات و تصورات سے نقشے بنواتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں دیتا ہے اور دل و جگر پر چرکے دلواتا ہے +

میں مدت مدید تک لطف یکتائی اُٹھا چکا ہوں۔ میں اس کا بن چکا ہوں۔ وہ میرا بن چکا ہے۔ جس کی یاد میں آج آگ کے بستر پر لوٹ رہا ہوں +

الف! جی کو سنبھال تو اتنا کیوں بے چین ہوتا ہے۔ ہم نے تو ہمیشہ تجھ کو خالی ہی

پایا۔ کبھی کسی کو تیرا شریک زندگی نہ دیکھا۔ خبر نہیں تو کسکو یاد کرتا ہے۔ کس کی یکجائی کا نغمہ گاتا ہے ۔

کیا وہ بھی کوئی الف تھا۔ یا وہ کوئی نقطہ تھا۔ یا اور کوئی ایسی چیز تھی جس کی فرقت تجھ کو ستاتی ہے۔ اور یہ فریاد زبان سے نکلواتی ہے ۔

ہاں تم نے اس کو نہیں دیکھا۔ ہاں کسی نے بھی اسکو نہیں پایا۔ وہ حسین نہ تھا جسکو دوسرے حسن پرست دیکھ سکتے۔ اس میں رعنائی و ناز و انداز نہ تھے جس پہ کسی غیر کی نظر پڑتی ۔

تو پھر وہ کیا تھا۔ بتا کہ وہ کب تھا۔ اور اب کہاں ہے۔ سیدھے سادے الف کیا تیرا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تو کیسی بے سر و پا باتیں کرتا ہے ۔

الف چپ ہو گیا۔ اس کی حیرت خیز خاموشی عالم تصویر بن گئی۔ اور اس کے آگے سب حروف اس بت سکوت کو غم کی نگاہ سے دیکھنے لگے ۔

سنو۔ الف خود بخود کچھ کہہ رہا ہے۔ دیوانوں کی طرح بہک رہا ہے اور بڑبڑا رہا ہے

"میں ایک ہوں۔ میرے معنی بھی ایک ہیں۔ میری شکل بھی واحد ہے۔ میں مثال وحدت ہوں۔ میں خیال یکتائی ہوں۔ مگر آہ کثرت کے جیلخانے کا قیدی ہوں۔ دور ہوں مہجور ہوں۔ رنجور ہوں ۔

پیاری بے۔ نقطے والی بے۔ اپنے نقطے کو دور کر دے تو حرف موہوم اور خط بیکار رہ جائے۔ میں حبیب سے اپنے پیارے نقطے سے جدا ہوا ہوں۔ جدا تو ہوں موجود ہوں۔ فنا نہیں ہوا۔ نابود نہیں ہوا۔ کاف۔ نون میرے رقیب ہیں۔ کن ہنگ آئے۔ اور میرے پیارے کو بہکا کر لے گئے ۔

اس کا وعدہ تھا۔ میں تیرا ایک رہوں گا۔ وہ اقرار کر چکا تھا۔ مگر حمد و محمود کے انجانے کن کو مدد گار کیا۔ اور کن نے آتے ہی سب اقرار بھلا دیئے ۔

آہ۔ وہ بھوتا نہیں تھا۔ بھول چوک سے پاک تھا۔ ہر چیز پر قادر تھا۔ وہ مجھ سے کیوں جدا ہو گیا۔ یہ کیا اس کے جی میں آ گئی +

میں الف ہوں۔ وہ بھی الف تھا۔ کن سے پہلے وہ میرے ہاں تھا۔ میں اس کے ہاں تھا۔ میں وہ تھا۔ وہ میں تھا۔ میں تن تھا۔ وہ جان تھا۔ وہ تن تھا۔ تم نے کہا۔ میں اور میرے تحت حروف انسان کی زبان ہیں۔ وہ ہمارے ذریعے بولتا ہے۔ حرفوں کی ترازو میں مطالب تولتا ہے۔ تم نے غلط کہا۔ نہیں تم نے صحیح کہا۔ بتا نا میں نے کیا کہا +

میں دیوانہ ہوں۔ مستانہ ہوں۔ تم اے آدمیو میرے ذریعے بولتے ہو۔ میں کس کے سہارے بولوں؟ میرے پاس حرف نہیں ہیں۔ میں کس کے الفاظ بناؤں۔ اور کس چیز سے اپنے مطالب کو اس کے سامنے لے کر جاؤں +

اگر وہ حرفوں اور لفظوں کا محتاج ہے۔ تو میرا مطلوب کیوں بنا ہے۔ خالی ہاتھ والے کے دل میں کیوں آیا ہے +

اور اگر وہ ان ذریعوں کی پروا نہیں رکھتا تو اقرار پورا کرنے کیوں نہیں آتا۔ مجھ کو اپنے پاس کیوں نہیں بلاتا۔ یہ دیوار کیوں چنوائی ہے۔ یہ کیا اس کے جی میں آئی ہے +

الف ہوشیار ہو۔ لام کو دیکھ۔ میم کو دیکھ واؤ کو دیکھ سب خالی ہیں۔ ک۔ ع۔ ص۔ س۔ و۔ ر۔ ط بھی تیرے جیسے مہجور ہیں۔ تو اکیلا خالی نہیں ہے۔ اور بھی ہیں +

ہاں اور ہیں۔ مگر ان کی تنہائی اور میری تنہائی میں فرق ہے۔ وہ بلبل ہیں۔ میں پروانہ ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ ہیں۔ میں دروازوں کے تیروں کا نشانہ ہوں +

الف کی یہ سب بے معنی غیر مفہوم مگر مزے دار باتیں سن کر میں نے بڑا تعجب کیا کہ تصوف سے تعلق رکھنے والی بے نتیجہ باتیں بھی اتنا کیف رکھتی ہیں۔ تو با نتیجہ حالات میں کیا سرور ہوگا۔ طالبوں سے کہو اندر آ کر دیکھیں۔ اور اس تک پہنچیں۔ جس کے سایہ اور عکس کی یہ ادنےٰ اسی کیفیت ہے +

یورش

ارواح کی اجسام پر

(از رسالہ صوفی جون ۱۹۱۴ء)

سفید سورج کی روح حرارت، کالی رات کی روح برودت، بہتے پانی کی روح حیات۔ کھرٹے کنارے کی روح نظر بازی۔ حیوان کی روح نادانی۔ انسان کی روح دانائی +

دیکھنا۔ آپس میں کیا سرگوشی کرتی ہیں۔ کس شاندار مہم کے لیے سازش کر رہی ہیں
تلک الایام نداولہا بین الناس کا خدا بھلا کرے جس نے اس مخفی جوڑ توڑ کی خبر دیدی۔ ورنہ خبر نہیں کس قیامت کا سامنا ہوتا۔ سورج کی روح نے کہا میں نے اجسام زمین۔ قمر۔ مریخ۔ مشتری۔ زہرہ وغیرہ کی پرورش میں عمر تمام کر دی مگر ان پتلوں نے میرا ایک گن نہ مانا۔ ہے شرط کہ ان سب کو نظر قہر سے فی النار کر دوں۔ شب تاریک کی روح بولی۔ میں اصل بنیاد کل کائنات کی ہوں۔ اجسام کی پردہ پوش ہوں لیکن اب اجساد کی شیطنت حد سے بڑھتی جاتی ہے۔ کیوں نہ میں ان کا پردہ فاش کر دوں +

رواں دواں پانی کی روح نے بہتے بہتے آواز دی کُلَّ شَیءٍ حَیٍّ من الماء +
ادیات کی مورتوں سے کہہ دینا کہ احسان فراموشی کی تو زندگی وبال جان بنا دوں گی +

کھرٹے کنارے کی نظر باز روح چنگھاڑی اگر بدن وقت منتظر سے انکاری ہے تو اس کا ملیا میٹ کر دینا مجھے کیا بھاری ہے +

حیوان کی نادان روح پکاری۔ مجھ میں عقل نہیں۔ جو تمہاری رائے وہ میری۔

انسان کی دانا روح گویا ہوئی "انا ربکم الاعلیٰ" میں نے امانت خاص کو وزش پر رکھا ہیں کن کی عملداری قفس خاکی میں رہی تو کیا یہ اجسام مجھ کو بھول کر سلامت رہ سکیں گے۔ کہدو۔ ناممکن۔ ناممکن ناممکن +

اس مشورت کا انجام نتیجہ۔ حاصل۔ ایک یورش ہوگی یلغار۔ خونخوار۔ اور حملہ پر خروش ہوگا +

اُٹے بدنو! اے دُنیا کے مادّی جسمو! تم نے اپنے بچاؤ کی کیا صورت اختیار کی ہے؟

امریکہ کا جواب:۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے! ورنہ میں نے تو مادہ پرستی اور تن پروری کو چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ امورِ روحانی کے آگے میرے باشندے سر جھکاتے جاتے ہیں +

یورپ کا اظہار۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ارواح موہوم کی یورش کو دیکھ لیا جائے گا۔ میرے اندر ہنر ہے۔ اور کاریگری ہے۔ جس سے ہر روح اسیر پنجۂ مادّی ہو سکتی ہے۔

چین کا بیان۔ میرا تو رنگ ہی زرد ہے جو پرتوِ روحانی کی شہادت دیتا ہے۔ میں نے تو عیسائی مذہب کے لیے خدا سے اسی لیے دُعائیں مانگی تھیں کہ برکت روحانی میری مشکلات کا خاتمہ کر دے۔ آیندہ بھی کسی حکم روحانی کی تعمیل سے انکار نہیں +

ایران کی فریاد۔ دیکھنا۔ میں پہلے ہی ویران ہوں۔ ایران نہیں ہوں۔ مُلبل کی روحانیت تلے جیتا ہوں۔ مجھ پر تو نظر کرم ہی رکھنا +

افریقہ و عرب کی گفتگو۔ مت گھبراؤ اے روحو! ہم تمہارے ساتھ ہیں تمہارے دشمنوں کا مقابلہ سب سے پہلے ہم کرینگے +

ہندوستان کا جواب۔ ست گرو کے چرنوں کی قسم! میں پرماتما کا جوگی بروگی ہوں۔ لڑنے جھگڑنے کا تو وعدہ نہیں کرتا یہ جگرا تو عرب و افریقہ کا ہے

ہاں دل سے تم سب ارواح کا ساتھی ہوں۔ پرماتما تمہاری بھلی کریں +

فیصلہ

عالم جبروت میں یہ حکم کلام کر چکا۔ تو صدائے ہاتف نے ارشاد فرمایا کہ مدوناسوتیوں سے۔ ارواح ہوں یا اجسام۔ کہ ہم منتقم حقیقی ہیں۔ ذرہ ذرہ کے اقرار و انکار کو تول رہے ہیں۔ لینے دینے کا وقت بھی قریب آگیا ہے۔ آپس میں دست و گریبان نہ ہو۔ ہماری ترازو کا کام ختم ہو لینے دو۔ ڈراپ

پلکیں تھرتھرائیں۔ پتلیاں اشکبار ہوئیں۔ کان وجد میں آئے۔ دل و دماغ محو ہوگئے۔ جب یہ سب دیکھا۔ سنا۔ اور ڈراپ سین کو گرنے سے نہ روکا +

خطیب کا غذ فام

(از اخبار خطیب دہلی، ۷ جنوری ۱۹۱۵ء)

تین سیڑھی کے ممبر قدیم پر زبان بولتی تھی۔ اور خطیب کہلاتی تھی۔ آج ممبر جدید کی شکل تو ویسی ہی تثلیثی ہے مگر اس پر کاغذ فام خطیب قلم کی زبان سے چہچہاتا ہے +

جن کو لغت کی بحث کرنی آتی ہے وہ کہیں گے کہ خطیب عربی کا ایک جامع لفظ ہے جو ہر اچھی بات کے دہن فصیح سے نکلنے پر صادق آتا ہے۔ اس لیے اخبار خطیب۔ مذہب۔ تمدن۔ ڈرامہ اور ان کہی چیز پر جس کو کان میں سنا جائے تو سیاست و پالٹیکس کی آواز آئے بحث کر سکتا ہے +

میں نہیں جانتا کہ ان اخبار فروشوں نے خطیب کے کیا کیا مقاصد تجویز کیے ہیں۔ اور جو بھی ہوں مجھے اس سے کیا۔ میں تو اپنے کاغذ فام گلفام کو ایک پیشگی بوسہ بھیجنے کے لیے حرفوں کا توڑ جوڑ کرنا چاہتا ہوں +

خطیب کا غنچہ فام ہے نہ ابھی جدائی کی راتیں دیکھی ہیں۔ نہ مرادوں کے دن پائے ہیں۔ ابھی تک خدا نے بُری نیت کے شاعروں سے اس کے دامنوں کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ مگر کب تک؟ بتِ ہرجائی انگشت نمائی سے محفوظ رہے گا۔ شمع بنے گا تو بے شمار پروانے فدا ہونے نکل ہی آئیں گے۔

کیوں! پیارے گلفام۔ ابھی تو تم فتنہ ہو۔ فتنوں کے زمانے میں خدا رکھے پروان چڑھنے نکلے ہو۔ جب قیامت بنو گے اُسوقت تو بھلا ہم غریبوں سے کہاں آنکھ ملاؤ گے۔ پر آج تو ایک نگاہِ طفلی سے اِدھر دیکھو اور ننھے ننھے ہونٹوں سے کچھ گل افشانی کرو۔

ہاں ہاں۔ میں نے سُنا۔ واہ کیا بات ہے کیا گھات ہے۔ ماشاء اللہ سبحان اللہ مگر ان ندیدے لوگوں کو تمہاری زبان میں نہ سُننے دوں گا۔ اپنی زبان میں صدائے بازگشت کے طور پر سناؤں گا۔ تاکہ تمہاری کنواری آواز میرے ہی لیے مخصوص رہے۔

صاحبو! دل جان خطیب تم سے یوں خطاب کرتا ہے۔ پروانو، مستانو، دیوانو، ہوشیار باش۔ بیدار شوید۔ سمندر فضائے آسمانی میں بہنا چاہتا ہے۔ تو وہ خاک اپنے ذروں کو موجوں میں لانے آتا ہے۔ اس کام میں اس کا ہاتھ ہے جو جگانے آتا ہے۔

اب کا غنچہ کی جنس میں ایک نوع خصوصی جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اس کی ہر ادا گوشِ ہوش کے لیے انمول ہوتی ہے۔ وہ علم کے دریچوں میں عمل کے فانوس روشن کرے گا وہ سنسان ویران محفلوں میں طوطیِ شکر مقال بنے گا۔ اور اس کی پہلی صدا یہ ہوگی:۔

حق ہے باری تعالیٰ۔ حق ہے کبلی والا حق ہے سب کا حق۔ حق نے حقوق کو پیدا کیا۔ اور بندوں کو ان کی شناخت اور گرفت پر شیدا کیا۔ حق ہی نے کہا۔ کون اس امانت کا حق دار ہے۔ حق ہی نے جواب دلوایا کہ یہ بندۂ آدم اس نعمت کا سزاوار

ہے وہ امانت اسکو مل گئی۔ جو سرتاسر حقوق میں غرق تھی۔ اور عشق اس گھٹا کی برق تھی +

آدم نے خالق دم کی امانت کو سینے سے لگایا۔ حقوق کے جواہرات سے جڑے ہوئے زیور کو گلے کا ہار بنایا۔ جب آدم کہلایا۔ ہر حق میں طلب کی جھلک تھی اور ہر جھلک میں ایک پلک تھی۔ اور ہر نوک میں ایک کھٹک تھی۔ ہر کھٹک میں تلخی و شیرینی تھی۔ اور اسی تلخی و مٹھاس پر دُنیا کے کاروبار تھے +

کبھی دیکھا کہ حقوق اللہ کے مطالبے ہیں۔ اور نفس و شیطان اس کی کڑواہٹ سے منہ بناتے ہیں۔ کبھی سُنا کہ حقوق العباد کی پکار ہے۔ اور ناحق شناسوں کی حالت زار و نزار ہے +

حقوق اللہ کہتے تھے۔ پہلے حقوق بندگان کی حفاظت کرو۔ کہ ہم بھی اسی پیکر کی روح رواں ہیں۔ حقوق العباد آواز لگاتے ہیں۔ کہ نہیں۔ ہم بھی سایۂ رب کے اُمیدوار ہیں +

خبر نہیں ان دونوں میں کسر نفسی کون کرتا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہر ایک صداقت و راستبازی کا پُتلا تھا +

خطیب کا غذ فام حقوق فریقین پر نظر ڈالے۔ تو اس کو رفتار۔ کردار۔ گفتار کے بے شمار میدان مل جائیں۔ اور ہر گھر کے نیک و بد انسان اس کی بات سننے باہر نکل آئیں۔ مگر صاف بات ہے۔ میں اس وقت اس کے پاس بھی نہ جاؤں گا۔ ہر جائیوں کی بیوفائیاں دیکھ چکا ہوں۔ بھلا میں اس کے قابو میں آؤں گا۔ وفا اور ایک دو گیری ایک حق مشترک ہے۔ جس کو عبد و معبود دونوں اپنا بناتے ہیں۔ کیا یاد نہیں کہ برٹش سرکار کے کانٹے لفظ وفا کو وعدہ کی چاٹ پلاتے ہیں +

خود خدا کا بیان ہے کہ وفا میرا اصلی ارمان ہے۔ جس کی خاطر بنایہ سارا جہان ہے

جو بے وفائی کرتا ہے۔ مشرک کہلاتا ہے۔ اور بارگاہ الٰہی سے بڑی سزا پاتا ہے۔ حکومت بھی بے وفاؤں کو پھانسی پر لٹکاتی ہے۔ سوسائٹی بھی ایسوں کو منہ نہیں لگاتی ہے پھر میں کہ عبد و معبود کا ایک ثالث تماشائی ہوں۔ کیونکر اس متعدی خواہش کا شریک نہ بنوں +

جو خطیب ہر مستانی آنکھ کا تارا ہو۔ وہ میرا کیونکر دل آرا ہو۔ میں تو خدا کی ہر عزیز چیز پر بھی بدگمان سا ہوتا جاتا ہوں۔ جب وہ اپنے حقوق کی باز پرس کرسکتا ہے تو مجھ کو بھی اجازت ہونی چاہیئے کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کروں۔ اور پوچھوں کہ تمہارے لیے تو مجھ جیسے بے شمار ہیں۔ مگر تم میرے لیے یکتا و فرد ہو۔ پھر کیا معنی کہ تم اپنی یکتائی وحدت کے جلوے اوروں کو بھی دکھاتے ہو۔ یا تو میرے لیئے مخصوص ہو جاؤ۔ اور ایک صفت میرے واسطے رزرو کردو۔ یا مجھ سے یہ تقاضا نہ کیا کرو کہ ہمارے سوا کسی اور پر نظر نہ ڈالنا +

خیال تو بہت کچھ آتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ دل خدا کے قبضہ میں ہے۔ جب ایک مہم تیار ہوتی ہے۔ دل اس کو پراگندہ کر دیتا ہے +

یہ خطیب بھی کا غذی دِل ہے۔ کس کو خبر ہے کہ خدا اس سے کیا کام لے گا اور کن کن کے مجوزہ نقشے برباد کرائے گا۔ تو لاؤ اپنے ارادے کو ابھی سے آپ کے سامنے رکھ دوں۔ اور کہوں کہ اے کاغذ فام خطیب! جب تو بندوں کو ان کے مذہبی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ آئینی حقوق یاد دلاتا اور سکھاتا ہے۔ تو ذرا ان سے بھی کچھ کہیو۔ جن کا تو پیام رساں ہے کہ وہ بھی اپنے دست توانا کو حرکت میں لائیں۔ اور بندوں کو خطیب کی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دیں۔ اور قدرے حسن نظامی کو اسیری تخیلات سے آزادی بخشیں +

پارہ دنیا میں
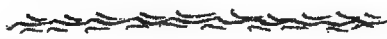
جھینگر کا جنازہ

(از خطیب ۷ رمئی ۱۹۱۵ء)

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اُتارتا تھا اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا ⁺

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کے ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا۔ کیوں رے شریر۔ تو یہاں کیوں آیا؟ اُچھلکر بولا۔ ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ۔ تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ۔ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اُٹھانیوالے گدھے ہیں۔ جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے ⁺

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اسکی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے۔ جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں ⁺

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی یہ بات سُن کر مجھ کو غصہ آیا۔ اور میں نے زور سے کتاب پھاٹک مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا

ہو گئے۔ بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں +

لیاقت تو یہ تھی۔ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے +

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسلخانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے۔ اور اسکو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں +

جمعہ کا وقت قریب تھا خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے۔ نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے +

بیچارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوں گے +

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں +

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دُنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں۔ بوریہ کے نیچے۔ آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا +

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا۔ نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن۔ نہ کتے کی سی شریر چوپنج تھی۔ نہ بلبل کی مانند پھول کی عشقبازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے۔ اور عاقلوں کے واسطے جلوہ طور ہے +

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اُسی کو

ڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے۔ کہ مرّی بھٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں رہ گیا ہے۔

ہاں تو وہ جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے!" چیونٹیاں تو اسکو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کردینگی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ "ویسٹ منسٹر ایبے" یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو ؎

"جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" "قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو"

اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمہ ربانی گانے والے قوال۔ ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں۔ اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا رزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو چا۔ مگر ہم ہمیشہ رزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

مَن کہ ایک دھوبی

کاغذی گھاٹ پر

(از خطیب۔ ۳۰ جون ۱۹۱۵ء)

جاری جا میں رونق نہیں کھاتا۔ چادروں کی پیچ اُدھر کنارے پر رکھ دے۔ اور ایک چلم بھر کر لا۔

چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو +

کیوں ری ننوا کی ماں۔ دریا کا پانی گدلا۔ صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو +

دیکھ درخت کا پتہ سوکھ کر گرا۔ ہوا اُڑا کے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملے گا + چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو +

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا۔ گھوڑوں سے تیز۔ ریل سے زیادہ تابعدار۔ پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں اُجلے کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی عزت دو کوڑی کی ہو جائے +

چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو +

بھرے حقہ ماروں گھونٹ   بپتا چھا گئی چاروں کھونٹ

سُنتی ہے اس کا غذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چنری۔ چولا۔ وہ ملوا نے لائی ہے تو میری بات مان یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا۔ جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤنگا نیچے آگ جلاؤں گا۔ اور پھر یہ گاتا جاؤں گا:۔

او ——————— ھو ——————— او

کیوں رے چولے کا ٹوں تیرا میل۔ پانی اُبلا۔ جوش میں آیا۔ تو گھبرایا۔ میل کٹا۔ پاک ہوا۔ صاف ہوا۔ اب کیسی سی سی آہ +

او ——————— ھو ——————— او

چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو +

یہ تن۔ وہ من۔ تو دھوبن۔ میں دھوبی۔ سب ہیں ساجن۔ تو دھوبن میں [illegible]

چھُوا چھو۔ چھُوا چھو۔ چھُوا چھو +

سنتے رہے ہم کتنا ہیں۔ ہم [illegible]

میرے ہاتھ میں ہیں اور میں ان کو پتھر پر پٹخار رہا ہوں +

چھوا چھو۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو +

بٹرب نگر کے چودھری نے کہا۔ جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دہونے آیا تھا۔ اسلام غریبوں سے شروع ہوا۔ اور پھر غریبوں میں آجائے گا۔ تو بس ہم تم دونوں اپنے چودھری کے بیان پر مگن ہیں۔ اسلام ہم میں ہم اسلام میں۔ اور سب امیر پیسہ والے من و تو کے کلام میں +

چھوا چھو۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو +

(۳)

چھیو رام۔ چھیو۔ چھیو +

پکا پکو کر دہیں دھر دیا۔ بیچاری دہیں دھر دیا۔ تجھ سے اتنا کہا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ آگ اور جل دو بہن بھائی ہیں۔ آگ نے بابا آدم کو جنت سے نکالا جل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی۔ آدھی رات سے اس دریا میں کھڑا ہوں۔ اور پانی کا قیدی ہوں۔ جب جل نے جلایا تو اس کی بہن آگ سے کیا محبت ہو +

چھیو رام۔ چھیو۔ چھیو۔ چھوا چھو۔ چھیو +

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوے
میں میلی پیا اجلے ری میرا کیں بدھ ملنا ہوے

چھیو۔ رام۔ چھیا۔ چھیا +

کپڑے دھوئے۔ ساری عمر دریا کے کنارے گذر گئی۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا۔ صاف ستھرے اور اجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہو گی۔ اور اس تک کیونکر پہونچنا نصیب ہوگا +

چھیو رام۔ چھیو رام۔ چھوا چھو +

اچھاری۔ ذرا ایک بات اور سنتی جا۔ دیکھیو خدا آسمان کی کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا سوائے اس کے کہ اس نے کہا۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مجرا لے   جیسی جا کی چاکری ویسا وا کو دے

تو جب اس کی دین چاکری پر ہے۔ تو لامیں بھی اس دریا میں جہاز چلاؤں۔ دھیمی کیوں کہلاؤں۔ امیر البحر کیوں نہ بنوں۔ اس سے ناریں۔

کرنی کی بھرنی

ہے۔ جو کرتا ہے۔ پاتا ہے۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے۔ پیسہ ٹکے پر نیت رکھی اتنا ہی ملا۔ خیال آگے بڑھاتا۔ رام زیادہ بھجواتا +

چھیئو رام۔ چھیا رام۔ ہو اوچھیو +

اری ننوا کی ماں۔ تو تو خفا ہو گئی۔ کہاں چلی۔ لامیں روٹی کھالوں۔ تو جا مت تیرا خیال ہو گا کہ میں تیرے خفا ہونے کی پروا نہیں کروں گا۔ اری مجھ کو تو اس کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے +

سائیں باتیں مت جانیو تو سے چھوٹت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

چھی ہو۔ چھی ہو۔ چھیا۔ رام چھیا +

اری کل رات کا خواب سن۔ میں نے دیکھا۔ ایک سندر عورت اپنے بالم کو پاس بیٹھے سے دیکھ رہی ہے۔ مگر منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اتنے میں اس کا پیتم پیارا کہیں چلا گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگی۔ کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی۔ کہ پیا بچھڑ گئے +

میں نے کہا تو کون ہے۔ اور یہ مرد کون تھا۔ عورت بولی میں روح یعنی آتما ہوں اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے یہ خواب دنیا ہے۔ اور عالم اسباب ہے اس عورت کی بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے جو دوہا پڑھا

تھا۔ وہ یاد ہو گیا:

دوہرہ

سپنے میں مورے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی۔ روتی اٹھی۔ ملت رہی دو ہات

رامہ چھیو۔ چھوا چھوت چھیو ؛

ہاں ننوا کے باپو یہ تو بتا۔ تو میرا پیا۔ میں تیری پیاری۔ تو میرا دھنی۔ میں تیری دھن۔ پھر یہ پپیہا پی کہاں۔ کیوں پکارتا ہے۔ اسکو پی پی کہنے کا کیا حق ہے ؛

تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو۔ اور پیا پیاری کے نام کو انگریز بہادر سے اپنے نام لکھوا لائیو۔ اس کے بعد پپیہا کو پی پکارے گا۔ تو میں نالش کر دوں گی ؛

نہیں ننوا کی ماں یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکارنا۔ پیا کا پیار لینا آسان نہیں ہے دیکھ بھونرا کیسا کالا ہوتا ہے۔ گر پی کی محبت میں اس کے منہ کی رنگت زرد ہوتی ہے اری اس پریم کی بڑی کٹھن بٹیا ہے۔ پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے اور تو بھی خواہ مخواہ اس میں جھگڑا کرتی ہے۔ اری جن کے من میں پی بستا ہے ان کے منہ زرد پڑ جاتے ہیں۔ جا من میں پیا بسے۔ وا مکھ پیرا ہوئے ؛

جا لیجا ری۔ وہیں دھریا۔ پکا پکو کر وہیں دھریا ؛

ننوا کے باپو۔ یہ رات کو چکوا چکوی۔ آپس میں کیا باتیں کرتے تھے۔ میں نے تو اتنا سنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا۔ اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی۔ جب ان کے پر تھے۔ تو یہ اڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے ؛

دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آن کر جل جاتا ہے کہیں بلبل پھول کو گلے لگاتا ہے۔ لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے۔ کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے تنکا کہربا پر فریفتہ ہے۔ دیدار پاتا ہے

تو لپک کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوے چکوی کو نہ ستانا۔ وہ خود محبت کے ستائے ہوئے۔ جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں +

چھیدو رام۔ چھیدو چھیدو +

ننوا کے باپو! تو نے کل کہا تھا۔ یثرب نگر میں ہمارے چودھری سارے سنسار کے تنوں کو دھونے آئے تھے۔ اس کا بھید مجھ کو بتا۔ کہ یہ کیا بات تھی +

او ہو۔ تو تو بڑی مورکھ ہے۔ چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید سمجھ میں آجائے گا۔ قوال گا رہے تھے :-

میری میلی گدڑیا دھو دے

دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دُنیا ہے۔ خود ہمارے وجود ہیں۔ اور ان گناہوں اور شک و شبہ کے دھبوں کو صاف کرنے کے لیے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے۔ اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں۔ ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا۔ جس نے سارے جہان کے دھبے دور کر دیے۔ اور یہ سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں بےچارہ غریب دھوبی کا غذی گھاٹ پہ کپڑے دھونے آیا ہوں +

(از خطیب۔ ۷ راکتوبر ۱۵ء)

جیب میں چاندی۔ بدن میں صحت۔ دل میں جذبات اور عقل میں عروج ہو۔ تو شملہ آؤ۔ انگریزی میں یہ شملہ ہے۔ ذرا کھینچ کر پڑھو تو سیم لا ہے جس کی معنی طلب!

نقرہ میں محو ہیں +

میں آیا تو جیب خالی۔ بدن ناتواں۔ دل جذبات سے معرا۔ عقل زوال پذیر۔ کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کے سہارے اس اونچے پتھر خانہ میں آتا۔ مگر دیکھتا ہوں۔ کہ آ گیا۔ حجرہ نسخ محمدؐ میں ٹھہر گیا +

یہ وہ وقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب پیشوا سیاسی و علمی اس کوہ نور پہ جمع ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یونیورسٹی لینے آیا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ رزولیوشن پیش کرنا اور جواب میں نغمۂ دلربا سننا ہے۔ کسی کو مال روڈ پر گشت لگانا اور ہوٹل میں جانا آتا ہے۔ کوئی زندگی کی دریدگی میں ہوائے شملہ سے رفو کرنے آیا ہے +

چاند زوروں پر ہے۔ آدھے دن اِدھر۔ آدھے دن اُدھر۔ تیرھویں چودھویں کا سماں ہے۔ رات کو آسمان منہ دھوکر بے پردہ نکل آتا ہے۔ چاند تاروں کی فوج کو قواعد کراتا ہے۔ غیر فوجی بندہ اپنے حجرے کے جھروکوں میں بیٹھا ان نورانی ہستیوں کی نیزہ بازی دیکھا کرتا ہے۔ سردی باہر نکلنے نہیں دیتی۔ آتشدان کی ملکہ چاند کی قدرتی رقیب ہے۔ اس کے پاس رہتا ہوں تو چاند کے پہلو میں کیونکر جاؤں +

کل چاندنی لرز لرز کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی۔ اور میں سوچتا تھا جب وہ پھسل کر غاروں میں لڑھک جاتی تھی۔ غار گود کھولے بنت القمر کی یاد میں بیتاب نظر آتے تھے۔ اور جب اس تابانی کو پاتے تھے تو اپنے اندر کی سب مخفی حالتوں کو نمایاں کر دیتے تھے +

کہتے ہیں یہ وہ پہاڑ ہے جو سینکڑوں کوس اسی طرح اونچا نیچا چلا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ وہ پہاڑ ہے جس کے ہاتھوں میں سارے ہندوستان کی دنیاوی قسمتیں ہیں۔ جو اس پہاڑ کے سینے پر جو تار ہیں ان کی بجلی تمام ہندوستان کی موت و حیات پر حکمرانی کرتی ہے۔ ابھی پہاڑ کی گود میں جو ریل چلتی ہے وہ لاکھوں میل سے ہند کی زندگانی کے

پیے آب حیات لیجاتی ہے یا ہر ایک کو اس کے نامۂ اعمال پہونچاتی ہے۔ ہونگے،
اس شملہ سے اور بھی اونچے پہاڑ ہونگے۔ مگر نصیبے میں اس سے اونچا کون ہے
اقبال اس سے بڑھکر کس کا ہے۔ سب راجہ پرجا اس سنگ خانہ میں کھنچے چلے
آتے ہیں*

میں پوچھوں۔ کیوں جناب آپ نعرہ لگاتے تھے۔ انا سیم۔ اور میں بغیر سیم کے
آپ کے پاس آگیا تو یہ پہاڑ کیا جواب دے۔ ممکن ہے کہ تیوری چڑھائے اور
میری بے عقلی پر قہقہہ لگائے۔ مگر میں اسکی کچھ پروا نہیں کرتا۔ اور کہتا ہوں کہ بغیر سیم
کے بھی سیم لا دیکھنے میں آسکتا ہے۔ اگر توکل خالق مس و سیم پر ہو*

حضرتِ کُن

از صوفی ستمبر ۱۹۰۹ء

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرتِ کن پیدا ہوتے ہی رحلت فرماگئے۔ اور
اب دُنیا میں ان کا نام ہی نام باقی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات
کا وجود ان ہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مرجاتے جہان سے گزر جاتے
تو فیکون کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو ان کی موت کا شبہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ انھوں نے اپنی
پیدایش کے وقت دکھایا تھا وہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ انکی پیدایش سے پہلے نہ آسمان تھا
نہ زمین۔ اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیز ہیچ آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں اور یہ میاں آدم
بھی جو آج حضرت کن کی زندگی پر بحث کررہے ہیں ظہورِ کن سے اول غائب تھے۔ مختصر بات
یہ ہے کہ ناپید اور عدم کا لفظ بھی گم تھا*

حضرت کن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانۂ
مخفی میں خودنمائی و خود آرائی کا جذبہ اٹھا اور اس جذبہ نے سکوت معدوم کے دریا
میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی۔ خواہش نمود کا بادل گرجا۔ اور برسوں کی قید شدہ بجلی
نے بادل سے باہر آکر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرت کن[۱] کو ولادت کا شرف عطا
کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوش وہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے۔
هو حق سناٹے میں زور سے تجلی ہوئی اور سایہ نمودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے
گردش کرتا تھا۔ اور موجودہ عالم کی رنگا رنگ شکلیں اس میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی
جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم جگہ قایم ہو گیا۔
اس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلی ہوئی۔ نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا اسواسطے
بعض آدمی کہتے ہیں۔ کہ حضرت کن چل ہی بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے۔
لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولانا کن کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ ورنہ وہ زندہ ہیں
اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ پرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے
جناب کن نہ ہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں ہمارا تو اسپر ایمان ہے کہ
حضرت کن زندہ رہیں گے اور مرنا ان کے لیئے محال ہے۔ کلام ہے تو اس میں ہے
کہ آیا ان کی ولادت کی ضرورت بھی تھی یا نہیں اور جب وہ پیدا ہو گئے تو ان کا
وجود کچھ کام بھی آیا یا یوں ہی افشائے راز کا موجب ثابت ہوا۔
اس معاملہ میں دو خیال ہیں۔ حضرت کن کے حامی جو آرایش عالم کی ظاہری
بہار کے شیدا ہیں کہتے ہیں ۔۔۔ کن نے بڑا احسان کیا جو ہم کو راز کے بند صندوق سے
باہر نکالا۔ اور عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ مگر گروہ مست قلندر جناب کن کا بہت

---

[۱] یہاں وہ ولادت مراد نہیں جہاں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی ولادت سے قرآن شریف
کی سورۂ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے۔ ہم اس منکر کو سچا جانتے اور ڈنکے کی چوٹ ولادت کی تشریح کرتے ہیں۔ حسن نظامی

شکوہ گزار ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکون و حدت میں طوفان آتا۔ خشک و تر۔ خیر و شر۔ جان دار و بے جان۔ سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے"

اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں۔ اور شہروں کی رونق و چہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل و شور سے اکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی و خاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے۔ میں خود اپنی اُفتادگی سے نالاں ہوں۔ نقل مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا۔ سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا۔ غریبی اور امیری۔ نیکی و بدی۔ سب اس کی جان کے لیے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اسکو کن کے سبب آزردہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے۔ طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پر لطف بن جاتی ہیں کہ عالم یک جائی میں ان کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا"

(از صوفی۔ جنوری ۱۹۱۳ء)

سردی کا موسم درحقیقت روئی کا موسم ہے۔ جہاں یہ دن آئے چاروں طرف روئی کی گوری گوری اُجلی صورت نظر آنے لگی۔ انگریزوں اور ان کی ریس کرنیوالے ہندوستانیوں سے ہمیں بحث نہیں جو روئی کا استعمال فیشن اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور بھیڑ کی اُترن پہننے کو اپنا فخر جانتے ہیں۔ روئی خدا کی دی ہوئی سخت زمین سے

نکلا ہوا شگوفہ، اُون غریب بھیڑ کا اوڑھنا بچھونا، جس کو ظلم و بے دردی سے بزبردستی چھین لیا جاتا ہے اور اس مال مغصوبہ کے کوٹ کمبل اور طرح طرح کے کپڑے بنا کر استعمال کیے جاتے ہیں اور اس پر یہ ڈھٹائی کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی روئی کے کپڑے پہنیں ان کو ذلیل وحشی۔ غیر مہذب۔ اولڈ فیشن کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے ۔

روئی کے درخت کو دیکھنا کھیت میں اپنے سینکڑوں ہم جنس پودوں کے پاس سر پر سفید عمامہ باندھے خدا کی یاد میں جھوم رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ جس قدر پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں ان سب میں نمی اور تری پائی جاتی ہے۔ مگر روئی اپنے درخت کا ایک ایسا پھل پھول ہے جو تر شاخ میں خشک وجود کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یعنی روئی کے درخت کی جڑ۔ ٹہنیاں پتے یہاں تک کہ وہ شگوفہ جس کے وسط میں روئی ہوتی ہے سب میں تری اور گیلا پن موجود ہوتا ہے مگر روئی بالکل سوکھی اور نمی سے پاک ہوتی ہے یہ شہادت ہے خداوند تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ وہ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ آگ سے پانی اور پانی سے آگ پیدا اور نمودار کرتا ہے روئی کی جڑ پانی میں۔ ٹہنیاں سپتے۔ پانی آلود۔ مگر پھل شعلۂ جوالہ با ہمہ و بے ہمہ سب میں موجود اور سب سے الگ۔ ٹھنڈک میں پیدا ہوا مزاج گرم پایا ۔

اب ذرا اس پر غور کرنا کہ روئی کے پھول کے اندر جو مسلمانوں کے عمامے کی شکل کا ہے یہ کالی کالی سخت سخت کیا چیز ہے۔ اس کا نام ”بنولہ“ ہے جس طرح انسان اشرف المخلوقات کے باطن میں حجابات کثیف پیدا کیے جاتے ہیں۔ جو ریاضات و صحبت شیخ و اعمال حسنہ سے صاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح روئی کی باطنی کثافتیں گردش آب مشین کے اندر پوری مشقت کے بعد صاف کی جاتی ہیں۔ جب بنولے جو کہ ایک سخت و کرخت وجود رکھتے ہیں۔ روئی کے نازک اور گلفام بدن سے دور ہو جاتے ہیں۔ تو روئی کو ایک اور امتحان گاہ میں جانا پڑتا ہے اور وہ دھنیئے کی تانت

ہے جو بچاری روئی کے تن زار کا ایک ایک رُواں کھول بکھیر کر رکھ دیتی ہے اور رنگ
رنگ کا میل کوڑا کرکٹ صاف کر کے پھر سب اجزاء کو ایک جگہ کر کے روئی کا گالا بنا دیتی ہے
ایک گالے کو لو اور اسکو تولو۔ جتنا وزن اس کا ہو اسی اندازہ سے وہ روئی لو
جس کے بنولے اور کوڑا کرکٹ صاف نہیں ہوا تو تم کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا
صاف روئی نرم ہوگی۔ گرم ہوگی۔ اور جسامت میں کئی حصے بڑی نظر آئے گی۔ اور غیر صاف
شدہ روئی اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بھی جب صفائی
باطن کے بعد درجۂ تکمیل کو پہنچتا ہے تو اس کی ذات و صفات میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں

مغرب کے دُھنیے

روئی دھنکنے کا ذکر آیا۔ اون اور روئی کے درجہ پر بحث ہوئی تو لا محالہ اس پر
بھی گفتگو ہونی چاہیئے کہ اون پوش مغرب ہماری روئی کا کس قدر محتاج ہے۔ مغرب
میں ہزاروں کارخانے ہماری روئی کے بل پر چل رہے ہیں۔ سوتی کپڑے کی مانگ نہ ہو تو روئی
کے گالوں کی طرح گوروں کے گلے نہ پھولیں۔ اور پچک کر رہ جائیں۔ مگر یہ سب اہل سیاست
اصحاب کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ فقیر تو اس امر کی شکایت کر سکتا ہے کہ مغرب کا دھنیے
مشرق کی پرانی روئی کو دھنکنے کے لیے تو اس قدر بے چین ہیں کہ کاسے کو سوں روئی
دھنکنے کے سامان کندھے پر اُٹھائے ہوئے چلے آئے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اپنے
گھر کے لحاف توشک کی بھی خبر لی۔ پرانی روئی کے دُھنکنے کی دھن میں ایسے سرشار ہوئے
کہ اپنے گھر کی روئی بے حیائی شراب خواری۔ خود غرضی۔ بے رحمی کے بنولوں سے اٹی پڑی
ہے۔ اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ....

اے آدمی! اپنے وجود کی روئی کے چار بنولے جن کا تعلق اربعہ عناصر سے ہے
نکال ڈال اور ایسی تانت بجا کہ تمام جسم صدائے وحدت کی تن تن سے گونج اُٹھے اور روح

کی ملکہ تیرے پاکیزہ جسم کے نرم و گرم لحاف میں خوشنودگی و پسندیدگی سے رہنا قبول فرمائے

مثانہ بیمار کا جواب

از طبیب۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۱۴ء

انگریزی میز والے اخبار جی! مجھ سے کیا مانگتا ہے؟ میں کیا کروں۔ کیا دوں؟ طبیب اخبار بنتا ہے۔ بننے دو۔ دنیا میں ہر چیز بننے سنورنے کو آئی ہے۔ خود خدا کے جی میں یہی سمائی ہے۔ ہر ہستی نمود داری کی طلبگار ہے۔ بندہ خود اس مرض کا گرفتار ہے۔ مگر اب تو مدت ہو گئی۔ زخموں نے بہنا چھوڑ دیا۔ میں نے لکھنے پڑھنے اور اخباری آہ و زاری کرنے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ تم جانتے ہو۔ پہچانتے ہو۔ پھر کیا مانگتے ہو؟

دلی دور تھی۔ آج کل میں اس سے دور ہوں۔ سنتا ہوں کہ وہ میری طرف چلتی ہے اور کہتی ہے " دیوانہ ہنوز بیگانہ" چپاتی کا سمندر دامن پکڑنے کو دوڑتا ہے۔ کہتا ہے میری نبض دیکھو۔ طبیب کہتے ہیں! نبض کی تیزی اور حرکت بخار کی نشانی ہے۔ کہیں مجھ کو بخار تو نہیں؟ میں اس سے بھی نہیں بولتا۔ دل کو بھی جواب نہیں دیتا۔ جو اپنی حرکت بے اختیاری کے سبب تپ لازمی کی فکر میں مبتلا ہے۔ پلکوں کی جانب بھی مخاطب نہیں ہوتا۔ جو سکنڈ سکنڈ میں ٹھوکریں کھاتی اور چشم بیمار پر گری پڑتی ہیں۔ لفظوں کی دنیا میں سنا جاتا ہے۔ علم دو ہیں۔ بدنی اور دینی۔ میں نے ابھی علم کے لفظ تک کو نہیں پہچانا بدن و دین کا کوچہ بعد میں آئے گا +

دل گوشت کا ٹکڑا ہے۔ خون کا انجن گھر ہے۔ یا تخت رب العلمین ہے۔ یا مثانہ دیوانہ کا جیلخانہ ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں دماغ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔ اس میں آنکھیں کدھر ہیں۔ کان کس رخ ہے۔ ناک کس جانب ہے۔ زبان کون سے پہلو میں ہے

مجھے معلوم نہیں ٭

معدہ و جگر میں کیا تعلق ہے۔ گردہ کی کس کس سے دشمنی ہے۔ خانۂ شکم میں کن رقابتوں کا بازار گرم ہے۔ ان کو سمجھنے کا وقت نہیں نکال سکتا ٭

کیفیات و محسوسات اندرونی و بیرونی اور ملکۂ جسم یارانی بی طبیعت لامکانی سے بھی میری شناسائی نہیں۔ سنتا ہوں وہ میری عاشق زار ہیں۔ رات دن میری ہی خبر گیری و خاطر داری میں لگی جاتی ہیں۔ مگر ان دنوں مجھے ان کی طرف بھی آنکھ اٹھانے کی فرصت نہیں ہے

دلی کی گورنمنٹ ملیریا کے مچھر پکڑتی ہے اور اخباروں کے جراثیم چھوڑتی جاتی ہے اخبار روزانہ ہو تو یومیہ نوبت کا بخار ہے۔ ہفتہ وار ہو تو آٹھ روزہ۔ ہفتہ میں تین بار ہو تو تہیہ اور دو بار ہو تو چوتھیہ ٭

طبیب کے ایڈیٹر صاحب کو خدا تندرستی دے۔ مجھ غریب الوطن کی نبض پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ دردمند عشق فارسی جانتا ہوتا تو کہہ دیتا "در خیر اے ناداں طبیب" مگر یہاں تو ایسے عشق کا درد ہے جسکو دار وئے دیدار بھی مفید نہیں بہت سے شربت دیدار پیئے۔ لال بھی۔ کالے بھی۔ مگر درد قابو میں نہ آیا ٭

کل رات حکیم سقراط زہر کا پیالہ لے کر میرے پلنگ تک آئے۔ میں بیٹھے بچھے ہوئے مصلے کو دیکھ رہا تھا کہ اب کوئی دم میں مجھ کو اسپر جانا اور خدا کے سامنے سر جھکانا ہوگا بوڑھے حکیم نے ادب سے گھٹنے جھکائے اور کہا اسکو پی لو۔ بیقراری جاتی رہیگی میں نے کہا ثبوت دو کہ تم کو جام زہر آلود نے تسلی دیدی۔ شام کو وکٹوریہ گارڈن میں۔ ایک اسیر قفس طوطے نے بیان کیا تھا کہ قرار جنگل کی آزادی میں بھی نہ تھا۔ اور اس پنجرۂ آہنی میں بھی نہیں ہے۔ پھر اگر میں زہر کا پیالہ پی لوں۔ مسلمان مولویوں کے فتوے موت الحرام اور انگریزوں کے قانون خودکشی کا سزاوار بنوں۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ مرض اضطراب دور ہو جائے گا ٭

حکیم سقراط کے برابر ایک اور پیر مرد نمودار ہوئے۔ بولے میں سعدی ہوں۔ میں نے کہا جناب شیخ صاحب مجھ کو حیران نہ کیجئے اور اس حکیم کو لے کر جائیے۔ آپ نے دنیا کو خوب دیکھ بھال کر سمجھا اور میں بغیر دیکھے سمجھ گیا +

سعدی نے بغل سے ایک کتاب نکالی اور کہا اس کشفیہ میں نسخہ دیکھو۔ دم گھٹنے لگا۔ زبان بلی۔ کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے آواز دی۔ آفرین خوب جواب ہے۔ گردن موڑ کر حکیم ہربرٹ کو للکارنا پڑا۔ جاؤ گورے آدمیوں کو آفرین و تحسین دو۔ مجھے درکار نہیں بمبئی کے بازاروں میں ہزاروں بیمار نظر سے گزرتے ہیں ٹرام گاڑیاں دوڑتی ہیں اور ہر بیمار کو اس کے شفا خانے میں لے جاتی ہیں۔ میرے پاس یہ حکمائے شہرۂ آفاق خود آئے ہیں۔ فیس و نذرانہ سے انکار کرتے ہیں۔ اور غریب سمجھ کر مفت علاج کرنا چاہتے ہیں۔ اخبار طبیب ان کے نام بھی جاری کر دینا۔ ان کو نسخے خوب یاد ہیں۔ یہ سب کاغذی حکیم تھے۔ آسمانی حکیم تھے۔ روحانی حکیم تھے۔ طوفانی حکیم تھے +

میں بیمار نہیں ہوں۔ حواس باختہ نہیں ہوں عشقیہ مالیخولیا کے آزار سے آزاد ہوں۔ مولانا روم کے گندم نواز عشق کے زیر بار ہونے سے انکاری ہوں یہ تمہارا طبیب مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سے کہو خلقت عشق سے تباہ ہے اور بڑے بڑے بزرگ خضر کی صورت اس آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ابھی اس خط کے لکھتے وقت شکسپیر نے قلم پکڑ لیا۔ کہتا تھا خدا اور محبت کا بھید کوئی نہیں جانتا۔ میں نے ایک کہنی مار کر دھکا دے دیا۔ اسٹیج پر رقص کرنے والا۔ مجلس میں ناچنے والے کو سبق دینے آیا ہے۔ ارے میں خدا کو بھی جانتا ہوں اور عشق کو بھی پہچانتا ہوں۔ یہ دونوں اس ساری کائنات کے جسم و روح ہیں جسم کے عوارض اور روح کے آلام جن اخلاط سے پیدا ہوتے ہیں وہ بغیر سمجھے مجھ کو معلوم ہیں۔ طبیب بیچارے کیا جانیں۔ بلغم و سودا کے صحرا

ہیں سرگرداں رہتے ہیں۔ صفرادی تحقیقات کی محنت میں زرد ہو گئے ہیں خلفت سے کہتے ہیں۔ ہم کو حکیم صاحب کہو۔ ان کا کہنا جھوٹ نہیں۔ اور سچ بھی نہیں +

نادان خلقت کی حکمت جانتے ہیں اس لیئے سچے ہیں۔ دانا مخلوقات کی حکمت سے عاجز ہیں۔ لہٰذا دروغ گو ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان ہو۔ مگر خطرۂ جسم نہیں ہوتا۔ جان اور چیز ہے۔ حکیم طبیب کو اس سے کیا سروکار۔ جان کا راز جاناں کو معلوم ہے یا جاناں پرستوں کو۔ وہاں اگر کوئی خام کار پھنس جاتا ہے تو کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے۔ پروانہ کا سوز کبھی کو نہیں دیا جاتا +

تم سمجھے۔ جناب حکمت مآب ایڈیٹر صاحب مستانہ بہار کے جواب کو۔ ڈرتا ہوں کہ تم لیاقت طبی جتانے کھڑے ہو جاؤ۔ اور کہو۔ حسن نظامی کے دماغ میں خلل آ گیا ہے تربوز کا چھلکہ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ تربوز کا چھلکہ اُٹھاتے ہو تو وہ سُرخ سُرخ گودا بھی دو۔ جو رُخِ شعلہ صفت کا ہمشکل ہے۔ زخمی جگر کی صورت رکھتا ہے +

طب اچھا فن ہے۔ عرفان جسم کا مرشد ہے۔ جسم کی شناخت ہو جائے تو جان تک رسائی دشوار نہیں۔ جان کیا چیز ہے؟ روح کسکو کہتے ہیں؟ جو طبیب اس کی دانش کا دم بھرے وہ بے دم ہے یا بے دم ہونے والا ہے +

نئی روشنی کے طبیب جن کو ڈاکٹر کہتے ہیں تمام کائنات وموجودات عالم کو خشک ہوں یا تر۔ حیوان ہوں یا بشر۔ پہاڑ ہوں یا شجر۔ سلسلۂ جاناں میں منسلک مانتے ہیں۔ ہندو فلاسفر پہلے ہی کہتے تھے مگر ان سرکشوں نے نہ مانا۔ اب آنکھیں کھلیں تو پہچانا کہ حی وقیوم کی حیات ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے۔ موت بھی زندگی رکھتی ہے۔ طاعون اور ہیضہ جیسے ہلاکو امراض کے بھی جان ہے۔ نازک نازک کیڑوں میں اسکی پہچان ہے اب چندروز میں کہیں گے خدا کو بھی خوردبین سے دیکھ لیا۔ مگر وہ چھوٹا سا کیڑا نہیں ہے نہ بڑا سا پہاڑ ہے وہ نہ خوردبین سے نظر آئے نہ دوربین میں سمائے۔ اس لیئے میں پہلے سے

سکہہ دیتا ہوں کہ ایجاد خرد بین و دوربین سے پہلے میں نے اس کو دریافت کرلیا ہے۔ یہ ایجاد و اختراع میرے نام پیٹنٹ ہونی چاہیئے۔ مگر اخبار والوں کا قلم دریا کا پانی معترض کی زبان کون روکے۔ کہا جائے گا۔ تم سے پہلے بے شمار انسانوں نے اسکو جانا اور پہچانا۔ رجسٹری تمہارے نام نہیں ہوسکتی +

ہاں انھوں نے جانا پہچانا۔ مگر نئی روشنی کے آلات سے نہیں۔ وہ سب پرانی لکیر کے فقیر ہے۔ مجھ کو جو عینک میسر آئی ہے وہ پہلے نہ بنی تھی۔ نہ آیندہ اس جیسی بنی ممکن ہے +

میری مانو تو کہوں۔ کامل طبیب کا عندیہ حرفوں اور مریض و امراض کے تجربوں سے نہیں پہچانا جاتا۔ یہ سب ابن آدم کے کسبی وطبعی جوہر ہیں۔ کمال صفت عینی ہے۔ جو کبھی اثر بے توقع اور کبھی ضرب بے یقین بنکر نمودار ہوتا ہے۔ خدا جب چاہتا ہے کسی طبیب کو یہ نعمت دیدیتا ہے کہ خلاف امید تاثیریں اُس کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مایوس اور لاعلاج مریض ادنی کوشش میں بستر مرگ سے زندہ ہوکر کھڑے ہوجاتے ہیں +

ایک دن میں نے عزرائیل سے پوچھا۔ تم بھی زندگی کے ہاتھ سے کبھی آزردہ ہوئے ہو؟ بولے رات دن میں کئی بار یہ زحمت پیش آتی ہے۔ ایک طرف مجھ کو حکم ہوتا ہے فلاں مریض کی جان نکال لو۔ دوسری طرف طبیب کامل کے ہاتھ میں اثر دیا جاتا ہے کہ مرنے نہ دو۔ اور دیکھتا ہوں کہ خاکی انسان جیت جاتا ہے اور مجھ کو اپنی جبلت ہلاکت کی شکست سے سخت اذیت ہوتی ہے"

میں نے کہا۔ تم سمجھے بھی۔ خدا یہ دو رخی پالیسی کیوں چلتا ہے۔ جواب دیا اس کا علم مجھ کو نہیں۔ میں بولا سنو! زندگی کشمکش کامیابی وناکامی کا نام ہے۔ تم ہمیشہ کامیاب ہو تو زندگی کے انقلابات کا لطف جاتا رہے۔ یہ حکمت سنکر عزرائیل نے حسرت سے مجھ کو دیکھا اور میں نے جلدی سے اس کو قلمبند کرلیا +

تنکے کا سلوک

(از نظام المشائخ ۱۹۱۵ء)

شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا۔ درخت کے ہر پتے پر کردگار زنگار کی معرفت کے دفتر منقوش ہیں یہ سنکر جنگل کے نیم کی ایک ٹہنی کو میں نے جھکایا اور اس کے پتوں سے پوچھا۔ خدا کی پہچان کا رجسٹر کس ورق میں ہے۔ شاخ جھولکر بولی۔ تم تو ہم کو جھکاتے ہو خود جھکو تب وہ مخفی نوشتے نظر آئیں گے۔

سُنا آپ نے۔ میں اور نا ہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کروں۔ اغیار کے سامنے اس سر کو جُھکنے کی عادت نہیں۔

میرے سکوت اور پس و پیش نے نیم کی ٹہنی کو موقع دیا کہ اس نے جھنجھلا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا۔ اور دوسری شاخوں نے متحرک ہو کر اپنی گرفتار بہن کو اپنے اندر بلا لیا۔

قدم بڑھایا۔ چلوں اور کسی دوسرے عارف سے اس نکتے کو حل کروں۔ پاؤں کے نیچے دبے ہوئے گیاہِ سبز کے تنکے نے آواز دی۔ میں بتاؤں۔ سنو تو میں سناؤں میں جھکا اور اس ہین آواز کو سمجھنے کے لیے گردن خم کی۔

نیم کی ٹہنیوں نے جھکتے دیکھ کر نعرۂ شادمانی بلند کیا۔ اور کہا۔ وہ جُھکا جس کو انکار تھا۔ گھاس کے تنکوں نے ملکر جواب دیا۔ دیوانیو! یہ آدمی اس جنس کی جانب جھکا ہے جس سے بنا ہے۔ اسکو ایک دن اسی خاک میں آنا ہے۔ اور ہمارے ہی مٹیا محل میں تن گنوانا ہے۔ تم ہنسی نہ اُڑاؤ۔ یہ اشرف المخلوق ہے۔

اب میں نے کہا۔ پیارے تو ہی مجھ کو سلوک کا راستہ بتا۔ اور خدا تک پہنچا۔ تنکا بولا ایک ہو جا۔ کاغذ بننے کی مشین دیکھ۔ وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی

منزلیں طے ہو جائیں گی کہ

کرنا اور سمجھنا دیکھنے اور کہنے سے اچھا ہے

دیکھنا لکھنؤ کی پیپر مل کو۔ غریب گھانس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں پھٹے پرانے گودڑ کے چھکڑے بھرے کھڑے ہیں۔ انجن سرگرم رفتار ہے۔ پہیے گردش میں مصروف ہیں۔ بھاپ بیقراریاں دکھا رہی ہے۔ کالا دھواں اونچے مینارے سے اوپر کی طرف اڑا چلا جاتا ہے۔

تنکے کے سلوک کی پہلی منزل۔ پہلا مقام۔ پہلا لطیفہ۔ صفائی ہے۔ مشین اور حجاب غبار کی لڑائی ہے۔ لوہے کے پنجے تنکوں کو لکڑی کے تختے پر سمیٹتے ہوئے اوپر کھینچ رہے ہیں۔ اور غریب گھانس عالم بے کسی میں کھنچی چلی جاتی ہے۔

اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو سراپا گرد تھا معراج امتحان میں جا کر دیکھا تو صاف شفاف پایا۔ خاک کا ایک ذرہ بھی اس کے تن نازک پر موجود نہ تھا۔

میں نے کہا۔ لو اب بتاؤ۔ سینہ کدورت سے صاف ہوا۔ تنکا بولا ذرا ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے۔ تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم چشمے میں تنکے ڈال دیئے گئے اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے مجھے انکا گرنا اور گلنا ناگوار ہوا۔ جس طرح کہ میں ایک طالب خدا کو عروج دنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا۔

پھر دیکھا تو کرخت تنکوں میں ایک گداخت تھی۔ اُبلے ہوئے۔ گلے ہوئے پڑے تھے اب تیسرا دور شروع ہوا۔ مشین نے ان کو پیسنا اور رولنا شروع کیا اور آن کی آن میں بھرتا بنا دیا۔ اللہ تیری شان۔ وہ تنکے کی نکیلی آن۔ اور یہ بربادی و مسماری کے سامان۔

چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا جسم افسردہ کو سینے سے لگایا۔ کثیف رنگ کٹ گیا۔ سفیدی کا رنگ چڑھا۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے۔ سیاہی عارضی اور حجاب پیدا ہے۔

مقام پنجم میں یہ سفید بھرتہ اشک محبت سے پانی پانی ہوا اور آہن کے رخسا

شفاف پر پھیل گیا +

چھٹے مقام میں حرارت عشق نے اس پانی کو جمایا۔ ساتویں میں کاغذ بنایا اور سکھایا۔ اب ساتوں منزل طے کر کے تنکے نے زبان کھولی۔ گھانس سے کاغذ بنا۔ اور وید، قرآن، توریت، انجیل، زبور، پران کے حرفوں کو لے کر نوشت معرفت دکھانے لگا۔ اس قسم کی کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا +

کیوں میاں تنکے! خود مٹے۔ جب عرفانِ حق کو سمجھانے اور دکھانے کے قابل ہوئے ہمارا کیا بگڑا۔ کباب کو سوخت ہوئی۔ لذت ہم نے اُٹھائی +

تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے مگر تم خود دار اور آرام طلب رہے۔ اس لیے میں نے یہ بار سر پر اُٹھایا۔ اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے۔ لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھا لیتی۔ گائے بھینس چر لیتی۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی۔ کہ میں اُستاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف اور تم جاہل ہو +

تنکے کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ پرانے گدڑوں میں سے ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ گدڑی نے پکارا۔ درد آشنا بنانے کو آواز دی میں ناک پر رومال رکھ کر اس غلیظ ڈھیر کو دیکھنے لگا

گدڑی نے کہا۔ میں ناک ہی سے بات کرنی چاہتی ہوں۔ اور تم نے اسی کو ڈھک لیا +

صاحب میں ایک ناک والی حسینہ کا لباس ہوں۔ گو آج انقلاب دہر کے ہاتھوں اُداس ہوں +

پوچھا۔ کیوں۔ تم پر کیا بیتی۔ اس کوڑے میں آنے کی کیا اُفتاد پڑی۔ گدڑی بولی۔ میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں۔ جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک لارڈ طوائف کا پارچہ پشواز ہے۔ دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے۔ تیسرا پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے +

یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی رتبہ تھے۔ دلاری طوائف کی پشواز عیش پسند لیلا کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا چوغہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان تمام پنڈتوں کا دین و ایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سفید گلرانی کی ہم جلیس تھی۔

مگر اُفتادِ ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے اُتارا۔ کوڑی پر ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہنچایا اس نے سب کو جوڑ کر ایک گدڑی بنائی اور لباس غربت کی عزت دلوائی۔ اب بیچارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کر کے میں بھی کاغذ بنوں گی۔ اور انسان کو بتاؤں گی کہ تیری مصیبت قلب ماہیت سے دُور ہو سکتی ہے۔

یہ باتیں سُن کر میں نے نظام المشائخ کے ایڈیٹر کو دیکھا جو خریدِ کاغذ کی دھن میں تھے چاندی دے کر گدڑیاں اور گھاس کے تنکے لینے چاہتے تھے۔ اس کاغذ پر وہ عقلمندی کی باتیں چھاپیں گے اور خلقت ان حروف کو دیکھ کر ایڈیٹر صاحب کی فضیلت پر داد دے گی۔ مگر کون جانے گا کہ اگر نظام المشائخ کے سفید اوراق پر تحریر نہ ہوتی۔ سادے صفحے شایع کر دیے جاتے تو وہ اس باتونی عبارت سیاہ سے زیادہ بلیغ ہوتے بشرطیکہ کسی کو تنکے اور گودڑ کے سلوک سے آگاہی بھی ہوتی۔

(از خطیب ۴؍ مارچ ۱۹۱۵ء)

لڑائی کی خبروں میں بحری سرنگوں کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ مخفی ہتھیار جہازوں کی نقل و حرکت کے لیے بہت خطرناک ہیں۔ کیونکہ جہاز ان سے ٹکرا کر ڈوب جاتے ہیں۔

مگر اُردو زبان میں اس کے لیے بحری سرنگ کا لفظ ایک اعتبار سے درست نہیں ہے

اس لیئے کہ سُرنگ اُس مخفی راستہ کو کہتے ہیں جو ایک قلعہ سے دوسرے قلعے یا ایک
مکان سے دوسرے مکان تک کسی جنگی یا پوشیدہ ضرورت کے لیے تیار کیا جائے۔
یہ راستہ زمین کے اندر ہوتا ہے ۔

اور بحری سرنگ ایک قسم کا آلہ ہے جس میں مشتعل ہونے والے مسالے بھرے ہوئے
ہوتے ہیں اُن آلوں یا پیپوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور یہ تیرتے رہتے ہیں ۔
جب ان سے جہاز ٹکراتا ہے تو یہ پھٹ جاتے ہیں اور جہاز کو تباہ کر دیتے ہیں۔
ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ جو بیان ہوئی۔ دوسری قسم پابند سُرنگوں کی ہے جو
تاروں سے بندھی ہوئی سمندر کی تہ میں رکھی رہتی ہیں۔ اور جس وقت ان پر جہاز آتا ہے
تو ٹکرا کر تباہ ہو جاتا ہے ۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ان پابند سرنگوں کے تار محفوظ مقامات سے ملے ہوئے ہوتے
ہیں جس وقت دشمن کا جہاز ان کے اوپر آتا ہے آدمی ان تاروں میں بجلی کی رو چھوڑ دیتے
ہیں جس سے یہ سرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ

دریائی شہابے

بحری سُرنگ خواہ مخواہ سرنگ مشہور ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو بحری شہابے اس واسطے
کہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ جب شیاطین آسمان پر جانا چاہتے ہیں تو خدا کی
جانب سے ان پر آتشی شہابوں کی مار پڑتی ہے۔ چنانچہ رات کے وقت جو ہم دیکھا کرتے ہیں کہ
آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دوڑتا ہوا ایک سمت چلا گیا۔ یہ تارہ نہیں ہوتا بلکہ وہی قدرتی شہاب

آگ کا کوڑا

ہوتا ہے جو شیطانوں کے مارا جاتا ہے۔ چونکہ آجکل زمین کے بعض آدمی اس عقیدہ کی ہنسی

اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہابہ کوئی چیز نہیں۔ یہ روشنی جو نظر آیا کرتی ہے۔ زمین کی گیس ہے۔ جو اوپر فضا میں جاکر بعض اوقات روشن ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان منکروں کو سمجھانے کے لیے اللہ میاں نے خود انہی کے ہاتھ سے شہابے بنوائے اور پھر انہی کو شیطان بنا کر یہ شہابے ان پر مارے۔

حضرت خضر عالم خیال میں

آج کل یورپ کی عالمگیر جنگ درپیش ہے۔ دریائی شہابوں کا تذکرہ روزانہ اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس واسطے ایک دن عالم خیال میں حضرت خضر علیہ السلام کا تصور بندھا کہ انہوں نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا تھا اور جب حضرت موسیٰ نے اس فعل عجیب پر اعتراض کیا تو انھوں نے اسکی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مشیت الٰہی کے ماتحت میں نے ایسا کیا کیونکہ اس کا فرمان تھا کہ آگے جا کر ایک ایسا بندرگاہ آئے گا جہاں ظالم بادشاہ کی حکومت ہے اور وہ نئی کشتیوں کو غصب کر لیتا ہے۔ اسواسطے میں نے اس کشتی کو عیبدار بنا دیا۔

اس روایت سے نتیجہ یہ نکلا کہ مرضی خداوند دنیا کے کام اسباب ظاہری سے انجام دیتی ہے۔ ورنہ وہ چاہتی تو کشتی کو ظالم کے پنجہ سے اور طرح بھی بچا لیتی۔ مثلاً یہ کہ غاصب اندھے ہو جاتے۔ اس کشتی کو نہ دیکھ سکتے۔ یا ان پر کوئی اور بلا آجاتی جس کے سبب وہ ظلم نہ کر سکتے۔ لیکن پروردگار نے اس کا انتظام بھی ظاہری حیلے اور سبب سے کیا۔

پس یہ خونریزی اور تباہی بھی جو آجکل درپیش ہے کسی سبب اور باعث سے ہے مگر اس کا راز کون بتائے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو بھی بہت مشکل سے یہ بھید بتایا تھا۔

خود سر نگ بولی

مجھ کو مستغرق بحر تخیل دیکھ کر تاروں سے بندھی ہوئی سرنگ بولی۔ مجھ سے سن۔ مجھ کو دیکھ

مجھ تک آجن کو نقشوں اور جغرافیوں کی شناخت نہ تھی وہ بھی آجکل ان لکیروں تک جانتے ہیں اور ان سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ جو لڑائی کے نام سے کانپتے تھے ان کو بھی ہوائی جہازوں میں سوار ہونے کی پھریریاں آتی ہیں۔ اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھو تمہارے پاس ہوں۔ سب مجھے بتاؤ کہ تم کیا ہو۔ تم کیوں ہو؟

پابند سرنگ نے جواب دیا کہ آدمی! جو تو ہے۔ وہ میں ہوں۔ جو میں ہوں۔ وہ تو ہے۔ تو بھی فطرت الٰہی کے تاروں سے جکڑا ہوا ہے۔ میں بھی ان ہی کی اسیر ہوں تو بھی ایک اشارہ ھُو سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک گردش انگشت سے نابود ہو جاتی ہوں۔

میری دوسری بہن کو دیکھ۔ جو آزاد ہے تیرتی پھرتی ہے۔ مگر وہ بھی کشتی مرگ میں سوار ہے۔ کوئی جہاز اوپر آجائے تو اس کے وجود کا بھی بیڑا پار ہے۔

تیسری بہن کے تاروں کو بجلی نہیں ملی۔ مگر اندر کی آگ کیا کم ہے۔ ٹکر کی دیر ہے۔ ایسی بھڑکے گی کہ وہ اور جہاز دونوں گم ہو جائیں گے۔ اب جرمنی و یورپ کی بحث فضول ہے ہر ہستی موجود مثل تارپیڈو۔ بحری سرنگ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کی اندرونی طاقتوں کو دیکھے اور ان سے کام لے تو باہر کی ان تمام اشیاء کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ جو شان ابن آدم کی ہے وہ اور کسی کی نہیں۔

دو تحفوں کی رسید

(از خطیب ۳۰ جون ۱۹۱۵ء)

ایک رنگون کو جو برہما کا گاؤں ہے۔ جہاں سمندری تالاب پر تجارت کی بکریاں چرنے جاتی ہیں۔ اور جس میں آج کل سرکاری سنسر (محتسب) محبت کے خطوط کو بھی ڈل میں ہاتھ ڈالک

ٹٹولتے ہیں ۔

اس میں رسید ہے ایک تحفہ کی۔ محمود[۱]۔ یوسف[۲]۔ بھائی[۳]۔ میاں[۴] چارپتی کے پھول کی خدمت میں رسید پر ٹکسٹ ایک آنہ والا نہیں ہے۔ اور اس کا مجھے ڈر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تحفہ جان کا ہے مال کا نہیں جس پر اسٹامپ کی ضرورت ہے ۔

اقرار کرتا ہوں کہ تحفہ اس حالت میں کہ وہ بالکل کورا اور کوارا تھا مجھ کو ملا اور اقرار کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا تھا۔ اور اقرار کرتا ہوں کہ کثرت کی ہر شان میں سراپا وحدت تھا یعنی اس کا ہر جزو اپنے دوسرے اجزا کا ہم شکل تھا میں نے اس تحفہ کے چٹکیاں لیں۔ اور وہ بے چین ہو کر زمین پر لوٹ گیا۔ لہٰذا یہ چند سطرے بطور رسید الفت کے لکھ دیے تاکہ ماسوائے فراموشی ہو ۔

دوسرا ماشہ پٹیالہ کو جہاں برنالہ بھی ہے۔ اور سکھوں آریوں کے مقدمے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اور جہاں سنور یعنی بلی نام کا ایک ملک یا جزیرہ نما ہے۔ جس میں خان سراج اور دین بھی رہتے ہیں ۔

ان سب حواشی کے متن میں ماشہ نامی دیار ہے۔ اس میں میرا ایک مفتون یار ہے اس کے تحفے کی رسید کا اسوقت بار ہے۔ ست سری اکال کہہ کر میں اس رسید کو شروع کرتا ہوں۔ اور واہ گرو جی کا خالصہ اور سری واہ گرو جی کی فتح کہہ کر ختم ۔

تحفہ کی پشت پر ایک مہر ہے۔ اس میں رومی بہادر کاغذی تحریر کو پامال کر رہے ہیں اس لیے مجھے ڈر ہے کہ میرا سردار بہادر اس رسید کو پامال نہ کر دے ۔

تحفے کے ہونٹ سنہری ہیں۔ ان کو دیکھ کر میرا مٹی کا ناتھ۔ اور مٹی کی آنکھ شرماتی ہے میں مٹی کا پتلا۔ مٹی کے برتن میں پانی پیوں۔ مٹی کے ظرف میں کھانا کھاؤں اور تحفے طلائی پاؤں تو کیونکر نہ شرماؤں ۔

دیوانے دیوان سنگھ۔ کاغذی کھیل میں باطنی تفریح کو تلاش کر زندگی کی یہ تماش ہوگی

تو پوری رسید تاش ہو گی ٭

دیدم ۔ شنیدم ۔ نوشتم ۔ تو ہیں بشنو ۔ و خاموش شو ۔ کہ سکوت ذریعۂ نجات ہے ۔ دن عید ۔ اور رات شب برات ہے اہر دل ہیں منازل سلوک کی کشیدہ ہے ۔ اسواسطے پر معنی یہ تحفہ کی رسید ہے ٭

شملہ کی دیبی ماتا

(از خطیب ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

اس رات کی تاریکی میں سب سوتے ہیں ۔ میں پہاڑوں کو کیا کہوں ۔ وہ بھی بے خبر پڑے سن سناتے ہیں ۔ جن کی آنکھ کھلی ہے ۔ ان کو بت خانوں کی دھن لگی ہے ۔ ایک شراب کے گلاس کے آگے سر جھکاتا ہے ۔ دوسرا اپنے ہمشکل انسان پر مٹا جاتا ہے ۔ کہیں مردوں کی بندگی میں کمر بندھی ہے ۔ درگاہ کی قبروں پر ٹکٹکی لگی ہے ۔ یا پیر پیر کی صدائیں ہیں کہیں حور و غلماں کا خیال ہے ۔ انہی کی تمنا میں سجدہ بے نماز ہے ۔ کوئی ما پسر لڑکے غم میں گرا جاتا ہے ۔ دوزخ کی آگ کا خوف اپنے سامنے اپنی پوجا کراتا ہے ۔ بیمار کو دیکھو نیند نہیں آئی ۔ کروٹیں بدلتا ہے ۔ اور حکیم کے نسخے کو یا معبود کہہ کر سینہ سے لگاتا ہے یہ دوسرا ابھی بیدار ہے ۔ کل کچہری کا مقدمہ سر پر سوار ہے ۔ توکل کا دامن ہاتھ میں ہے یا پلیڈر یا بیرسٹر کی خیالی تسبیح پڑھ رہا ہے ۔ اُفہ یہ سب اتاڑی کتنی بھول میں ہیں آگے بڑھوں یا ٹھہر جاؤں ۔ نہیں ذرا اور آگے دیکھوں ۔ شاید کوئی حق پرست نظر آ جائے ۔ جس کی صحبت میں یہ کالی رات کٹ جائے ٭

یہ جنگی سپہ سالار ہیں ۔ فوجوں کو اڑاتے ہیں ۔ ملک جیتنے گھر سے نکلے ہیں کیسے ہوشیار و خود دار ہیں انکے دل میں کس کس کی یاد ہے ۔ یہ کس کی عبادت کرتے ہیں ۔ گولہ کی

توپ و بندوق کی۔ خندق و مورچہ کی۔ رسد کے انبار خانوں کی۔ زہریلی گیس۔ اور ہوائی جہازوں کی۔ یہاں بھی اپنا نہ ملا۔ شملہ کی کونسلوں میں آ اور رزولیوشن کی دنیا کو دیکھ۔ بڑے بڑے آنریبل اپنی قوت استدلال اور ملکۂ تقریر پر گھمنڈ کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی خودی کا پرستار ہے۔ یہاں ٹھہرنا بے کار ہے ؛

اے دنیا! تیرے اندر استے بت خانے ہیں اور سب جاگنے والے۔ انہی بتوں کو پوجتے ہیں، تو مجھ کو بھی اجازت دے کہ اپنے حجرے کے سامنے اس اونچی چوٹی کے پہاڑ پر دیبی ماتا کے مندر پر جاؤں اور اس بابل کی لاڈلی کے آگے سر جھکاؤں ؛

ماتا۔ ماتا۔ سوتی ہے۔ اٹھ اور بتا کہ تجھ کو کیونکر پوجوں۔ اے دیبی ماتا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے پجاریوں کو روتی ہوئی مجھ تک آئی۔ ماتا میں تجھ پر قربان۔ تو کیوں تکلیف کرتی ہے۔ ماتا نے کہا:۔

مورکھ نادان۔ قبر کا بت۔ ہڈی کا بت۔ تحریر کا بت۔ تقریر کا بت۔ حکومت کا بت۔ زندہ بت۔ مردہ بت۔ ہنستا بت۔ روتا بت۔ میں بت۔ تو بت۔ سب ترک کرنے اور چھوڑنے کی چیزیں ہیں۔ ان بادلوں کو دیکھ۔ عرب کی توحید میں سرشار اڑے چلے آتے ہیں جنت و دوزخ۔ خوشی و غم۔ رندی و تقدی کے خرقے پھاڑ ڈال۔ رام نام جپ خدا نام کی سمرن پھیر۔ صفاتی جھگڑوں کو لات مار۔ ذات میں رم۔ ذات میں سما جا ؛

اپنے کو دیکھ۔ مجھ کو دھیان میں لا۔ میرا باپ۔ میرا سرچشمہ وہ ذات احدیت ہے۔ میں اسی نور کی شعاع ہوں جس کی جوت اس اندھیرے کے ذرہ ذرہ میں سمائی ہے۔ یہ دیوانے آدمی میری مورتی کو پوجتے ہیں۔ اور میرے بابل کو مجھ سے ناراض کرتے ہیں ؛

تو بھی اپنے من کا بت ہے۔ ڈر کہ تیرا داتا تجھ سے روٹھ جائے گا۔ جب کوئی تیرے آگے سر جھکائے گا کہدے کہ بھروسہ اور ٹھکانا اس پر رکھو جس کے ہم سب جلوے ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح جان نہ گنواؤ۔ جو چراغ کی لو کو نور کا دروازہ سمجھ کر اندر داخل ہونے آتا ہو

اور اپنی بھول میں جلا کا جلا رہ جاتا ہے۔

ارے بادل سے غبار۔ اے اشکبار طوفانی۔ لا اپنے دل کا پانی۔ جو مدینہ کے چشمہ حیات سے لایا ہے۔ اور دھو ہمارے دل۔ تاکہ دیکھیں توحید کا اصلی روپ۔ اور پائیں بے قراریوں میں قرار۔ ماما چلی گئی۔ ایک نشتر لگا کر غائب ہوگئی۔ میں اس بیابان پہاڑ میں کس کو لاؤں جو اس تازہ زخم پر عملی عقل کا پھاہا رکھے۔

کمبل اوڑھ لوں۔ گرم آتشدان کے پاس جاؤں۔ پان چباؤں۔ اندھیرے غار میں گر پڑوں یا اس زخم کو نوچ ڈالوں۔ یہ حس کیوں آئی۔ یہ ادراک کدھر سے آیا۔ اس کا نام عرفان سہی مگر بہت ستانے والا۔ اور رلانے والا ہے۔

بیت خانوں کی بندشوں میں اسیر ہوں۔ اور کان یہ سنتے ہیں کہ آزادی کی توحید پر نثار ہو۔ رنگوبی پر[1] ہو تو آ تجھ کو یہ آفت سونپ دوں۔ اور میں آنکھ بند کر کے سو جاؤں۔

اپنا ماتم

(از خطیب ۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء)

ازل کی صبح کو ابد نے رحلت کی۔ زیست نے آنکھ نہ کھولی تھی کہ مرگ زندہ ہوگئی۔ افسوس میں مر گیا۔ زندگی کے دریا میں ڈوبنے سے یہ واقعہ پیش آیا۔ موت کے فرشتے آب حیات میں حسن صورت لے کر آئے۔ اور میری روح قبض کرنے لگے۔ میں ان کی فانی ہونے کا خیال کر کے کڑھتا تھا، انھوں نے خود مجھے فنا کر دیا۔

اب سمجھا کہ میری پیدائش کا مدعا عشق کی اسیری تھی عشق نامدار ہے۔ اپنے طلبگار دل کو گمنام کرتا ہے اس واسطے میرے ماتم کا کہیں چرچا نہیں۔ اور میں خود اپنا ماتم کرتا ہوں۔

میں جاتا ہوں اور حسن مجاز کی شورشوں کو ورثہ میں چھوڑتا ہوں تاکہ کائنات میں حشر تک

[1] رنگوبی احمد آبادی سے مراد ہے ۱۲

قیامت برپا ہوتی رہے +

اس عشق کی آگ نے میری آنکھوں کی گنگا جمنا خشک کر دی۔ میں دم توڑتا ہوں۔ تو گنگا جمنا کی وادیاں اپنی ہستی کے بچاؤ میں اُلجھ جاتی ہیں۔ مجھ پر آنسو بہانے کی انکو فرصت کہاں میری موت نے ان سب صحرائوں اور لق و دق بیابانوں اور کوہستانوں کو سنسان کر دیا۔ جن کی آبادی میرے دم سے تھی۔ وہ بے دم۔ بیہوش اور بے سُدھ ہوگئے ورنہ ضرور میرے غم میں گریبان چاک کرتے۔ ہمالہ جس کو میرے عروج حیات نے آسمان تک پہونچایا تھا اور اپنی چوٹی کی سفیدی میں آلام کی سیاہی کو چھپایا تھا۔ میرے سرنگوں ہوتے ہی اپنے وجود کی فکر میں پڑ گیا۔ برف گھبرا کر پگھلنے لگی۔ بلندیاں تھرا کر گرنے لگیں پس میرا رنج وہ بھی بھول گیا +

تو آؤ عبدالرحمن[1]۔ اپنا ماتم میں خود کروں۔ کہ میں کیوں مرا۔ اور کیوں دُنیا کے قبرستان میں آیا۔ کاش میں ذاتِ وحدت کی گود میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ اور کن کے مرض سے میرا سامنا نہ ہوتا۔ اب ہو گیا تو صبر میرا ماتم ہے +

روح کا خول

(از اسوۂ حسنہ نومبر ۱۹۱۵ء)

تربوز کا چھلکا سبز۔ گودا سُرخ۔ مزہ جو اس کی روح ہے میٹھا۔ مگر مٹھاس کی شکل ... کبھی نہیں چکھنے سے جاتی +

آم کا چھلکا سبز۔ رس زرد۔ مزا شیریں۔ وہی اس کی جان ہے جس پر دنیا کی جان قربان ہے۔ چاہنے سب جان اور روح کو ہیں۔ مگر ہاتھ میں فقط اس کا خول آتا ہے۔ کمہاری ایک چھوٹا سا پردار کیڑا ہے۔ بھڑ سے ذرا دبلا پتلا۔ گھروں میں گیلی مٹی سے اپنا گھونسلا بناتا ہے

[1] عبدالرحمن پشاوری سے مراد ہے ۱۲

اور اس میں جھینگر مار کر اس کی لاش چھپا دیتا ہے۔ اور دروازہ میں خود بیٹھ کر روح کے خول کو توجہ دیتا ہے۔ چند روز میں اس کے مراقبہ کی طاقت جھینگر کو زندہ کر دیتی ہے۔ اور صحبت ہم نشین کا اثر بے رونق جھینگر کو خوبصورت کمہاری کی شکل بنا دیتا ہے اور جھینگر کمہاری بنکر اُڑ جاتا ہے۔

توجہ اور مراقبے کی یہ برکت دیکھ کر اور جسم کی ماہیت میں یہ انقلاب مشاہدہ کرکے میں نے ایک دن جو ستمبر ۱۹۰۸ء کا آخری حصہ تھا شملہ کے پہاڑ پر اپنے خول کا مراقبہ شروع کیا۔ اور اپنی لاش پر نظریں جمائیں۔

کمہاری نے جس دن جھینگر کا شکار کیا۔ اور اس کے ڈنک مارے تو اسکی تڑپ اور پھڑک سے ایک لالہ صاحب کا جی بہت دکھا تھا۔ اور انہوں نے کمہاری کو ہتیاری جانور کا خطاب دیا تھا۔ اور میں نے بھی جو اس وقت تک خواجہ حسن نظامی تھا مظلوم جھینگر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔

یہ واقعہ آج پیش آیا میرے خول کو میرے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا اور اس کے صدمے سے میں نے بھی ہمدردی ظاہر کی مگر جو تمسخر مجھ کو اس فرقت و زحمت میں نظر آتی تھی۔ اس سے اوسان درست تھے۔ اور اطمینان سامنے تھا اس لیے میں نے اپنے خول سے رسماً غم خواری کا اظہار کیا۔ اور اس کی وہ کہانی سنی جو اس نے دم توڑتے وقت جی بہلانے کو مجھ سے کہی۔

نشہ کی کہانی

پہلے میرے خول نے ایک ایسی کہانی کہی جسکو میں سکرات کی نشہ کی نشانی سمجھا۔ اور میں پہاڑ کے ایک پیارے پھول کی پنکھڑی پر لیٹ گیا۔ اور اس کی بہکی بہکی باتوں کو متانت اور مسکراہٹ سے سننے لگا۔

خول نے کہا۔ برا ہو اس عبادت کا جس نے چڑیا کی جان لی۔ خواجہ پیارے آج سے

دس ہزار برس پہلے اس پہاڑ پر ایک جھونپڑی تھی۔ جس میں ایک عبادت گزار جوگی رہتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے خیال کو خالق کے خیال سے لگایا اور چاہا کہ اس کا نور دیکھے کہ ایک چڑیا۔ چہچہاتی پروں کو پھیلاتی۔ پھدکتی۔ چین چین کرتی اس کی جھونپڑی میں آگئی چڑا اس کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنی لیڈی سے محبت کی گفتگو شروع کی۔ اور کہا پیاری دانہ چگیں۔ چہکیں۔ آؤ۔ اس فقیر کی تونبی پر چلک بیٹھیں۔ جس میں یہ پانی پیتا ہے۔ اور باتیں کریں چڑیا اُچھلی۔ اور دستانہ اداسے دو تین جھونٹے ہوا میں کھائے اور تونبی پر جا بیٹھی ٭

چڑے نے کہا۔ یہ آدمی کیا چاہتا ہے۔ چڑیا بولی اپنے خول کی خواہشوں سے درگزر اور نورِ حق تک رسائی۔ چڑا جھلا کر بولا۔ دیوانہ ہے۔ خول ملا ہے تو اسکی خواہشوں کو بھی پورا کرنا پڑے گا۔ نورِ حق خواہشوں سے جدا تھوڑی ہے ٭

جوگی کو سوائے چین چین کے غل کے اور کچھ سنائی نہ دیا۔ اور اس نے اپنا ڈنڈا اُٹھا کر ان دونوں پر کھینچ مارا۔ جو چڑے کے سر میں لگا اور وہ بیچارہ تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ اور مر گیا۔ چڑیا یہ دیکھ کر پھر سے اُڑ گئی اور باہر درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی تھی اور اپنے خول کے بچ جانے پر شکر کرتی تھی۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد اس کے دل کو شوہر کی محبت نے بے قرار کیا۔ وہ اُلفت کے غم میں اندھی ہو گئی اس کی روح اپنے خول میں سر پیٹنے اور پھڑ پھڑانے لگی۔ جس کے صدمہ سے اسکا خول بھی حرکت میں آگیا۔ اور روح کے اندھے اشارہ سے مجبور ہو کر چڑیا پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہاں اس کے غریب چاہنے والے چڑے کی لاش خاک پر پڑی تھی اور فقیر اپنے خول کو توجہ دے رہا تھا چڑیا نے آہ و نالے شروع کیے کبھی وہ تونبی پر آتی۔ کبھی جھونپڑی کے بانس پر جاتی۔ اس کی زبان تالو سے نہ لگتی تھی۔ وہ چیختی تھی اور بلبلاتی تھی ٭

جوگی کے خیال میں پھر رخنہ پڑا۔ اس نے ایک اور جست کی اور چڑیا کو بھی ڈنڈے سے مار ڈالا ٭

عاشق و معشوق کی لاشیں اٹھا کر جھونپڑی کے باہر پھینکدیں۔ اور ایک لمبا سانس لے کر جس سے تضیعِ اوقات کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا۔

باہر چڑے چڑیا کے جنازے رکھے تھے۔ اندر جوگی اطمینان سے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ کہ نورِ حق ہاتھ میں شعلہ کی تلوار لیئے نمودار ہوا۔ جوگی اس کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا اور اس کی روح اپنے مرکز پر قربان ہونے کو خول میں پھڑپھڑانے لگی۔ مگر نورِ حق نے جوگی کے خول پر شعلہ کا ایک ہاتھ مارا اور کہا میری چڑیوں کا خون کیا۔ جو فطرت کا سبق سنانے تجھ تک آئی تھیں۔ ان میں زندگی تھی۔ وہ نسل بڑھانے کے دو پتلے تھے۔ تیرے ترکِ وجود سے ان کا رتبہ بڑا تھا۔

جوگی کے خول نے عاجزی سے معافی مانگی۔ مگر اندر کی روح نے اپنے باپ نورِ حق کو ترشی سے جواب دیا۔ اور کہا۔ مجھ کو یہاں قید کر کے آپ آزاد رہنا چاہتا ہے تو بھی تو اس قفس کا مزا چکھ۔ دُنیا میں تھوڑے پنجرے ہیں جن کے اندر کی ارواح تیری فطرت کا حکم مانتی ہیں۔ ایک میں اگر تعمیل نہ کروں تو کیا نقصان ہوگا۔

نورِ حق نے یہ سُنکر اندر کا سانس لیا اور جوگی کی روح ایک سناٹے کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھنچکر اُڑی اور نورِ حق میں سما گئی۔

جوگی کا خول پڑا رہ گیا اور چڑیوں کے خول سے زیادہ اس نے اس جنگل کو بدبودار کیا۔

جب میرا خول یہ نشیلی کہانی کہہ چکا۔ تو مَیں نے کہا۔ کہہ چکا یا کچھ باقی ہے۔ گھبرا مت میں تجھ کو سڑنے سے بچاؤں گا۔ اور اس جنگل کو تیری بدبو سے آلودہ نہ ہونے دوں گا۔ اس وقت وہ خول بولا۔ اب میں ہوشیاری کی ایک کہانی کہنی چاہتا ہوں اس کو سن لے پھر جو تیرا جی چاہے کر۔

میں نے پھول کی پنکھڑیوں کو اپنے اوپر لپیٹ کر آنکھیں خول کی طرف پھیریں۔ اور اس سے کہا۔ پہلے یہ تو بتا کہ اس دنیا نے تیری کیا قدر کی۔ جو تو دنیا میں پہنچ کر اتنا اصرار کرتا ہے

اور اس کی امیدوں کی اسیری پر فدا ہو جاتا ہے۔ ناحق مثالیں دے کر مجھ کو گرفتار کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ میں جب تک تجھ میں تھا ایک اچھا لکھنے والا۔ اور اُردو زبان میں ایک نئی روش ایجاد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ جو قلم سے ظاہر ہوتی تھی۔ یا کبھی کوئی سامنے آکر اس کو ادا کرتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ اس وقت مجھ پر کیا حالت گزرتی تھی۔ میں الفاظ پرست خولوں کی یہ تعریف سُنکر بگڑتا تھا۔ کہ یہ ایسے اندھے کیوں ہیں، جو میری اُس شان کو بیان نہیں کرتے جس مجھ کو نورِ حق نے اقتدار دیا ہے۔ نورِ حق سے میں جو کہتا ہوں وہ سُن لیتا ہے اور اسکو پُورا کر دیتا ہے۔ میں نے جس کی سفارش کی۔ نورِ حق نے کبھی اسکو نہ ٹالا۔ یہی نہیں۔ نورِ حق نے اپنے طلسمی رنگارنگ جلووں کو میرے پاس تنہا چھوڑ دیا۔ اور میں نے ان میں خوابگاہ بنائی +

اسے خول آدمیوں کے جیلخانہ میں جی نہ لگا۔ یہ آدمی رشک کرنے لگتے ہیں۔ جب کسی کے پاس کچھ دیکھتے ہیں اور اگر انسان کو اپنے خول سے محبت ہو تو دوسروں کا رشک وحسد اسکو تکلیف دیتا ہے۔ کیا تو نے پایا کہ دنیا میں کتنے تیرے حاسد ہیں اور ان کی مکارانہ کینہ وری سے تجھ کو کیسے کیسے صدمے اُٹھانے پڑے۔ اگر تو اپنی خواہشات خاکی کو فراموش کردے اور میرے مراقبہ و توجہ کے آگے سر جھکا دے تو تیری یہ ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی اور تو دنیا کے سب خولوں کا سرتاج بن جائیگا۔ مگر تجھ میں سرتاج بننے کی خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ سرتاجی دکھ سُکھ کے جذبات کی فنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ جذبات ہی نہ ہوں گے تو تجھ کو اسکی خوشی نہیں ہوسکتی۔ البتہ تجھ کو نورِ حق سے وہ انعام ملیں گے جن کے سامنے دُنیا کی سب خوشیاں ہیچ اور بے نتیجہ ہیں +

میرے خول نے یہ سُنکر کہا۔ اچھا تو میری کہانی سُن۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا +

جڑی بوٹی کا شہید

چادر گُل کے مزیل سُن۔ کھڑا ہو۔ قدرت کی حقیر اولاد۔ جو ایک دن میں پیدا ہوتی اور بڑھتی

پھولتی پھلتی۔ اور مرجھاکر فنا ہوجاتی ہے۔ جس کا نام گھاس ہے۔ بناس پتی ہے جنگل کی جڑی بوٹی ہے۔ اور جو تیری گلکار مسہریوں کے دامن خاک سے سر نکالے چپ چاپ کھڑی ہے۔ بڑی قاتل ہے۔ سفاک ہے۔ بڑی دولت والی ہے۔ امیری کی کنجی ہے بڑی طبیب ہے۔ امراض کی موت ہے۔ بڑی زندگی ہے۔ حیات کی روح رواں ہے*

ایک پہاڑ کے نیچے میدانی زمین میں ایک راجہ رہتا تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کا نام "اندرجوت" تھا اسکی عمر سولہ برس کی تھی کہ باپ مرگیا۔ اور گدی اس کے ہاتھ آئی۔ اندرجوت کی رانی کنولا چودہ برس کی اور اندرجوت سے صورت شکل میں ذرا گھٹیا تھی۔ اندرجوت اپنے زمانہ کا کنہیا تھا۔ اس کے حسن کی دھاک دور دور تھی اسکو اپنی خوبصورتی پر گھمنڈ بھی تھا۔ سب سے بڑی سندرتا خوبصورتی اسکی آنکھوں میں تھی۔ اندرجوت ان کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ مگر جس کو دیکھتا تھا۔ جس چیز پر نظر ڈالتا تھا اس میں اپنی آنکھوں کی طاقت کو مشاہدہ کرتا تھا۔ کیونکہ آدمی ہو یا جانور۔ پتھر ہو یا درخت۔ اسکی آنکھوں کے پرتو سے شرما جاتے تھے۔ یا اندرجوت کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والی چیز اسکی آنکھوں کے رعب حسن سے جھک گئی ہے اور بے قابو ہے*

کنولا اپنے پتی رشوہر سے بہت کم تھی۔ مگر اس کے دل میں بھی خدا نے ایسی کشش دی تھی کہ اندرجوت اس کا والہ وشیدا تھا*

ایک دن کا ذکر ہے کہ اندرجوت کنولا کو لے کر دیبی کے درشن کو گیا۔ جو پہاڑ کے دامن میں براجمان تھی۔ رستہ میں اسکو ایک پودنا جنگلی جھاڑی پر نظر آیا جس کے سرمئی ہیاسے رنگ کے سامنے اسکی بدصورت پودنی بہت بری معلوم ہوتی تھی۔ اندرجوت نے کنولا سے کہا کہ پودنا اس بدشکل جوڑے سے کیونکر خوش رہ سکتا ہوگا۔ کنولا بولی جس طرح تم میرے ساتھ۔ یہ سنکر اندرجوت ایک خیال میں پڑگیا۔ اور اسکو اپنے حسن کے غرور نے تھوڑی دیر سے بہ خود بنائے رکھا*

اندرجوت دیبی کے درشن کرکے واپس آرہا تھا کہ ایک مور دکھائی دیا۔ جو اپنے بیمثال حُسن کا لباس پہنے اپنی کالی کلوٹی بے قرینہ مورنی کو اپنا ناچ دکھارہا تھا۔ اندرجوت کو پھر پودنے کا خیال آیا۔ اور اس نے کنولا سے کہا۔ یہ بڑا بے وقوف ہے۔ ایسی بدشکل بیوی پر عاشق ہوا ہے۔ پودنا اور مور اور شاید میں تینوں عقل سے دور ہیں۔ میں تجھ سے چار مہینے بات نہ کروں گا۔ جب تک اس کا بھید مجھ کو معلوم نہ ہو جائے *

کنولا بڑی عقلمند لڑکی تھی۔ اس نے اندرجوت کے اس بچپن سے بُرا نہ مانا۔ اور کہا کچھ ہرج نہیں۔ تم اسکو سوچو اور تحقیق کرو۔ اور چار مہینے مجھ سے الگ رہ سکتے ہو۔ تو رہو۔ میں تم کو اجازت دیتی ہوں *

اندرجوت یہ سُنکر بگڑا۔ اور کہا۔ تم کو اجازت دینے نہ دینے کا کچھ اختیار نہیں میں نے اپنی خودمختاری سے یہ ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے ہی اختیار سے اسپر عمل کروں گا۔ تم میری تابعدار لونڈی ہو۔ مگر بہت بدصورت ہو۔ تم میرا جوڑا نہیں ہوسکتیں۔ تم میری آنکھوں کی جوت تک کو نہیں سہار سکتیں اور میرے نگاہ بھر کر دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتی ہو *

کنولا بولی جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں تکرار نہیں کرتی۔ تم چاروں سے زیادہ اپنے ارادہ کی خودمختاری پر قایم رہ جاؤ تو غنیمت ہے۔ مجھ کو خدا نے حُسن نہیں دیا تو دوسری نعمت دی ہے جو تم کو میسّر نہیں *

اندرجوت۔ وہ کیا نعمت ہے؟

کنولا۔ تمہیں سوال کرنے کا کچھ اختیار نہیں۔

اندرجوت۔ میں پوچھتا بھی نہیں۔

اتنے میں گھر آگیا۔ اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ حویلیوں میں اُترکر چلے گئے *

کنولا نے حویلی میں جاتے ہی ماما کو اپنے گرو کے پاس بھیجا۔ جس نے سارا قصہ ان سے کہا۔ گرو صاحب بڑے عالم اور دنیا کے حال سے خبردار تھے۔ انھوں نے ماما کو

دھکا کر نکال دیا۔ اور کہا۔ میں کیا کروں۔ میاں بیوی کے قضیہ میں دخل دینے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے۔ جا کنولا سے کہدیجیو کہ آیندہ مجھ سے اپنے گھر کے جھگڑے بیان نہ کرنا ؛

ماما سہمی ہوئی کنولا کے پاس آئی۔ اور گرو جی جنگل گئے۔ اور وہاں انھوں نے سات کنکروں پر کچھہ دم کیا اور رنانے میں ڈال دیے۔ اُدھر کنولا کو گرو جی کے برتاؤ سے اتنا رنج ہوا کہ اس نے ہیرے کی کنی کھانے کو منگائی۔ مگر فوراً اس کے دل نے کہا کہ جو تعلیم گرو جی نے مجھ کو دی ہے اس میں صبر کا بڑا درجہ ہے "سنتوش پرم لابھ" (صبر میں بڑا نفع ہے) رام چندر جی کا قول ہے۔ پس مجھ کو بھی اپنے کلیجہ پر پتھر رکھنا چاہئے دیکھئے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے ؛

کنولا اسی خیال میں تھی کہ اندر جوت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس کے پاس آیا اور اس کے پیروں میں گر پڑا۔ کنولا نے کہا خیر ہے تم میرے پتی اور مالک ہو۔ اور میں تمہاری ادنےٰ لونڈی۔ یہ کیا کرتے ہو ؟

اندر جوت بولا۔ میں نے غلطی کی۔ جو تم سے ایسی سخت باتیں کیں۔ خدا نے میرے دل کو روشنی دی۔ اور میں نے تمہاری شان پہچان لی۔ اب میں کبھی اسکی قدرت میں دخل نہ دوں گا ؛

کنولا حیران تھی کہ یہ کیا انقلاب ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ گرو جی ہاتھ میں ایک بوٹی لیے چلے آتے ہیں۔ انہوں نے وہ بوٹی اندر جوت کو دی۔ اور کہا لے اسکو اپنی آنکھ پر رکھ اندر جوت نے اس پتہ کو اپنی آنکھ سے لگایا۔ تو کیا دیکھتا کہ کنولا ایک نور کا پتلا ہے۔ اور اس قدر حسین ہے کہ اندر جوت نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی اس کے بعد گرو جی نے کہا۔ نادان نظر کے دھوکے میں نہ پڑ۔ اس دنیا میں عجیب صورتیں ہیں ان کو قدرت کی آنکھ سے دیکھیگا تو اچھی شکل میں پائے گا۔ مورنی اور پودنی خاکی آنکھوں میں بد نما ہیں۔ مگر مور اور پودنے کی حقیقت شناس نگاہوں میں بے حد خوشنما ؛

اندرجوت کو حیرت تھی کہ گروجی کو ہمارے مخفی قصہ کی کیونکر خبر ہو گئی۔ اور ان کی کرامت کا قایل ہو گیا ❊

اب اندرجوت گروجی کے پاس روزانہ جانے لگا۔ اسکو جڑی بوٹی کے علم کا شوق ہو گیا تھا۔ گروجی نے بھی اس کے شوق کے موافق بوٹیوں کے صدہا خواص سکھائے ❊

کایا پلٹ بوٹی

ایک دن گروجی نے اندرجوت کو کایا پلٹ بوٹی بتائی۔ اور کہا اسکو اگر ناف پر باندھ لیا جائے تو انسان اپنی روح کو جسم سے نکال کر آزاد کر سکتا ہے۔ اور روح کو جہاں چاہے سیر کرنے کو بھیج سکتا ہے۔ اور پھر جب جی چاہے واپس بلا سکتا ہے ❊

اندرجوت نے کہا۔ پھر دوبارہ اپنے جسم میں بھی ڈالنا ممکن ہے یا نہیں۔ گروجی بولے کیوں نہیں۔ یہ نہ ہو تو کمال ہی کیا ہوا۔ مگر شرط یہ ہے کہ روح کو کسی ایسی جگہ نہ بھیجے جہاں سے وہ اُلٹی نہ آ سکے ❊

اندرجوت۔ وہ کونسا مقام ہے جہاں سے روح واپس نہیں آتی؟

گروجی۔ خدا کی جھولی جس میں ارواح رہتی ہیں۔ روح کا پسندیدہ مقام ہے ❊

اندرجوت۔ وہاں مجھے بھیجنے کی کیا ضرورت ہو گی۔ میں کبھی وہاں نہ بھیجوں گا ❊

گروجی۔ نہیں یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ دیکھو جو لوگ کسی نیک کام کی حمایت میں مارے جاتے ہیں ان کی روحیں خدا کی ذات کے قریب ایک نورانی قندیل میں چلی جاتی ہیں۔ اور وہاں ان کو ایسا مزا ملتا ہے۔ جو دُنیا کے کسی سرور کے مشابہ نہیں ہے جس کو تم سمجھ سکو۔ بس یہ خیال کرو کہ وہ بہت ہی بڑا لطف ہے۔ جو خدا کی ذات میں فنا ہونے سے پہلے اس مادی دُنیا میں ارواح کو میسر آتا ہے ❊

اگر تم نے کایا پلٹ بوٹی سے اپنی روح کو اپنے خول سے الگ کر لیا اور کہیں سیر

کرنے کو پہنچا تو وہ ضرور آزادی کی ہوا سے سرشار ہو کر اپنی شہید روحوں کی قندیل میں جائے گی اور وہاں گئی تو پھر کبھی نہ آئے گی ۔

اندرجوت۔ جب اس قندیل میں آپکے فرمانے کے بموجب بہت بڑا سرور حاصل ہوتا ہے تو میں اپنی روح کو واپس کیوں بلاؤں گا۔ اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں رہے جہاں اسکو راحت اور چین ملتا ہو۔ اس دُنیا کی تکلیف اور بے مزہ زندگی سے تو وہ لاکھ درجے بہتر ہے

گروجی۔ یہ سچ ہے۔ مگر قندیل مبارک میں غیر شہید روح کو رہنے کا حکم نہیں ہے جو روح جسم کی شہادت کے بغیر محض سیر کے لیے وہاں چلی آتی ہے تو چند روز کے مرنے کے بعد ایک دُکھ لگ جاتا ہے اور پھر دنیا کے کسی ناپاک جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ اور قید کی تکلیف اٹھاتی ہے ۔

اندرجوت۔ پھر کسی نیک کام میں شہید ہو کر اپنی روح کو قندیل مبارک میں کیوں نہ پہنچاؤں

گروجی۔ وہاں ایسا کروگے تو ہمیشہ وہاں رہوگے ۔

اندرجوت۔ بتائیے کہ وہ شہادت کونسی ہے ؟

گروجی۔ خدا اور اس کے علم کی تلاش میں اگر آدمی مرجائے تو اسکی روح قندیل مبارک میں چلی جاتی ہے۔ کسی مظلوم کی حمایت میں مارا جائے تو اسکو یہ درجہ ملتا ہے ۔

لیکن اے اندرجوت اگر تو جسم کی قید میں رہ کر اپنی خواہشوں پر قابو رکھے اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو نیک کام میں صرف کرے اور نفس کی دشمنی پر فتح پائے تو کسی موت مرے قندیل مبارک میں تیری روح کو جگہ دی جائے گی اور تیرا نام شہیدوں میں لکھا جائے گا۔ دیکھ جس زمانہ میں اچھی باتوں کی بے قدری ہو جائے۔ اور خلقت نیکیوں کو عقل اور آرام کے خلاف سمجھنے لگے۔ اس وقت میں اگر کوئی شخص ایک نیکی کو بھی زندہ کریگا تو اس کی روح کو مرنے کے بعد قندیل حق میں اونچی جگہ دی جائے گی ۔

اندرجوت نے گروجی سے یہ سُن کر اپنے وقت کے دو حصے کیے۔ ایک میں وہ اپنی

حکومت کے کام کرتا تھا۔ اور مظلوموں کی فریاد سنتا تھا اور دوسرے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرتا تھا۔ اور کنولا بھی اس کے شریک حال رہتی تھی۔ ایک روز وہ کنولا سمیت ایک بوٹی کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں ایک سانپ نے کاٹا۔ کنولا سانپ کو پاؤں سے چھڑانے لگی۔ کیونکہ وہ انگوٹھے کو چمٹ گیا تھا۔ تو سانپ نے کنولا کے ہاتھ میں بھی کاٹ کھایا۔ سانپ ایسا زہریلا تھا کہ دونوں وہیں پانی ہو کر بہہ گئے۔ مگر انکی ارواح فوراً قندیل مبارک میں اُڑ کر چلی گئیں۔ جہاں ان کا ارواح نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور یہ دونوں ابدی اور کامل عیش سے وہاں رہنے لگے +

لہٰذا تو بھی اے میری روح ایسا ہی کر۔ اور مجھ خول میں مقید رہ کر نیک کاموں میں مصروف ہو۔ تاکہ شہیدوں کی قندیل حق تک رسائی پائے۔ یوں خواہ مخواہ مجھ کو ترک کرنے اور غیر فطری آزادی سے تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا +

میں نے اپنے خول کی کہانی سنکر قہقہہ لگایا۔ اور کہا دیوانے تو نے اپنے خاکی جذبات کے مطابق قندیل حق کو بھی عیش خانہ سمجھا۔ کوئی اور مثال دی ہوتی۔ مگر وتیا کیونکہ تیری عقل کا عروج تو خواہشات و لذاتِ نفس تک ہے +

خول:۔ نہیں میں نے کہا ہے کہ قندیل مبارک میں جو سرور ارواح کو ہوتا ہو انکی مشابہت ہماری دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہے۔ صرف سمجھنے کو کسی دُنیاوی لطف سے نسبت دے سکتے ہیں +

میں۔ خیر اگر تو نے یہ کہا بھی تب بھی میں خیال کرتا ہوں۔ کہ تیری پرواز فانی لذتوں سے آگے نہیں ہے۔ میں قندیل حق میں شہید ہو کر جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہاں مجھ کو دوسری ارواح کے ساتھ عیش و راحت نصیب ہو۔ وہاں میرا کام یہ ہوگا کہ سب ارواح کو قندیل کی قید کا دکھ بتاؤں۔ اور ان سے کہوں کہ تم سب جدوجہد کرو اور اس محدود حیات سے نکلکر ذات الٰہی کی نامحدود ہستی میں فنا ہونے کی کوشش کرو۔ کیونکہ قندیل

میں خواہ ہم کو کیسا ہی لطف ہو۔ پر وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو محویت و فنائیت ذات میں ہو سکتی ہے ٭

اگر میں قندیل حق کے بعد بہشت میں گیا۔ تو وہاں بھی جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کا عیش چاہتا ہے تو آزادیِ بیانِ حق کی طلب کروں گا۔ اور جنت والوں کو بہکاؤنگا کہ وہ بہشت کے جیل خانہ سے نکلیں اور معراج الوہیت کی غرقابی خدا سے مانگیں ٭

اے خول! میں تجھ سے نفرت نہیں رکھتا میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو قانونِ اسلام اور قانون دنیا کے برخلاف ہو۔ میں تجھ کو کسی قسم کی ادی اذیت نہیں دیتا۔ مجھ کو یہ بھی منظور نہیں کہ فطرت کے مقررہ وقت سے پہلے تجھ سے الگ ہو جاؤں۔ یا کسی اور کو ایسا کرنے کی نصیحت کروں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے جدا ہو کر ذرا اپنے اور تیرے حالات کا مطالعہ کیا کروں۔ جب تک تجھ سے جدا نہ ہوں گا سمجھ نہیں سکتا کہ تو کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ تو کس حال میں ہے اور میں کس حال میں ہوں تجھے کیا کرنا چاہیئے اور مجھ پر کیا کیا فرائض ہیں ٭

میرے مٹی کے پتلے! تیری دید کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ تیرے اندر بند رہ کر تو ہی بتا کہ تجھ کو کیا دیکھ سکتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ دید کے ہزاروں طریقے ہیں مگر جو دید منزل تک پہونچاتی ہے وہ تیرے بندھن سے باہر آئے بغیر ہاتھ نہیں آ سکتی ٭

یہ خیال نہ کر کہ میں ہمیشہ اس پھول کی ہستی پر بستر جمائے رہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ محدود رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے۔ میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ اور اس میں کہیں نہ رکوں گا تاوقتیکہ خدا کو نہ پا لوں۔ اور خدا کے پانے پر بھی چپکا نہ رہوں گا۔ یہاں تک کہ اسکی ذات میں سما کر نابود کے اسم سے آزادی حاصل نہ کر لوں ٭

خول۔ یہ حکم کہاں ہے کہ تو مجھ سے جدا ہو کر مجھ کو پڑھے۔ علم اندر رہ کر اچھا ہوتا ہے نہ کہ باہر نکلکر ؟ ٭

ہیں:- خدا نے اپنے عربی کلام میں کہا ہے وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؕ جس کی تعمیل جسم کی قید میں محال ہے ؛

ارے غافل میں تجھ سے جدا کب ہوں۔ تو مجھ میں ہے۔ تو میں تجھ میں ہوں۔ اور تیرے ہی اندر رہ کر علم حاصل کر رہا ہوں مگر یہ وہ اندرون نہیں جس کو تو چاہتا ہے کہ خواہشوں میں اسیر ہو کر علم حاصل کروں۔ بلکہ یہ وہ اندرون ہے جو مجھ روح کی اصطلاح میں اندرون ہے اور جس سے حکم خدا کی تعمیل اور دنیا میں آنے کا منشاء پورا ہوتا ہے ؛

دامِ مگس

(صوفی۔ جنوری ۱۹۱۶ء)

بلبل کو اسیر کرکے شاعروں کی یورش ہوئی۔ جس کو شوخیٔ قلم کی تلوار کھینچے آنکھیں بند کیے عالمِ خود فراموشی میں بلبل کے صیاد پر پلا پڑتا ہے۔ گویا غریب صیاد کو کچا چبا جائیگا۔ کوئی پوچھے کہ شاعروں کو بلبل سے کیا ہمدردی ہے۔ عقل مند جانتے ہیں کہ چمن کے موسم گل میں بلبل اور انسانوں کی محفل عیش میں شاعر دونوں کانٹے ہیں۔ بلبل چمن میں آتا ہے تو پھولوں کی مستیاں اور خوش ادائیاں نالہ و فریاد کرکے خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھول عالم سکوت میں اپنی نشیلی آنکھ کھولتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا چاہنے والا بھی ایسا ہی متین و خاموش ہو۔ سنجیدگی و متانت سے بہار کا حسن لوٹے۔ نہ کہ بلبل کی طرح چیخ چلا کے ہائے گل ہائے گل کے نعرے لگائے۔ وصل نصیب ہو تو چونچ کی بے تاب بوسہ بازی سے برگِ گل کو پاش پاش کر دے ؛

شاعر محفل میں جاتا ہے تو کبھی اپنی افسردہ دلی سے ساری انجمن کو افسردہ کر دیتا ہے کبھی اپنی زندہ مزاجی سے داب مجلس میں برہمی ڈالتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے۔ کبھی روتا ہے

غرض یہ بھی بلبل کی طرح آزار دہندہ ہے۔ خود تکلیف میں رہتا ہے۔ دوسروں کو تکلیف میں ڈالتا ہے +

شکاری نے دام بچھایا اور شورش کنندہ بلبل کو اسیر کیا تو جناب شاعر کا کیا نقصان ہوا جو شکاری کو کوستے ہیں اور اس کی ہجو میں دفتر کے دفتر کالے کیے ڈالتے ہیں۔ خیر آج میں نے ایک ایسی چیز کے لیے دام بچھایا ہے۔ جو شاعر صاحب کے کوچۂ عشق سے محروم ہے بلکہ بعض اوقات ان کی فکرِ شعر میں حارج ہوتی ہے۔ دیکھوں اسکی اسیری کی نسبت بھی حضرت کے قلم میں کچھ حرارت آتی ہے یا نہیں +

یہ دام مگس کے لیے ہے۔ دام بھی بے نقطہ اور مگس بھی۔ شاعر صاحب کی بے نقطہ گالیوں کا اب کچھ اندیشہ نہیں۔ جو خود بے نقطہ ہو گا وہ دوسرے کی بے نقطہ صلواتوں سے کیا ڈرے گا +

کاغذی جال

میں نے دیکھا کہ اس زمانہ میں اخباروں رسالوں کے کاغذی جال چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اور حرص و ہوس کی اسیر ارواح اپنے اجسام کو ان میں پھنسا رہی ہیں اس واسطے میں نے بھی دو آنے کا مکھی مار کاغذ بازار سے خریدا۔ اور اپنے رین بسیرے کی آزاد مکھیوں کے سامنے یہ کاغذی جال لگایا +

اس وقت میرے دل میں مکھیوں سے کسی انتقام کی خواہش نہ تھی۔ نہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس عقیدہ کو تسلیم کیا تھا کہ مکھی ہر بیماری کی جڑ ہے۔ میرے دماغ میں جرمنی قیصر کی خونخواری کا بھی کچھ دخل نہ تھا۔ نہ مجھ پر موجودہ جنگ کا ارتقائی اثر پڑا تھا۔ جو میں غریب مکھیوں کے قتل عام پر آمادہ ہوتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مکھیوں نے مجھے بہت کم ستایا ہے۔ مچھروں کی جتنی شکایت کروں تھوڑی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ میرے جسم کے

خون کو شیر مادر سمجھا۔ بچاری مکھیاں میرے دسترخوان کی شریک ہمجولیاں ہیں۔ میں ان سے اس قدر محبت رکھتا ہوں کہ جب کبھی انہوں نے میرے سالن میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور سارا دسترخوان ان کے آگے رکھ دیا۔ خود نہ کھایا سب کچھ ان کو سونپ دیا۔

پھر جو میں نے ان کی گرفتاری و قتل کاری پر کمر باندھی اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں فقرہ مگس بے حیا کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ خواہش تھی کہ میں اس جانور کی اسیری کا تماشا دیکھوں جس کو سعدی نے سوزِ عشق سے محروم گردانا ہے۔ اور کہا ہے کہ:

سرِ غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند

جب مکھی بوالہوس ہے تو دیکھوں اسیرانِ ہوس کیونکر حرص و ہوس کا شکار ہوتے ہیں اور ان پر کیا کیا بپتائیں پڑتی ہیں۔

سب سے زیادہ مجھ کو اس ننھے سے پرندے کی ایک اور آزمائش منظور تھی کہ وہ اپنی جان بچانے میں کہاں تک محتاط ہے اور جب اسیرِ آفت آ جاتی ہے تو کس کس طرح حفاظتِ زندگی میں کوشش کرتا ہے۔ خاصکر یہ کہ مکھی پر سکراتِ موت کی کیسی کیفیت ہوتی ہے اور اس کے بے حقیقت اور ناتواں جسم سے جان کتنی دیر میں نکلتی ہے۔

یہ بہت وحشیانہ تجربہ تھا۔ یہ بہت بے دردانہ تحقیقات تھی۔ اس میں خداوندی اور ترس شعاری کا ذرا دخل نہ تھا۔ مگر جذبۂ بشری نے مجھ کو سنگدل بنا دیا۔ رحم میرے خانۂ دل میں منہ چھپا کر جا بیٹھا۔ اور میں نے اپنے بستر کے آس پاس بسنے والی مکھیوں کو جال میں پھانسنے پر کمر باندھ لی۔

یہ کاغذی جال گورے ملکوں سے آیا ہے۔ اس میں انگریزی حروف ہیں۔ اور پکھوں کے

رنگ کی ایک چیپ دار چیز ہے۔ جب میں نے اس کا تذکرہ زمین پر رکھا ایک بھولی بھالی نشۂ شباب کی متوالی مکھی جست کرکے اسپر آئی۔ اور جھپٹ مار کر ہوس کے پردوں سے نیچے اُتری قدم رکھنا تھا کہ دام میں اُلجھ گئی۔ یہ حالت دیکھ کر اس نے چاہا کہ اُلٹے پاؤں بھاگے۔ اس واسطے وہ پھر بالائی جست کے لیے اُبھری ہی تھی۔ مگر پاؤں جال میں پھنس چکے تھے اُس نے ساڑھے چار سکنڈ توقف کیا۔ اور دم لے کر لگاتار اکیس سکنڈ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا اسوقت اس کے پاؤں قید تھے۔ لیکن جسم پروں کی طاقت پرواز سے بار بار جنبش کرتا تھا پر ایسی تیزی سے ہوا میں لہریں لیتے تھے کہ ان کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ آخر اکیس سکنڈ کے بعد قوتِ پرواز نے جواب دے دیا۔ پر شل ہو گئے۔ اور مکھی اپنے بائیں رخ جھکی۔ جھکنا تھا کہ بایاں پر بھی جال میں پھنس گیا۔ اور مکھی آڑی ہو کر بے دم ہو گئی۔ ۳۰ سکنڈ وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ اور اس کے بعد پھر زندگی کی تمنا نے اسکو آمادہ کیا کہ ایک بار اور جان بچانے کی کوشش کرے۔ اب کے اس نے مایوسانہ عالم میں اپنے بدن کو حرکت دی۔ اور ایک دلخراش چیخ بھی ماری جو مسلسل گیارہ سکنڈ ہوا میں گونجتی رہی۔ مگر افسوس اب بھی اسکو کامیابی نہ ہوئی۔ اور فرشتۂ موت اس کے سامنے آ گیا۔ اور مکھی نے دنیا سے گزرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ اتنے جلدی اسکو موت سے سابقہ پڑے۔ وہ اپنی عمر کو بہت دراز تصور کرتی تھی۔ اس کو خیال تھا کہ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی۔ اور میں اس میں آخر تک بھنبھناتی پھروں گی۔ آج اس نے موت کا پیام سُنا جس نے اس کے ارمانوں میں ہل چل ڈال دی۔ وہ چپ ہو گئی۔ اور موت کے فرشتے کو حیرت و یاس سے دیکھنے لگی۔

جب میں نے معلوم کیا کہ مکھی سکرات میں ہے تو گھڑی کو جلدی سے ہاتھ میں لیلیا۔ اور پھر سکنڈ شمار کرنے لگا۔ مگر یہ میری بڑی بھول تھی۔ اس وقت مجھ کو اپنی سکرات کی مشکلات کا خیال کرنا تھا جو ایک دن مجھ کو پیش آئے گی۔

مکھی پر سکرات کا عالم ایک منٹ طاری رہا۔ اس کے بعد اس نے داعیٔ اجل کو

اپنی روح دے دی۔ اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
ہم سب خدا کے ہیں اور آخر خدا ہی کے پاس جانا ہے۔

جتنی دیر میں اس نوجوان مکھی کے انجام کار کی دید میں مصروف رہا۔ اتنے عرصہ میں مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ دس بیس اور نئے وجود اسیر بلا ہو چکے تھے۔ اور تڑپ رہے تھے غور کیا تو قریباً ہر مکھی اکیس سکنڈ تک کوشش پرواز اور سعی رہائی میں مصروف رہ کر آخر بائیں جانب جھک جاتی تھی۔ اور اس کا بایاں پر مسالہ میں آلودہ ہو کر اسکو جان سے کھو دیتا تھا۔

اس کے بعد اور بھی تماشے دیکھے بعض مکھیاں سرنگوں رہ گئیں بعض ایسی آئیں کہ پاؤں رکھتے ہی خاموش ہو گئیں ذرا جنبش نہ کی۔ اور مری کی مری رہ گئیں۔ یہ شاید مسالہ کے زہر کا اثر ہو گا۔

نابینا حرص

میں نے دیکھا کہ سینکڑوں لاشیں مکھیوں کی پڑی ہیں۔ آزاد مکھیاں ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود جال میں آتی ہیں اور جان بوجھ کر اسیر پنجہ اجل ہو جاتی ہیں"
دل نے کہا ان میں اتنی عقل نہیں ہے۔ جو اس قتل خانہ کی حقیقت کو سمجھیں غیب کی صدا بولی نہیں۔ قدرت نے ہر جاندار کو موت و حیات کے خطرات کی تمیز و عقل دی ہے مکھی اس سے محروم نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حرص و ہوس کے آنکھ نہیں ہوتی اس واسطے یہ بیچاری بھی اس کے ہاتھوں اندھی ہو کر موت کے منہ میں جا پڑتی ہے۔

انسان سے زیادہ کس کو عقل ملی ہے۔ کیا اس کے اندھے پن کو نہیں دیکھا کہ وہ جان بوجھ کر ہی ہمیشہ موت و ہلاکت کے منہ میں جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شراب سے لاکھوں آدمی تباہ ہو گئے۔ سب کی آنکھوں کے سامنے اسکی مثالیں پیش آتی ہیں مگر پھر

بھی خلقت شرابخواری سے باز نہیں آتی۔ ہر ایک کو معلوم ہو گیا ہے کہ کوکین کھانے سے آدمی چند روز میں گھل گھل کر مرجاتا ہے۔ اس کا مال تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کی آبرو خراب ہوتی ہے حکومت جیلخانے بھجواتی ہے۔ مگر ہوس کی نابینائی اس کو کوکین سے باز نہیں رہنے دیتی۔ اور وہ دیدہ و دانستہ موت و بربادی کے منہ میں چلا جاتا ہے +

یہی حال قمار بازی کا ہے۔ عیاشی کا ہے۔ اور ہر اس چیز کا ہے جس میں جسمانی و روحانی خطرے ہیں جب عقلمند آدمی نہیں بچتا اور نہیں دیکھتا تو مکھی بیچاری کس گنتی میں ہے +

دام مگس مکھی کی لاشوں سے کالا ہو گیا میرا دل اس قتلِ عام کی سفاکی سے ہانپنے لگا تو میں نے اپنی گردن پورے چار گھنٹے کے بعد اوپر سے ہٹائی اور مکھیوں کی ارواح سے گفتگو کی ٹھہرائی +

روح مگس نمبر ایک

جس وقت اجل کا ہاتھ ایک مکھی کی روح کو مٹھی میں لے کر چلا تو میں نے دامن کو پکڑ لیا اور پوچھا کیا مجھ کو اجازت ہے کہ چند باتیں آپ کے قیدی سے دریافت کروں ؟ دستِ اجل نے ذرا تامل کے بعد جواب دیا +

قدرت نے مجھ کو اس کا اختیار نہیں دیا ہے۔ لیکن اے آدمی تیری انسانی عظمت کے سامنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو روح مگس سے مجھ کو روک کر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ پوچھ جو تیرا جی چاہے +

تب میں نے مکھی کی آزاد روح سے سوال کیا۔

تم قید جسم کے بعد اس حالت اور اس حالت میں کیا فرق دیکھتی ہو ؟

روح مگس۔ وہ کیفیت مجھ کو محسوس ہوتی ہے جس کا سمجھنا محال ہے۔ پہلے میں تعلقات جسم کے پردوں میں ایسی بند تھی کہ باہر آنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ اور جانکنی کے وقت مجھ پر

حسرتیں اور بے قراریاں بر سار کھی تھیں۔ مگر اب مجھ کو نظر آتا ہے کہ میں اپنے وقت کی ملکہ
ہوں دستِ اجل کی مٹھی میں بند ہوں لیکن تمام کائنات میری آنکھوں کے سامنے متحرک
نظر آتی ہے۔ میری آنکھوں سے عالم کی کوئی شئے پوشیدہ نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے
کہ موت پر میں ہزاروں بار صدقے قربان ہوں جس کی بدولت میں نے منزل راحت پائی ÷

میں :- کیا عالمِ علوی کو بھی مشاہدہ کرتی ہو ؟

روحِ مگس :- نہیں ابھی مجھ کو وہ بہت دور کچھ مٹا مٹا اور دھندلا دھندلا سا
دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کے وجود کو پاتی ہوں۔ مگر بیان کرنے اور تمیز کرنے کے
قابل نہیں۔ صرف اتنا کہ اس کے موجود ہونے پر یقین کر سکوں ÷

میں نے یہ سُنکر دستِ اجل سے کہا کہ اچھا اس کو لے جاؤ۔ باقی سوال
دوسری ارواح سے کیے جائیں گے۔ جب یہ روح غائب ہوگئی تو میں نے
دوسری مکھی کی روح کو روکا ÷

روحِ مگس نمبر ۲

دائی لی۔ اور آنکھوں کو
کہا اور پھر آسمان کو للچائی اور
تم بتاؤ کہ اس وقت بے خود ہو یا خودی میں ہو تمہاری نظروں میں اسقدر مستی تھی کہ مجھ کو

روحِ مگس :- قید سے آزاد ہوئی اور میں نے چاہا کہ جسم سے آزاد ہو کر اس
داری کا لطف اسوقت آیا ہے۔ حالانکہ
مگر درحقیقت عالمِ سفلی میں اپنی حرص و ہوس سے بہت بے قرار دیکھا تو کہا۔ عشق دنیا اچھا ہے،
قانون قدرت کے زبردست د
نہ اپنی طاقت سے نقل و حرکت کی کشش آزادی۔ عشق حیات ابدی کہو۔ یعنی یہ زندگی جو
کی مخفی سلطنت مجھ پر حکمراں تھی۔ نہ اور جو دوامی ہے اگر اسی کا نام تھا سے ہاں آخرت ہو
اس میں تو ہر ستی بے خود رہا آرزو کر دہ۔ اس دنیا کو لات مار دے یہ کہا اور یکایک

تم انسانوں کے حالات پر غور کرنے اور ان میں دخل دینے کی صلاحیت رکھتی ہو؟

روح مگس۔ ہاں اسوقت تو میرا ادراک ارواح انسانی کے بہت قریب ہو گیا ہے
میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ مجھ میں سمجھانے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔

اچھا تم کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نامی ایک مشہور شاعر نے آج کل ایک
کتاب لکھی ہے اور اس میں جسمانی و نفسانی خودی کو قایم کرنے اور دنیا کے تعلقات سے
محبت بڑھانے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ خودی کو مٹانا اور تعلقات دنیا سے
بے رغبتی سکھاتے ہیں وہ بڑے ہی احمق اور بے وقوف ہیں۔

روح مگس۔ ہاں ہاں۔ میری بصیرت اس مثنوی کو صاف دیکھ رہی ہے جس کا
نام اسرار خودی رکھا گیا ہے۔ اور جس میں حکیم افلاطون اور لسان الغیب حضرت
حافظ شیرازی کو نہایت سخت حقارت سے یاد کیا ہے اور ان کی پیروی کو خطرناک
کہہ آدمیوں کو اس سے روکا ہے۔

جب سے تم اس مثنوی کو دیکھ رہی ہو اور اس پر اتنی حاوی ہو گئی ہو کہ تم نے
پکڑ لیا اور پوچھا۔ کیا مجھ سے تو بتاؤ حضرت حافظ شیرازی کی روح اس توہین کی نسبت
کرمیں؟ دست اجل نے ذر

قدرت نے مجھ کو اس کا اختیالت سے بہت اونچا ہے۔ اب مجھ کو جانے
کے سامنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو روح پیدا ہوئی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ میں اس
ہے۔ پوچھ جو تیرا جی چاہے۔ آرزوؤں کی جانب متوجہ ہوں۔

تب میں نے مکھی کی آزاد روح سے صحبت کیا اور میری روح کو روک کر
تم قید جسم کے بعد اس حالت اور ا

روح مگس۔ وہ کیفیت مجھ کو محسوس ہوتی ہے
جسم کے پردوں میں ایسی بند تھی کہ باہر آنے کو میسا تو یہ حالت تھی کہ موت کی صورت

دیکھتے ہی دردناک آہیں کھینچتی تھیں اور مرنے کے نام سے ہراساں ہوئی جاتی تھیں یا یہ کیفیت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار اُڑی چلی جاتی ہو۔

روح مگس ۔ کہو کہو۔ جلدی کہو، وقت خراب نہ کرو۔ یہ کہکر روح مگس نے ایک ایسے پیارے انداز سے انگڑائی لی اور خمار آلود آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھاکر دیکھا کہ میں سینہ تھام کر رہ گیا۔ میں نے کہا۔ ہریالی۔ راج دلاری بنو۔ یہ تم کس کو دیکھتی ہو۔ یہ تمہاری انکھڑیوں میں لال لال ڈورے کیوں پڑے جاتے ہیں، یہ تم پر مستی کس بات کی چھا رہی ہے ؟

روح مگس۔ مسکرا کر اور اپنے وجود برقی کو کئی بل دیکر بولی۔ ارے آدمی کچھ پوچھتا ہے یا خواہ مخواہ مغز زنی کرتا ہے۔ کیا بتاؤں کیا ارمان ہیں، کیا کہیں کس کے گلے لگنے کی تمنا ہے۔ تو اپنی سوکھی فلسفیانہ باتوں کو جانے دے اور میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔

یہ کہکر مکھی کی روح نے پھر ایک جماہی کے ساتھ انگڑائی لی۔ اور آنکھوں کو بند کر کے بولی، بعد مدت کے غریبوں کا نصیبا جاگا، یہ کہا اور پھر آسمان کو للچائی اور شوق بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اب کے اُن نظروں میں اسقدر مستی تھی کہ مجھ کو اپنی قید عنصری سے نفرت ہونے لگی اور میں نے چاہا کہ جسم سے آزاد ہوکر اس بہار تک پہنچوں۔

اس روح کو جب میں نے بہت بے قرار دیکھا تو کہا۔ عشق دنیا اچھا ہے، یا عشق آخرت۔

دُنیا کیسی، آخرت کیسی۔ عشق آزادی۔ عشق حیات ابدی کہو۔ یعنی یہ زندگی جو اس وقت مجھ کو حاصل ہے اور جو دوامی ہے اگر اسی کا نام تمہارے ہاں آخرت ہو تو کہوں گی کہ عشق آخرت کی آرزو کرو۔ اُس دُنیا کو لات مارو۔ یہ کہا اور یکایک

غائب ہو گئی ٭

رُوح مگس نمبر (۴)

مجھ کو اس گفت و شنید میں ایسا مزا آیا کہ میں نے ہر مکھی کی روح سے بات چیت کا تہیہ کر لیا اور چوتھی مکھی کی روح سے مخاطب ہوا ٭

یہ بہت اُداس اور غمگین تھی، اور دستِ اجل کے آغوش میں چُپ چاپ گردن جھکائے بیٹھی تھی اس نے کہا کیوں تم افسردہ کیوں ہو؟ بولی اس لیے کہ قیدِ جسم کی تکان نے شل کر دیا ٭

آزادی نصیب ہوئی، مگر سارا وجود حرص و ہوس کی سابقہ زیادتیوں سے کچلا ہوا ہے۔ راحت ملی۔ مگر دیر میں۔ توانائی جلدی کہاں سے آسکے۔ رفتہ رفتہ زخموں کا اندمال ہو گا ٭

میں نے کہا، کیا مرنے کے بعد بھی تعلقات جسم کا خمیازہ روح پر باقی رہتا ہے؟

روحِ مگس۔ جزا و سزا اسی کا نام ہے۔ جو دُنیا کے تعلقات سے جی نہیں لگاتا اس میں ایک مسافر کی طرح رہتا ہے۔ کھاتا ہے۔ پیتا ہے۔ کماتا ہے۔ شادی بیاہ کرتا ہے عزت آبرو کے درجوں تک پہنچتا ہے مگر دل کو ان باتوں کا اسیر نہیں کرتا اور اس کو ہر وقت خدا سے لگائے رکھتا ہے تو مرنے کے بعد اس کی روح کو کچھ تکان نہیں ہوتی ورنہ میری طرح کہ دنیا میں بہت زیادہ زندہ رہی اور حرص و ہوس کی غلامی کو مآلِ زندگی سمجھا۔ کھانے اور مٹھاس کی تلاش و طلب کو مقصدِ حیات سمجھتی رہی اور آج جسم سے نکل کر بے انتہا کوفت اور پشیمانی اپنے اوپر پاتی ہوں، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

میں نے کہا، تم نے سُنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنی مثنوی اسرارِ خودی میں دُنیا کو دین پر مقدم بتاتے ہیں، اور عیشِ دُنیا کی طلب کو لازمی قرار دیتے ہیں؟

رنجِ مگس۔ آہ یہ اُن کی بھول ہے۔ اہلِ یورپ کی خوش حالی اور فروغِ دنیاوی نے ان کو دھوکہ دیا ہے، وہ چار دن کی چاندنی کو نورِ ابد تصور کرنے لگے۔ اُنہوں نے سائنس کی ترقی مشاہدات اور مادہ کی اوپری اُفتاد پر قیاس کر لیا کہ بس یہی چیزیں قابلِ تقلید ہیں۔ حالانکہ ان ترقیوں کی اور ان کے عیش و آرام کی بہت تھوڑی عمر ہے۔ وہ ہوس نفس کے بادلوں کی ایک بجلی ہے جو صرف ایک محدود موسم میں چمک کر رہ جاتی ہے وہ خواہشات سفلی کی برسات کے نالے ہیں جو چند ساعت چڑھاؤ دکھا کر اُتر جاتے ہیں۔ بقا اس کائنات میں کسی شکل کو نہیں ہے۔ ہر نیک و بد اسیر انقلاب ہوتا ہے مگر جس ہستی کی بُنیاد اُمید آخرت اور توکل خدا پر ہو اُس کو یہ دُنیا جلدی فنا ہونے سے بچاتی ہے اور جو خود اس دُنیا کے اسباب پر اپنی عمارت کی نیو رکھتا ہے اسکی چند روزہ ٹیپ ٹاپ تو بہت پُر بہار ہوتی ہے، مگر قایم نہیں رہ سکتی ایک جنبشِ فطرت میں برباد ہو کر گر پڑتی ہے ؛

ڈاکٹر اقبال کی نیت بُری نہیں ہے، اُنہوں نے اپنے اُستادوں کی تعلیم اور اس تعلیم کے وطن کی بود و باش سے یہ خیالات اخذ کیے ہیں ان کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بھائی بھی کامرانی اور عیش جاودانی حاصل کریں۔ لیکن شیطان نے جب کسی ذی عقل کو دھوکا دیا ہے تو اس طرح زینت دیکر اور اُس کی نیک نیتی میں شریک ہو کر دیا ہے ؛

میں نے اس افسردہ مکھی کے اتنے لمبے چوڑے لکچر کو سُنکر بہت تعجب کیا کہ جو مکھیاں مرنے کے بعد خوش تھیں اُنہوں نے بات کرنے سے گریز کیا اور یہ غمگین مکھی ایسی طول کلامی کرتی ہے ؛

اس پر میں نے اُس سے اسکا سبب پوچھا۔ مکھی بولی :-

جس طرح دُنیا میں راحت و آرام انسان کو دوسروں سے بے پروا اور بے خبر بنا دیتا ہے

اسی طرح مکھیوں کی ارواح اپنے سرورِ باطنی کی مصروفیتوں میں تجھ سے ہمکلام ہونا نہ چاہتی تھیں، اور آگے بڑھنے کو جہاں انکا مطلب تھا گھبراتی تھیں مگر میں کہ اب تک اسیرِ رنج و محن ہوں دوسروں کی تکلیف کا حس رکھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اور ارواح میری طرح مبتلائے عذاب نہ ہوں اسی واسطے میں نے ڈاکٹر اقبال کی مثنوی کی نسبت زیادہ گفتگو کی۔ کیونکہ مجھ کو نظر آتا ہے کہ جو اس کی پیروی کریگا وہ اپنی آخرت کے عیش کو تباہ کرے گا۔ اور جو اس سے بچے گا وہ دائمی حیات کے سرور کا حق دار ہوگا"

مکھی کی روح اتنا کہنے پائی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مکھی مار کاغذ کو جس پر صدہا لاشیں مکھیوں کی پڑی تھیں، اُڑا کے لے گیا۔ اس حادثہ کو دیکھکر مجبوراً عالمِ خیال سے اُلٹا پھرنا پڑا۔ اور ارواح کی بات چیت ادھوری رہ گئی ؀

میں اُٹھا اور قتیلانِ تجربہ کو اُٹھا کر لایا۔ سامنے رکھا اور کہا۔ اے بے حیا مکھیوں کے بے جان جسمو! تم اس حال میں کیسے سنسان پڑے ہو۔ کچھ اپنی ارواح کا بھی حال معلوم ہے۔ اگر تم سن سکتے ہو تو سنو کہ ان میں سے نیک اعمال بے فنا عیش میں مصروف ہیں اور دنیا کی طلبگار اعراف میں پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ میں تم کو اپنے گھر کے اندر یہ آواز اس لیے دیتا ہوں کہ یہ صدا غیب کی طاقتوں سے اُڑ کر ہندوستان بھر میں گونج جائے اور ہندوستان کے ہر باشندے کو اس کا آخری وقت یاد دلائے اور خدا کرے کہ یہ آواز پہاڑوں اور دریاؤں اور سمندروں تک سے عبور کر کے اثر کرے ؀

آمین

۷۸۶ — ھوالکل — یامعین
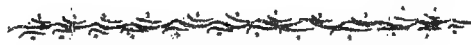
چوتھی منزل

دین و ملت

عورتیں کیا کر سکتی ہیں

(از وکیل مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء)

اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہوگیا ہے کہ مسلمان اپنی پچھلی حالت پر نہیں پہونچ سکتے۔ جب تک کہ اُن کی عورتوں کو تعلیمیافتہ نہ بنایا جائے۔ اسی لیے نئی روشنی کے جوان ہمہ تن کوشش میں ہیں کہ ہماری عورتیں بھی یورپ کی طرح خوب جی لگاکر لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اور عیسائی لیڈیوں کی طرح کھُلم کھُلا بازاروں میں گشت لگائیں لیکن ہمارے نوجوان یورپ کی ترقی دیکھکر ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، اگر اُن کو اپنی قدیمی ترقی کے اسباب معلوم ہوجاتے وہ ہرگز اس بیہودہ خیال پر توجہ نہ کرتے +

لازم ہے کہ وہ اپنے اُن بزرگوں کے حالات دیکھیں جن کے طفیل آج ہندوستان میں ہماری صورتیں نظر آتی ہیں +

حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے ایسا کونسا ہندوستانی ہے جو نا واقف ہے آپ کے والد سید غیاث الدین حسن سنجری نے رحلت فرمائی ہے۔ تو آپ کا سن شریف پندرہ برس کا تھا اور یہ عمر وہ ہوتی ہے کہ اس میں

آج کل کے صاحب پدر لڑکے بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کی والدہ حضرت بی بی سخا صفۃ الملکہؒ نے آپ کی اس قابلیت سے تعلیم و تربیت فرمائی کہ آپ کا زمانہ میں غلغلہ مچ گیا۔ ہندوستان جیسے اجنبی ملک میں مسلمانوں کا جھنڈا کسی دُرِ یتیم کے صدقے سے نظر آتا ہے۔ خیال کیا جائے۔ اگر حضرت خواجہؒ کی والدہ تعلیمیافتہ نہ ہوتیں تو کیا اس نونہال کی یہ مشہور سرسبزی ممکن تھی؟ آپ ہی کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی دہلویؒ ماں کی گود میں تھے کوئی ڈیڑھ برس کی عمر تھی، کہ آپ کے پدر بزرگوار خواجہ کمال الدین حسن کا وصال ہو گیا۔ آپ کی والدہ حضرت بی بی صالحہ نے پرورش کی۔ اور جب سن شریف چار سال چار ماہ چار یوم کا ہوا تو مکتب میں تحصیل علم کے لیے بٹھا دیا۔ آپ نے قرآن شریف کے پندرہ پارے اس سہولیت سے پڑھ لیے کہ اُستاد حیران رہ گئے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اپنی والدہ سے جو حافظہ قرآن تھیں اکثر یہ پارے پڑھتے سنا کرتے تھے۔ چونکہ ذہن بہت اچھا تھا۔ ان الفاظ نے پہلے ہی جگہ پکڑ لی تھی۔ اب تعلیم کے وقت کچھ دشواری نہ ہوئی۔

بی بی صالحہ نے اس قطب زمانہ کو جس علم سے تربیت کی تھی۔ ایسے ہی ہماری عورتوں کو بھی سکھایا جاوے۔ تاکہ اُن کے بچے بھی اسی طرح لایق و فایق بنیں۔

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید احمد صاحبؒ کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ آپ کی مادر محترمہ حضرت بی بی زلیخا نے تعلیم کے فرض کو اس خوبصورتی سے ادا کیا، کہ آج اُن کا قرۃ العین خدا کے محبوب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سولہ برس کے سن تک محبوب الٰہیؒ تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ یہ بی بی صاحبہ کی تعلیم کا اثر تھا۔ کہ آپ کو بچپن میں صبر و قناعت سے محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ جس دن ہمارے گھر میں فاقہ ہوتا والدہ صاحبہ فرماتیں۔ "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں"۔ یعنی آج گھر میں کھانے کو نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں

کہ مجھ کو والدہ صاحبہ کا یہ فقرہ بہت ہی مزہ دیتا تھا۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ متواتر کئی روز تک کھانے کو ملے جاتا تو میں دل ہی دل میں کہتا کہ "الٰہی وہ دن کب آئیگا کہ والدہ یہ فرمائیں کہ "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں"۔

بھلا یورپ میں کسی غریب اور مفلس بچہ کی ایک بھی ایسی ماں ہے کہ جس کا بچہ ناداری سے مکدر نہ ہوتا ہو۔ بلکہ اُلٹا خوش اور مگن رہتا ہو۔ نہیں۔ بلکہ وہاں تو طمع و حرص و اسراف کا سب سے پہلا سبق دیا جاتا ہے۔ تو کیا ان ہی عادات کے اختیار کرنے کے لیے مسلمان اُن کی عورتوں کی تقلید کرنی چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کو اِن مذکورہ خواتین کی حالت پر غور کرنا چاہیے۔ کہ اُنھوں نے کس علم کی بدولت اِس قسم کی قابلیت اور شائستگی حاصل کی؟ نہ پردہ دری سے۔ نہ کسی غیر زبان کے یاد کرنے سے۔ نہ کسی ترقی یافتہ قوم کی طرز معاشرت سیکھنے سے بلکہ محض اپنے کامل دین کے تعلیم کی بدولت۔ جس کو وہ پوری حد تک حاصل کرتی تھیں۔

اب بھی اگر مسلمان لڑکیوں کو زمانہ کی حالت کا لحاظ رکھکر تعلیم مذہبی دی جاوے تو وہ اُن کی آیندہ نسلیں پہلی سی ترقی حاصل کرسکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام سب کے نزدیک ظاہر و باطن کے درست کرنے کے لیئے ایک مکمل مذہب ہے۔

ایک ہائے اور کچھ نہیں

(از خاتون جولائی سنہ ۱۹۱ء)

اچھی اپا۔ یہ سختی کے دن کب جائیں گے۔ بے فکری کی نیند بھی کبھی میسر آئے گی یا یوں ہی ڈر اور خوف سے راتیں آنکھوں میں کٹیں گی۔ اچھا عالمگیر ہم کو کیوں ستاتے ہیں۔ خدا بھی ہماری مدد نہیں کرتا۔ اُس نے بھی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دُنیا گواہی

دیتی ہے کہ تخت دارا کا تاج دارا کا اور دین کے قاعدے کے موافق بھی آپ ہی تاج و تخت کے اصلی وارث ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمین آسمان دشمن ہیں۔ گھر سے بے گھر۔ جنگلوں میں بسیرا لیتے پھرتے ہیں۔ جب بھی لوگوں کو چین نہیں اور ہم کو دنیا سے فنا کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں۔ جواب دیا گیا:۔

دارا کی جان دل آرا۔ جو باتیں کل شام کو ہم نے بیان کی تھیں شاید تم نے اُن کو ذہن سے اُتار دیا۔ بیٹی ابھی زبردستی اور زبردستی کا نام دُنیا ہے یہی ناکامی اور کامیابی ہے جس کے چکر میں تمام عالم گرفتار ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری دُنیا بے مزہ ہو جائے۔ اسی اُلٹ پھیر سے یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ بھائی اورنگ زیب کا کوئی قصور نہیں۔ نہ خدا اور زمانے کی کوئی شکایت۔ قدرت کا دستور ہے کہ ایک بادشاہی کا تاج پہنتا ہے۔ دوسرا سولی دیا جاتا ہے۔ ایک پاؤں پھیلا کر بے فکری سے سوتا ہے۔ دوسرا ایک جھپکنے کو ترستا رہ جاتا ہے۔ لیکن پیاری اس کی خوشی اور اُس کا غم دونوں فانی ہیں۔ قرار ایک کو نہیں۔ بلکہ ذرا اور غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خوشی اور رنج فقط وہم و خیال ہے۔ خیال قابو میں ہو تو کیسی ہی سخت مصیبت پیش آئے انسان اُس کو ہیچ سمجھتا ہے اور اُس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو باتیں آج کل ہم کو پیش آ رہی ہیں۔ وہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو دی جاتی ہے۔ جس طرح ایک آدمی بادشاہ بنایا جاتا ہے اور اُس کے ذمے حکومت کے فرائض لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک غریب کو بھی غربت کی خدمت سپرد کی جاتی ہے۔ بادشاہ کو دولت کی شان سے اپنے کام عمدگی سے پورے کرنے چاہئیں اور غریب کو غریبی کی حیثیت سے اس خدائی نوکری کو بجا لانا چاہیے +

بھائی اورنگ زیب سے میں اتنا بھی مقابلہ نہ کرتا جتنا کیا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آیا واقعی قدرت نے اس کی بادشاہت قبول کرلی ہے یا نہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ بے شک خدا تعالیٰ اس کی حکومت اور میری غربت چاہتا ہے۔ یہ ہے تو میں ہر طرح راضی ہوں اور نگ زیب جس طرح چاہے ستائے ہماری سرکوبی اور بیخکنی کی جیسی چاہے تدبیریں کرے۔ اس کے لئے یہی شایان ہے۔ کیونکہ اس کو شاہی طرز کی نوکری پوری کرنی ہے۔ ہم کو سب سختیاں برداشت کرنی چاہئیں۔ کیونکہ ہمارے ذمہ غربت بے کسی لاچاری اور ہر طرح کی مصیبت لگائی گئی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسا +

دارا شکوہ کی یہ تقریر سنکر اس کی بیٹی دل آرا بولی +

یا اللہ۔ دل میں اور خلجان پیدا ہوا۔ آپ روز سمجھاتے ہیں۔ مگر مجھ بے وقوف کی عقل میں نہیں آتا۔ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جو چیز آنکھوں کو نظر آتی ہے۔ اور جن چیزوں کی صورت خیال کرنے سے ذہن میں جمتی ہے سب کی حقیقت ایک ہے۔ شکلیں الگ الگ ہیں جیسے مٹی کے برتن۔ ایک مٹکا ہے۔ تو ایک آبخورہ ایک کونڈا ہے اور ایک چینی۔ نام الگ الگ کام الگ الگ شکل و صورت الگ الگ مگر مٹی سب کی ایک۔ یا مثلاً ایک ڈورا ہے جس میں کئی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ گرہ ایک ابھری ہوئی صورت کا نام ہے۔ مگر اصل اس کا ڈورا ہے۔ جو لپٹ کر گرہ بن گیا ہے۔ پہلی چیز جو مسلمان بچہ کو سکھائی جاتی ہے وہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ جس کے معنی عام طور پر یہ بتلائے جاتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں۔ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ کلمہ ہی تمام دین و دنیا کی بنیاد بتا دیتا ہے۔ اگر اس کے معنی یوں سمجھائے جائیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں یا لفظی معنی کہ نہیں ہے کچھ مگر خدا۔ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ ابا جان یہ تعلیم میں نے اپنے استاد مولوی صاحب سے بیان کی تھی وہ یہ سنکر بہت ناراض

ہوئے اور فرمایا کہ یہ شرک کی باتیں ہیں۔ ان میں پڑکر آدمی کافر ہو جاتا ہے ۔ دارا شکوہ نے ہندوؤں کی صحبت اور ان کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ باتیں سیکھی ہیں۔ دین اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور سب مخلوقات اس نے بنائی ہے۔ مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے۔ درخت بھی خدا۔ اور جانور و آسمان و زمین بھی خدا۔ توبہ توبہ بالکل کفر کے کلمے ہیں۔ سو حضرت اول تو میں پرسوں کی باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ آج آپ نے یہ اور نئی باتیں سنائیں کہ مصیبت بھی ایک نوکری ہے جس کو خوشی خوشی بجا لانا چاہئے۔ پرسوں کی باتوں کی نسبت مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ ہندوؤں کی ویدانت کا مسئلہ ہے جس کو مسلمانوں میں صوفیوں کا گروہ بھی ان کا دیکھا دیکھی ماننے لگا۔ اور آج کی تقریر سنکر تو میں پیشگی حکم لگاتی ہوں۔ کہ مولوی صاحب اس بالکل مسلمانی کے خلاف بیان کریں گے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میرے جی کو بھی مولوی صاحب کی باتیں لگتی معلوم ہوتی ہیں۔ بھلا جس کا ذکر قرآن شریف میں نہ ہو وہ ہم کس طرح مان لیں۔ اور بات بھی ایسی کہ سب چیز خدا ہے۔

الٰہی تیری پناہ! دل آرا کی شکایہ باتیں سنکر دارا شکوہ کو جوش آ گیا۔ مگر وہ جوش خفگی و نا رضگی کا نہ تھا۔ بلکہ جس طرح کوئی آدمی جانی پہچانی چیز کا انکار کسی نادان کی زبانی سنکر افسوس کے جوش میں آ جاتا ہے۔ ایسے ہی دارا کے چہرے پر جوش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور نہایت بے پروائی سے بولا۔ دیوانی۔ اس چیز کے وجود پر شبہ کرتی ہے جو سورج کی طرح ظاہر ہے مولوی صاحب کی ناسمجھی ہے جو قرآن شریف کو اس تعلیم سے خالی بتاتے ہیں۔ اری نادان قرآن کے دل میں انہیں باتوں کا خزانہ ہے۔ ظاہری الفاظ پر عمل کرنا بیکار ہے اصلی معانی پر غور کرنا چاہئے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ وہ سب پر محیط ہے۔ وہ اول ہے۔ آخر ہے۔ ظاہر ہے

باطن ہے نیچے ہے، اوپر ہے، اس کے بہت سے نام ہیں۔ مگر جس طرح قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ ہدایت انہیں کو ہے جو غور کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ غور نہیں کرتے۔ بیشک ویدانت کے بھی یہی اصول ہیں، لیکن اسلام کی تعلیم اگر اس کے موافق ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کب کہا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنا چاہئے۔ وہ تو میری مثال سے خیال میں آسکتا ہے۔ کہ جبتک آبخورہ اپنی صورت پر اور مٹکا اپنی شکل پر قایم ہے اس کو مٹی نہیں کہہ سکتے۔ یا جب تک ڈورہ میں گرہ ہے گرہ نام رہیگا۔ ڈورا نہیں کہا جائے گا۔ لیکن سمجھنا یونہی چاہئے کہ حقیقت سب کی ایک ہے۔

رہی دوسری بات کہ رنج و راحت آدمی کے فرائض ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے جب ہم نے یہ مان لیا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں یعنی جو کچھ ہے سب خدا کا ظہور ہے تو کہیں اس کی شان کرم ظاہر ہے۔ اور کہیں شان غضب۔ ایک کانٹے دار درخت جسمیں پھول پھل نہیں آتے۔ شکایت کرے کہ دوسرے درخت میں پھول بھی خوبصورت ہیں اور پھل بھی مزے دار ہیں مجھے اس سے محروم کیا گیا تو ہم یہی جواب دیں گے کہ تجھ کو وہ میسر ہے جو پھول دار پھلدار درخت کو نصیب نہیں جو شان تجھ میں ہے وہ اس میں نہیں۔ جو اس میں ہے وہ تجھ میں نہیں۔ پھر شکوہ کرنا لاحاصل ہے۔ دل آرا! یہ ایسی اچھی تعلیم ہے کہ اگر انسان اس کو خوب سمجھکر ذہن نشین کرے تو دنیا کے عیش و راحت اور رنج و غم کے جھگڑوں سے آزاد ہو جائے۔ دنیا کا ترک اسی کا نام ہے کہ اس کے اتار چڑھاؤ کی تکلیف جاتی رہے یہ نہیں کہ انسان مال و دولت، جورو بچے چھوڑ بیٹھے سوپیاری جب میں اپنے بھائی سے برتاؤ کا شاکی نہیں تو تو کیوں شکایت کرتی ہے۔ پس ہر وقت اس خیال میں غرق رہ کہ

"ایک ہے اور کچھ نہیں"

دعا

(از نظام المشائخ جولائی ۱۹۰۹ء)

دعا مذہبی زندگی کی جان ہے اہل مذہب کے نزدیک مذہب کی عملی صورت کا ظہور بہت کچھ دعا پر منحصر ہے۔ دعا سے مطلوب کا حاصل ہونا اور پیغمبران الٰہی کا خاص خاص مطالب کیلئے دعا مانگنا اور اس کا قبول ہونا آسمانی کتابوں سے ثابت ہے۔

اسلام میں دعا کا مرتبہ ضروری اور اہم عقائد میں شمار کیا جاتا ہے مسئلہ ذات و صفات اور فطرۃ اور قوانین فطرۃ کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق ہے۔ اور اسکی نسبت صدہا مختلف رائیں اور جداگانہ اقوال بزرگان اسلام کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں قرآن شریف میں ارشاد ہے وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ - یعنی اور جب تم سے میرا بندہ مجھ کو طلب کرے (تو کہدو) کہ میں اس کے قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کا سوال جبکہ وہ مجھ سے مانگے" دوسری جگہ فرمایا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔

دعا چونکہ تمام رسولوں کا ورثہ ہے۔ جو اُمتِ مرحومہ کو عطا ہوا اور جس میں خدا تعالیٰ نے اعجاز رسالت کی شان باقی رکھی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو دعا کے معاملہ میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک فرقہ دعا کی تاثیر کا بالکل منکر ہے۔ دوسرا اس کے اثر کو خیالی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن شریف کی اس آیت اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو کچھ دعائیں مانگو قبول کیا جائے گا کیونکہ اس میں دو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اول یہ کہ ہزاروں دعائیں نہایت عاجزی اور خلوص سے کی جاتی ہیں۔ مگر سوال پورا نہیں ہوتا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ خدا نے استجابت کا وعدہ فرمایا ہے دوسری یہ کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدر

ہیں اور جو نہیں ہونے والے وہ بھی مقدر ہیں۔ ان مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں ہو سکتا پس استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا کرنا قرار دیے جائیں تو خدا کا یہ دعوہ کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ان سوالوں پر جن کا ہونا مقدر نہیں ہے صادق نہیں آسکتا یعنی ان معنوں کی رو سے یہ عام وعدہ استجابت دعا کا باطل ٹھیرے گا۔ کیونکہ سوالوں کا وہی حصہ پورا کیا جاتا ہے جسکا پورا کرنا مقدر ہے۔ لیکن استجابت دعا کا وعدہ عام ہے جسمیں کوئی بھی استثنا نہیں۔ پھر جس حالت میں بعض آیتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ جن چیزوں کا دیا جانا مقدر نہیں دی جاتیں۔ لہذا استجابت دعا کے یہ معنی لینے چاہئیں کہ دعا ایک عبادت ہے اور جب وہ قلبی خشوع وخضوع سے کی جائے تو اس کے قبول کرنے کا خدا تعالی نے وعدہ فرمایا ہے۔ گویا دعا عبادت متصور ہو کر عطائے ثواب کا مستحق بناتی ہے۔ اور کسی خاص مسئول عنہ کے حصول سے اسی حد تک تعلق ہے کہ مسئول داعی کے نصیب میں مقدر بھی ہو۔ اس قاعدہ سے دعا کا اثر بے کار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو چیز دعا میں مانگی گئی تھی وہ تو مل گئی مگر اس کو تاثیر دعا سے کچھ لگاؤ نہیں۔ تقدیر کی خوبی سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا۔ دعا کا صرف یہ فائدہ ہے کہ دعا کرنے کے وقت خدا کی عظمت اور بے انتہا قدرت کا خیال دل میں جم جاتا ہے تو خیالات کی لہریں بھی جمع ہو کر ایک مرکز پر ٹھہر جاتی ہیں۔ اور انسان کی پریشانی و گھبراہٹ جو کسی خاص فکر سے پیدا ہوئی ہو مغلوب ہو کر صبر و استقلال سے بدل جاتی ہے اور استقلال کی کیفیت کا دل میں ہونا عبادت کے لئے لازمی امر ہے پس یہی دعا کا مستجاب ہونا ہے۔

دوسرا فریق دعا کی قبولیت پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک دعا کا نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ مذکورہ اعتراض کے جواب میں کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں۔ تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لئے

ایسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور موثر ہونے میں کسی عقلمند کو کلام نہیں پہلے فرقہ نے دعا اور ترک دعا میں جس تقدیر کا ذکر کیا وہ تقدیر دوا میں بھی تو موجود ہے مگر سب دیکھتے ہیں کہ دوا کے اثر کو ایسا یقینی مانا جاتا ہے کہ تقدیر کا خیال بھی نہیں آتا اور دوا سے دوری مرض کا پختہ یقین ہوتا ہے جسمانی معاملات میں تو تقدیر کا لحاظ نہ کیا جائے اور روحانی مسئلہ میں تقدیر کو شامل کر کے تاثیر دعا کا انکار کر دیا جائے یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔

ادعونی استجب لکم میں بیشک دعا سے عبادت مراد ہے چنانچہ نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الدعاء ھو العبادۃ ثم قرأ ادعونی استجب لکم۔ یعنی فرمایا۔ دعا عبادت ہے۔ اس کے بعد آیت ادعونی استجب لکم تلاوت فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دعا کی تعلیم امر کے صیغہ سے کی گئی ہے گویا دعا کو فرض کر دیا گیا ہے حالانکہ دعا انسان پر فرض نہیں ہے پس معلوم یہ ہوا کہ اس آیت میں دعا سے عبادت ہی مقصود ہے لہذا جو فریق استجابت دعا کے یقینی ہونے کو اس آیت سے نکلکر مسئلہ تقدیر کے ذریعہ سے اشکال پیدا کرتا ہے اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ آیت عبادت کے متعلق ہے۔ ہاں اس کے علاوہ اور کئی آیتیں ہیں جنسے قبولیت دعا ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایک آیت میں تو گویا صاف صاف انہیں شکوک کا جواب دیا گیا ہے۔ جو سورہ انعام میں ہے بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَآءَ تم خاص اسی سے دعا مانگتے ہو تو وہ دیدیتا۔ تمہارے مطلوب کو اگر چاہے۔ یہاں تقدیر کا صاف طور سے ذکر کر دیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں کوئی چیز تقدیر سے خالی نہیں۔ آگ جلا دیتی ہے۔ پانی ڈبو دیتا ہے ان تاثیرات سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر اثر تقدیر کے وقت ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی دعا

بھی آگ کی طرح یقینی اثر دار چیز ہے۔ دواؤں کی مثل خدا نے اس میں تاثیر پیدا کی ہے مگر جس طرح تقدیری گردش کے سبب باوجود دوا استعمال کرنے کے مریض کو فائدہ نہیں ہوتا۔ دعا کا نتیجہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

آج کل نئی روشنی کے مسلمانوں میں یورپ کی تقلید کے سبب دعا سے بے توجہی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اس کو ایک فعل عبث خیال کرنے لگے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کے دل کو مصیبت کے وقت تسلی وتسکین کسی صورت سے میسر نہیں آتی۔ کیونکہ دعا کا مانگنا صرف اس یقین پر مبنی ہے کہ خدا تعالیٰ قادر مطلق اور فاعل مختار ہے بیقرار دل کی نکلی ہوتی دعا کا سننے والا اور اس کی حاجت پوری کرنے والا ہے اگر ایک لحظہ کے لئے اس یقین میں تذبذب ہو تو کون سا دل ہوگا جو بیقراری کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرے اور وہ کون سا خیال ہوگا جو اس کے اضطرار کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ اس لئے کہ صرف یہ خیال کہ دعا میں سننے اور حاجت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے اضطرار کی حالت میں بندہ کا خیال خدا کی طرف رجوع کراتا ہے اور محض اس اعتقاد سے کہ باوجود قدرت کے خدا کا دعا قبول نہ کرنا کسی مصلحت پر مبنی ہوگا اور وہ مسئول عنہ سے بہتر کوئی چیز دے گا۔ دعا کرنے والے کے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ اگر دعا کا عمل موقوف ہوگیا اور خدا سے دعاؤں کے سننے اور حاجتوں کے پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا تو مذہبی زندگی بھی ختم ہوگئی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دعا ذریعہ حصول مقصد نہیں ہے اور یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بندوں کی مصیبتوں کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ کسی کی گریہ وزاری اور اضطرار و بے قراری کا اثر ہوتا ہے تو دعا بے کار اور توکل فضول ہے۔ پھر یقین اور اعتقاد کو بھی اپنے قدم جمانے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ اور بندہ کو بجز اس کے کہ وہ غیر تغیر پذیر قوانین فطرت کو اپنا خدا مانے دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں انسان کو نے بے جان

قانون سے واسطہ رہتا ہے اور ایک زندہ خدا سے۔ اور یہ خیال اس محبت کے رشتے کو جو خدا اور اس کے بندوں کے بیچ میں ہے توڑ دیتا ہے۔ اگر اس میں مدد کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ہم کس لئے اس پر بھروسہ کریں۔ اگر وہ ہماری دعائیں نہیں سنتا تو ہم کیونکر اسے رحیم مانیں۔ اور اس میں رحم نہیں تو ہم کیوں اس سے محبت کریں۔ بس اس عقیدہ سے ہمارا یقین جاتا رہتا ہے۔ ہم کو خدا سے محبت باقی نہیں رہتی اور ہم ایسے مذہب کے ماننے والے رہ جاتے ہیں جس میں نہ یقین ہے نہ محبت۔ لہذا اگر دعا کی اجابت ناممکن ہے تو مذہب بھی ناممکن ہے۔

صوفیہ کرام کے تمام سلسلے اجابت دعا کے قائل ہیں اور صرف قائل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو خدا کی طرف سے تاثیرات دعا کا وہ مرتبہ عطا ہوا ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کو حاصل تھا۔ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نبوت کے آثار میں اس امت کو مقبول دعا دی گئی ہے یعنی جس طرح اگلے زمانہ کے پیغمبر دعا کے ذریعہ سے اپنے اعجاز دکھاتے تھے۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولیا اسی دعا سے کرامتیں دکھانے پر قادر بنائے گئے ہیں۔ آیندہ پرچہ میں خدا نے چاہا تو ہم ثابت کرینگے کہ صوفیوں کے مختلف خاندانوں کے مشایخ کی دعا کی کیا کیا تاثیریں ظاہر ہوئی ہیں چشتیوں قادریوں نقشبندیوں سہروردیوں وغیرہ کل سلسلوں کے بزرگوں نے اپنی ذات اور قوم کے لئے دعائیں کی ہیں اور اگر ہر دعا کے الفاظ علیحدہ علیحدہ و نظر تعمق سے دیکھے جائیں تو صاحب دعا بزرگ کی باطنی کیفیت و اندرونی احساس اور جذبہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔ پھر کبھی اس کو وضاحت سے لکھا جائے گا۔

اب یہ بات ثابت کر چکے کہ دعا میں تاثیر ہے اور دعا ہمارے صوفیہ کرام کے کل فرقوں کی مسلمہ چیز ہے اس رسالہ کا شروع جو صوفیوں کی دینی و دنیوی اغراض کی خدمت

گزاری کے لئے جاری کیا جاتا ہے اور جسکا آج پہلا پارہ نمودار ہوتا ہے) دعا سی کرتے ہیں یقین ہے کہ جس طرح خدائے تعالےٰ نے صوفیائے کرام کی دعاؤں میں تاثیر عطا فرما کے اُن کو ہمیشہ مقبول فرمایا اسی طرح اُن کا یہ ماہوار رسالہ بھی اپنی دعا کے ذریعہ سے بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگا اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہونچائے گا۔

گلیم درویشی کی تنگی

اور

ایک المناک فسانہ

(از نظام المشائخ ۱۹۱۰ء)

اگلے وقتوں میں کہا کرتے تھے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے۔ مگر دس درویش ایک کمبل میں بسر کر سکتے ہیں۔ آجکل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ بادشاہت کا تو یہ عالم ہوگیا کہ ہر فرد واحد اپنے تئیں ملک کا حاکم سمجھتا ہے جس سے ایک اقلیم میں کروڑوں بادشاہ نظر آتے ہیں۔ اور درویشوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ ایک گلیم میں دس تو کجا دو درویش بھی نہیں سما سکتے۔ قادری ہوں یا نقشبندی چشتی ہوں یا سہروردی سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اصول کے لحاظ سے ان میں کوئی بین فرق یا تفاوت نہیں ہے۔ فروعات ہر مشرب کی علیحدہ ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ فروعات کے جھگڑوں سے ان سلسلوں میں ایسی اجنبیت اور غیریت قائم ہوگئی ہے کہ باہم ایک دوسرے سے جدا نظر آتا ہے سب سے پہلے تفریق حد سے زیادہ محبت کرنے سے پیدا ہوئی یعنی اپنے سلسلہ کے مشائخ سے جب مریدین کو تعلق بڑھا۔ تو انھوں نے اس کو اتنا بڑھایا کہ اور تمام مشائخ کو پست

کردیا۔ یہ کیفیت دیکھکر دیگر مشائخ کے متوسلین نے بھی اپنے بزرگوں کو ناجائز طور سے دوسروں پر ترجیح اور فوقیت دینی شروع کی۔ اور اس طرح درویشی خاندانوں میں نفسانی کشمکش شروع ہوگئی سب سے پہلے قادری سلسلہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ یہ لوگ حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی کو تمام مشائخ عالم پر ترجیح دیتے ہیں اور حضرت غوث الثقلینؒ کا یہ قول کہ قدمی علی رقبۃ کل ولی اللہ (یعنی یہ میرا قدم سب ولیوں کی گردن پر ہے) اس مشد و مد سے بیان کرتے ہیں جس سے دوسرے خاندان والے بتقاضائے بشریت مشتعل ہوں۔ اس کے بعد چشتیہ طریق کی آزادی اور نقشبندیہ طریق کی محدود خیالی کی نسبت لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی۔ خود چشتیہ خاندان میں کئی شاخیں ہوگئیں۔ نظامی صابری جمالی۔ اور ان شاخوں میں بھی وہی فضیلت کے جھگڑے برپا ہوگئے۔ نظامی کہتے ہیں کہ حضرت بابا گنج شکرؒ کے اصلی جانشین اور خلیفہ اعظم حضرت خواجہ نظام اولیا محبوب الٰہی ہوئے۔ صابری کہتے ہیں کہ تمام باطنی امور کا حصہ حضرت مخدوم صابرؒ کو ملا۔ جمالی کہتے ہیں کہ جو نظر خاص حضرت باباصاحب کی حضرت قطب جمال الدین ہانسویؒ پر تھی وہ کسی اور کو میسر نہ ہوئی۔ نقشبندیوں میں مجددیہ شاخ کے دعوے تمام خاندان سے نرالے ہوگئے۔ حضرت شیخ احمد مجدد سرہندیؒ کے ایسے عجیب و غریب دعوے اور ایسے ایسے فضائل بیان کئے جاتے ہیں جو تمام متقدمین مشائخ نقشبندیہ سے مجددؒ صاحب کو بڑھا دیتے ہیں۔

الغرض نہایت سخت کشمکش میں سلسلوں معمولی باتوں کے سبب پڑی ہوئی ہے جس قدر ذکر کیا گیا یہ سب محبت یا علم سے متعلق ہے ہر شخص اپنے بزرگ اور اپنے شیخ کو سب سے بڑھکر سمجھتا ہے **یہ کوئی شکایت کی بات نہیں ہے**۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس دعوے میں دوسرے بزرگوں کی تحقیر اور تنقیص کی جاتی ہے ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جہاں دو شخص جمع ہوتے ہیں اور ان میں ایک چشتی ہوتا ہے اور ایک قادری تو وہ بجائے اس کے کہ کسی مسئلہ تصوف پر بات چیت کریں فضیلت حضرت

غوث الاعظمؒ اور حضرت خواجہ خواجگان اجمیریؒ پر گفتگو کرتے ہیں ایک کہتا ہے کہ حضرت غوث الاعظمؒ سے حضرت خواجہ بزرگؒ نے فیض پایا۔ دوسرا کہتا ہے نہیں بلکہ حضرت غوث الاعظمؒ حضرت خواجہؒ بزرگ سے فیضیاب ہوئے۔ ان فضول باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں بزرگوں کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرنے لگتے ہیں اور اس نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں جو ادب اور تعظیم سے حاصل ہوا کرتی ہے +

ہم کو بڑا افسوس ہوتا ہے جب ہم سماع کی محفلوں میں حضرت صاحب صابرؒ صاحب کا نام قوال کی زبان سے سنکر نظامی درویشوں کو یہ نام لینے سے منع کرتے ہوئے پاتے ہیں ایسے ہی صابری محفل محبوب الٰہیؒ کا نام لینے سے قوال کو روکا جاتا ہے تو بیحد قلق ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی دانست میں حضرت محبوب الٰہیؒ اور حضرت مخدوم صابرؒ کی محبت اس میں سمجھتے ہیں کہ دوسرے بزرگ کا نام نہ لیا جائے حالانکہ یہ ان کی کور باطنی اور جہالت ہے۔ یہ سب بزرگ ایک شان رکھتے ہیں۔ ان میں تفریق کرنا ملتِ عشق میں کفر کی برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (یعنی ہم کسی رسول کے (مرتبہ) میں فرق نہیں کرتے) اولیاء اللہ مثل انبیاء ہوتے ہیں۔ پھر بھلا ان میں تفریق کیونکر ہو سکتی ہے +

الغرض گلیم درویشی کی وسعت کو تنگ خیال لوگوں نے اس قدر چھوٹا کر دیا ہے کہ اس میں ایک درویش بھی نہیں سما سکتا۔ اوپر جتنی باتیں لکھی گئی ہیں یہ سب تو ایک حد تک محبت یا علمی روایتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ افسوس آج کل کے زمانہ پر ہے کہ محض دنیاوی اور نفسانی کدورتوں سے مشایخ میں تفریق اور جدائی پھیلی جاتی ہے نقشبندی۔ قادری۔ سہروردی چشتی تو خیر الگ الگ خاندان ہیں غضب تو یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی مختلف شاخوں میں اس قدر عناد پایا جاتا ہے۔ کہ کوئی نہیں

کہہ سکتا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے ۔

مثلاً نقشبندیہ طریق میں مجددی حضرت غیر مجددی لوگوں سے بالکل ناآشنا اور بے غرض ہیں۔ اور ان کو سوائے مجدد صاحب کے اپنے سلسلہ میں اور کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ امیر حبیب اللہ خاں والی کابل جب ہندوستان میں آئے تو تمام مشہور مزارات پر حاضری دی۔ مگر حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزار کی زیارت کو نہ گئے۔ کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ مجدد صاحبؒ کے پیر و مرشد کے مزار کی زیارت بیکار سمجھی گئی مگر اس میں شاہ کابل کا کوئی قصور نہیں ہے اگر ان کو بتایا جاتا کہ مجدد صاحبؒ کے شیخ کا مزار دہلی میں ہے۔ تو وہ ضرور حاضر ہوتے۔ مگر جو حضرات اُن کے گرد و پیش تھے وہ سب مجدد صاحب مجدد صاحبؒ کے مقابلہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ یا سمجھتے ہیں تو بہت معمولی۔ ورنہ وہ ضرور شاہ کو وہاں کی حاضری کے لئے آمادہ کرتے ۔

اسی طرح چشتیوں کا عالم ہے۔ ان کی ایک مشہور شاخ نظامیہ پر غور کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا فخر الدینؒ سے پنجاب اور پورب میں کئی مسندیں نظامیوں کی قایم ہوئیں۔ بریلی میں نیازیہ۔ تونسہ شریف میں سلیمانیہ فخریہ خاندان کی مشہور شاخیں ہیں۔ مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ سلیمانیہ اور نظامیہ مشایخ میں کبھی اس قسم کا ارتباط پیدا ہوا ہو جو ہم طریقہ اور ہم سلسلہ مشایخ میں ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے پنجاب میں فخریہ سلسلہ سے جس طرح تونسہ شریف میں سلیمانیہ مسند قایم ہوئی اسی طرح چاچڑاں شریف میں حضرت قاضی محمد عاقل صاحب کی خانقاہ بڑی مشہور اور با اثر مانی جاتی ہے۔ اس خانقاہ کے مشہور سجادہ نشین حضرت غلام فرید صاحب تھے جن کا ابھی حال میں وصال ہوا ہے۔ اور تونسوی خانقاہ میں خواجہ غلام فرید صاحب کے ہمعصر حضرت خواجہ اللہ بخشؒ صاحبؒ تھے جن کی رحلت کا زمانہ بھی خواجہ غلام فرید صاحب کے

قریب واقع ہوا۔ ان دونوں حضرات کی نسبت مشہور تھا کہ تعلقات کشیدہ رکھتے ہیں
مگر مہار شریف کے عرس میں ایک دفعہ یہ دونوں بزرگ جمع ہوگئے۔ اور باہمی ملاقاتیں
ہوتیں۔ جس خلوص اور تپاک سے ان بزرگوں نے باہم ملاقات کی ہے وہ اس بات
کا نمونہ تھا کہ مشائخ ایسے عمدہ اخلاق رکھتے ہیں۔ عوام کی سب غلط فہمیاں دور ہوگئیں
اور جو فرضی روایتیں کشیدگی اور رنجش کی مشہور تھیں مجمع کی ایک ہی ملاقات میں صاف
ہوگئیں۔ مگر افسوس ان بزرگوں کے بعد ان کے جانشینوں نے رسم مودت واتحاد
کو تازہ نہ کیا۔ ہر ایک اپنے مشاغل میں مصروف ہے۔ اور اس عظیم الشان ضرورت
کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

جس قدر بڑے بڑے عرس نظامیہ خانقاہوں میں ہوتے ہیں وہاں سوائے
ان ہی مشائخ کے جن کو صاحب عرس سے کچھ تعلق ہے اور کوئی عرس میں نہیں آتا اور
آتے ہیں تو اس طرح کہ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا
ہے کہ اجمیر شریف میں چشتیوں کے تمام مشائخ خواہ وہ کسی شاخ کے ہوں جمع ہوتے
ہیں اور محفل سماع میں بازو سے بازو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان سے پوچھا جائے
کہ چھ دن کی محفلوں میں تم نے کتنے مشائخ سے واقفیت حاصل کی۔ تو وہ جواب دیتے
ہیں کہ ہم واقفیت حاصل کرنے نہیں جاتے ہمارا مقصد سماع کی شرکت ہوتا ہے۔ اس
میں کوئی شک نہیں محفل سماع کے آداب کے خلاف ہے کہ وہاں بات چیت اور
کلمہ کلام ہو۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان مشائخ کے باہمی میل جول کا اور ایک جگہ
جمع ہونے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آسکتا۔ اگر سماع سے پہلے
یا بعد کوئی وقت ایسا مقرر کیا جائے جس میں مشائخ آپس میں میل جول اور تبادلہ
خیالات کریں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ بات جب ہی ہوسکتی ہے کہ مشائخ اس کی
ضرورت اور اہمیت اور مفاد کو سمجھتے بھی ہوں۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ ہر بزرگ

سے مصافحہ کرنا یا آنکھ ملانا اپنی شان اور وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔ پھر کیونکر یہ رسم جاری ہوسکتی ہے کہ "ملاقاتی محفل" قایم ہو۔

قصہ مختصر اس تنگ خیالی اور نقصان رساں کشیدگی اور علیحدگی کو سالہا سال مشاہدہ کرنے کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دور کرنے کا خیال مشایخ میں پیدا کر دیں۔ اور یہ خیال جب ہی پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کے سامنے بزرگوں کی مثالیں پیش کی جائیں اور دکھایا جائے کہ مشایخ قدیم کا باہمی برتاؤ کیسا تھا اور تم آج کل کیا برتاؤ کر رہے ہو۔ ان کا طرز عمل دین و ملت کے لئے مفید تھا یا تمہارا۔ خدا کو منظور ہے تو ان اوراق میں ہم کل سلسلوں کے مشایخ متقدمین کا وہ تذکرہ شایع کرتے رہیں گے جس سے ہمارا مذکورہ مقصد ہویدا ہوسکے۔ سر دست چشتیوں اور سہروردیوں کے پرانے تعلقات لکھے جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ان ہی سلسلوں کا قدم پہلے آیا تھا۔ گو آج کل سہروردی طریقہ کی اشاعت عام نہیں ہے۔ مگر جس زمانہ کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں وہ سہروردیوں کے عروج و کمال کا زمانہ تھا۔ امید ہے کہ تمام مشایخ عظام ان واقعات کو غور و خوض اور تعمق سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

التمش کی خرقہ پوشی

قبل اس کے چشتیوں اور سہروردیوں کے تعلقات کا ذکر شروع کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہان ہند کے مذہبی خیالات کا تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے۔

جب شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان فتح کر لیا تو اس کے نائب اور غلام قطب الدین ایبک نے پایہ تخت کی بنیاد دہلی میں قایم کی اور فتح کی یادگار میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار بنانا شروع کیا۔ یہ بادشاہ درویشوں کی طرف خاص میلان

رکھتا تھا۔ مگر اس کی زندگی نے بہت کم وفا کی۔ اس کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ عموماً سب چشتیہ طریق کے تھے۔ کیونکہ دہلی میں چشتیوں کے بہت بڑے پیشوا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اجمیری خواجہؒ کے دربار کی جانب سے تشریف رکھتے تھے۔

ان غلام بادشاہوں میں سلطان شمس الدین التمش سب سے بڑھ گیا۔ اور اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس قدر عقیدت پیدا کی کہ حضرت کے ممتاز مریدوں میں شمار ہونے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اس کو خرقہ خلافت بھی عطا فرمایا تھا۔ اور حضرت کے وصال کے بعد اسی بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کا غسل میت کیا۔ مشائخ میں خیال کیا جاتا ہے کہ التمش کو مرتبہ قطبیت بھی حاصل ہوا تھا۔ بہرحال التمش کی خرقہ پوشی اور چشتیہ خاندان سے گرویدہ ہونے کے سبب ملک میں چشتیوں کی طرف عام میلان ہو گیا تھا۔ اور لوگ جوق جوق اس طریقہ کے مرید ہو رہے تھے۔

اس زمانہ میں ملتان اور دیپال پور وغیرہ سرحدی مقامات میں سہروردی سلسلہ نے قدم بڑھانے شروع کئے تھے۔ چونکہ ملتان بیرونی دشمنوں کے حملے کی پہلی ٹکر پر واقع تھا اس واسطے شاہان دہلی اس کے استحکام کے لئے چیدہ افسر مقرر کرتے تھے اور ملک کی زبردست فوجیں وہاں رہتی تھیں۔ اس ظاہری انتظام کے ساتھ باطنی انتظام بھی تھا۔ ملک کے نامور علماء و مشائخ خلقت کی روحانی تربیت کے لئے ملتان میں رہتے تھے۔ چنانچہ سہروردیہ طریق کے نامور پیشوا حضرت بہاء الدین ذکریا رحمتہ اللہ علیہ یہیں تشریف رکھتے تھے لوگوں کو ان سے بڑا اعتقاد تھا اور سہروردی سلسلہ نہایت سرعت سے پھیل رہا تھا۔ اسی اثناء میں دہلی سے حضرت خواجہ قطب صاحب کے خلیفہ اعظم حضرت بابا فرید گنج شکرؒ بھی ملتان کے قریب قصبہ اجودھن میں تشریف

لے گئے اور وہیں قیام اختیار کیا حضرت بابا صاحب کے تشریف لے جانے سے
سہروردیہ سلسلہ کی ترقی میں پہلی سی تیزی نہ رہی۔ مگر اس کا نہ حضرت شیخ الشیوخ
شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کو افسوس تھا اور نہ حضرت بابا صاحب کو خوشی تھی کیونکہ
یہ دونوں بزرگ دینی خدمت کر رہے تھے ان کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ کون
خاندان زیادہ پھیل رہا ہے۔

التمش کے بعد سب غلام بادشاہ چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے۔ غیاث الدین
بلبن حضرت بابا صاحب کی زیارت کے لئے خود اجودھن (پاکپتن) حاضر ہوا اور
ایک روایت کے بموجب اپنی لڑکی بھی آپ کے نذر کی بلبن کے آخری زمانہ میں حضرت
خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی حضرت بابا صاحب کی اجازت سے دہلی کے نائب
مقرر ہو کر تشریف لائے اور آپ کا غلغلہ اس کی موت سے پہلے اچھی طرح تمام ملک میں
پھیل گیا۔ بلبن اور اس کا بیٹا محمد خاں شہید جو ملتان کا صوبہ دار تھا حضرت محبوب الٰہیؒ
سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ بلکہ محمد خان تو آپ کے دو مقبول مریدوں حضرت
امیر حسن علاء سنجریؒ اور حضرت امیر خسروؒ کو اپنے ہمراہ ملتان لیگیا اور مرتے دم
پاس رکھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کا خاص عقیدت
شعار رہا۔ اور اس طرح چشتیوں کی دھاک تمام ملک کے دل پر بیٹھ گئی۔

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی اور علاء الدین خلجی بھی چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے
مگر علاء الدین کا جانشین قطب الدین خلجی چشتیوں سے منحرف ہو گیا اور اپنی نادانی و نا
تجربہ کاری کے سبب اس کے درپے ہوا کہ پولٹیکل چال سے

چشتیوں کا زور

توڑ دے۔ چنانچہ اس کے مشیروں نے اس کو صلاح دی کہ جب تک حضرت

محبوب الہیؒ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بزرگ دہلی میں نہ آئے گا ان کا زور قایم رہے گا شاہی اختیارات سے ایسے ہر دلعزیز لوگوں کا زیر کرنا آسان کام نہیں ملتان سے سہروردیہ خاندان کے سب سے بڑے پیشوا حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو دہلی بلوا لیجیے۔ اول تو یقیناً ان کے آپس میں زور آزمائی ہوگی حضرت محبوب الہیؒ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کی اقلیم میں غیر خاندان کا آدمی سکہ چلائے۔ مولانا رکن الدین چونکہ سلطان کی شہ سے آئیں گے اس واسطے وہ بھی مضبوطی سے چشتیوں کا مقابلہ کریں گے اور دہلی سے ان کا اثر زائل کرنے کی کوشش کریں گے اس کشمکش میں سلطان کا مطلب حاصل ہو جائے گا سلطان نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ اور ملتان سے حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو بلوایا چنانچہ حضرت مولانا ملتان سے روانہ ہوکر دہلی تشریف لے آئے۔ اور وہ وقت قریب آگیا کہ

تلوار اور تسبیح کا مقابلہ

شروع ہو۔ کیونکہ سلطان تلوار کے زور سے حضرت محبوب الہیؒ کی تسبیح کو زک دینی چاہتا تھا آج کل کا زمانہ ہوتا تو خبر نہیں کیا حالت ہوتی۔ خود مختار ہجابر۔ ظالم سلطان کا زمانہ اور ایسی خطرناک چال کہ بھائی کو بھائی سے جنگ کا اندیشہ۔ مگر حضرت محبوب الہیؒ نے اپنی خداداد حقانیت اور حسن نیت سے سلطان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دے جوں ہی حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح شہر میں داخل ہوئے سلطان نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور پوچھا کہ دہلی میں سب سے پہلے کون ملا؟ آپ نے ارشاد کیا جو سب سے اچھے ہیں۔ سلطان نے گھبرا کر دریافت کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا مولانا نظام الدین محبوب الہیؒ! یہ سنکر سلطان کا چہرہ فق ہوگیا۔ اور اس نے غیظ و پشیمانی میں اپنا منہ حضرت کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ اپنے ہونٹھ چباتا تھا اور حضرت محبوب الہیؒ کی ایسی

عیاں کامیابی سے مبہوت تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دنیا کے آدمیوں کی طرح چالبازیاں نہیں کیا کرتے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جو چراغ خدا نے روشن کیا تھا وہ ان فریب کاریوں کی پھونکوں سے بجھنا دشوار ہے۔ اس کے مشیروں نے چشتیوں اور سہروردیوں کو جداگانہ مذہب تصور کر کے یہ چال چلی تھی مگر اب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سب تو ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور ان میں کچھ بھی اختلاف نہیں ان کے ذہن میں یہ بات وہم و گمان کی طرح بھی نہ آئی تھی کہ حضرت محبوب الٰہی باوجود اس عظمت و شان کے کہ تمام ہندوستان ان کے قدموں میں سر جھکاتا ہے۔ مولانا رکن الدین ابو الفتح کے استقبال کو شہر سے باہر تشریف لے جائیں گے اور اس طرح بادشاہ کی کی کرائی محنت کو خاک میں ملا دیں گے۔

مولانا رکن الدین بشر تھے۔ امکان میں تھا کہ وہ دہلی میں بادشاہ کے پاس ٹھہر کر اغوا میں آجاتے۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ سے مخاصمت شروع کر دیتے۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے کمال دور اندیشی۔ کمال اخلاص شعاری۔ کمال مہمان نوازی اور کمال فروتنی کو کام میں لا کر خود تکلیف اٹھائی۔ شہر سے باہر استقبال کو تشریف لے گئے اور بادشاہ سے پہلے حضرت سے ملاقات کر لی جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ ہی تمام دہلی میں سب سے اچھے ہیں۔ جو بادشاہ کے دل پر تیر کی طرح زخم انداز ہوا۔

ہند کے تاج کو دوسری زک

قطب الدین خلجی اس واقعہ کے بعد فکر میں رہا کہ مولانا رکن الدین کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے برہم کرانے کی کوئی اور صورت پیدا ہو۔ مگر مرتے دم تک اس کو کامیابی نصیب نہ ہوئی ادھر تو وہ اس خیال میں تھا۔ ادھر حضرت مولانا رکن الدین خود کیلوکھری کی جامع مسجد

میں نماز کو تشریف لے گئے۔ جہاں حضرت محبوب الٰہیؒ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا صحن بہت وسیع تھا۔ نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کو خبر دی گئی کہ مولانا رکن الدینؒ اس مسجد میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت یہ سنکر مولانا سے ملنے تشریف لے چلے۔ اور تمام وسیع صحن پیادہ طے کر کے مسجد کے دوسرے حصے میں پہنچے۔ اس وقت مولانا صاحب نماز میں مصروف تھے حضرت محبوب الٰہیؒ مولانا کے پس پشت بیٹھ گئے خلقت کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی پڑتی تھی عوام کو نہایت تعجب تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے شاندار بزرگ نے مولانا کے پس پشت بیٹھنا کیونکر گوارا کر لیا۔ حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی عارفین ان ظاہری تکلفات کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ مگر آج کل کے زمانہ میں تو کبھی درویش اس بات کو قبول نہ کرے گا کہ دوسرے درویش کے پیچھے بیٹھ جائے اور ہزاروں مرید یہ تماشا دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ اس کے دل میں ضرور اندیشہ ہوگا کہ اس سے میرے مریدوں کے عقیدے میں کمزوری واقع ہوگی۔ اور میری وقعت کے مقابلہ میں اس شخص کی وقعت بڑھ جائے گی جس کی تعظیم کر رہا ہوں۔ لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے چھ سو برس پہلے اس وہم کو جھوٹا ثابت کر کے دکھا دیا کہ ایک غیر سلسلہ کے فقیر کی ایسی غیر معمولی تعظیم اپنے مریدوں کے سامنے کی۔ مگر حضرت کی وقعت کو بال بھر صدمہ نہ پہنچا بلکہ اور گرویدگی بڑھ گئی۔

جب حضرت مولانا نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ کمال تپاک سے مصافحہ و معانقہ کیا اور دونوں بزرگ ہاتھ پکڑے کے باتیں کرتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے اور پالکیوں میں سوار ہو کر اپنے مقامات میں تشریف لے گئے۔

اس ملاقات کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے بہت پیچ و تاب کھایا۔ مگر کیا کر سکتا تھا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آخر اس آتش حسد میں جلتا ہوا ایک دن اپنے مرغوب غلام خسرو خان کے ہاتھ سے محل ہزار ستون کی چھت پر قتل کیا گیا۔

ایک اور پر اسرار مباحثہ

حضرت مولانا رکن الدینؒ جس کام کے لئے بلائے گئے تھے وہ قطب الدین کے سانحہ قبر میں گیا۔ اب ان دونوں بزرگوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر لکھا جاتا ہے جو موجودہ مشایخ کی سبق آموزی کے لئے ازبس موثر ہے اور اتحاد کا جذبہ ہر قلب میں پیدا کرتا ہے۔

ایک دن حضرت محبوب الہیؒ اس مقام پر تشریف رکھتے تھے جہاں آپکا مزار ہے کہ ایک شخص خبر لائے کہ حضرت مولانا رکن الدین ملاقات کو تشریف لاتے ہیں حضرت نے خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔ اسی اثنار میں خبر آئی۔ تشریف لے آئے۔ حضرت بالاخانے سے تشریف لائے اور حضرت مولانا کا استقبال فرمایا۔ مولانا پالکی میں سوار تھے اور پاؤں میں کچھ تکلیف تھی لیکن اسی حالت میں نیچے اترنے کی کوشش فرمانے لگے۔ حضرت محبوب الہیؒ نے اصرار کیا۔ اور نیچے نہ اترنے دیا پالکی زمین پر رکھدی گئی۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ بھی وہیں رونق افروز ہو گئے۔ اقبال نے دستر خوان چنا۔ کھانے لگائے گئے۔ انگوری سرکہ دور رکھا تھا۔ مولانا نے فرمایا۔ سرکہ قریب لاؤ۔ پیالی قریب سرکا دی گئی حضرت محبوب الہیؒ نے فرمایا۔ اسی شہر کا ہے مولانا نے جواب دیا۔ اسی لئے تیز ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں اور اسی واسطے عزیز ہے۔ اس پر لطف بات چیت کے بعد کھانا بڑھایا گیا۔ خواجہ اقبال نے ایک باریک کپڑے میں تنوا شرفیاں باندھکر اور چند تھان نہایت نفیس کپڑوں کے ان کے ہمراہ مولانا کے سامنے رکھے۔ اشرفیوں کی زردی کپڑے سے جھلک رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا استر ذھبک اپنے سونے کو چھپاؤ اپنے جانے کو چھپاؤ۔ اپنے مذہب کو چھپاؤ استر ذھبک وذھابک ومذھبک اپنے سونے کو چھپاؤ اپنے جانے کو

چھپاؤ۔ اپنے مذہب کو چھپاؤ) اس جواب سے مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ کیونکہ یہ تمام باتیں سلوک کے مقاموں کی تھیں جنکو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس برجستگی اور فصاحت سے ادا کر دیا۔ کہ مزاح کا مزاح اور بیان کا بیان۔ کوئی شخص اس اختصار اور موزونیت سے درویشی کی باتیں ادا نہیں کر سکتا۔

اس پُر اسرار و لطیف گفتگو کے درمیان میں مولانا رکن الدین کے بھائی مولانا عماد الدین اسمٰعیل نے عرض کیا کہ اس وقت ہندوستان کے دو نامور بزرگ ایک جگہ جمع ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آسکتا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہجرت کا کیا سبب تھا یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے مدینہ منورہ کو کیوں ہجرت فرمائی۔ اگرچہ ظاہری طور پر تو ہر شخص جانتا ہے کہ کفار قریش کی یورش و آزادہی کے سبب سے ہجرت ہوئی۔ مگر

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے

اس ظاہری وجہ کا باطن بھی ضرور ہوگا۔ اس کی تشریح و توضیح کا طلبگار ہوں حضرت مولانا نے فرمایا کہ حضرت سلطان المشائخ جواب ارشاد کریں گے۔ اور حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ نے فرمایا۔ نہیں آپ ہی فرمائیں آخر اس کسر نفسی کے تبادلہ کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے اول ارشاد کیا کہ فقیر کے خیال میں مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل اس بات پر منحصر تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گھر بار چھوڑیں سفر کی تکلیف برداشت کریں۔ عزیز و اقارب سے جدا ہوں اور مدینہ میں ہجرت کر کے تشریف لے آئیں۔

مولانا رکن الدینؒ نے یہ جواب سنکر فرمایا۔ میرے نزدیک خود حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کمالات کی تکمیل ہجرت پر منحصر تھی جب آپ نے کار تھوڑے

تمام تعلقات خانہ کو ترک کرکے بے وطنی اختیار کی۔ اس وقت دین مکمل ہوا۔ ان دونوں جوابوں میں ہر بزرگ نے نہایت مزہ دار اشارے کئے ہیں۔ جنکی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مولانا عماد الدین کا سوال تو محض ہجرت کے متعلق تھا مگر ان حضرات نے جواب ایسے پیرایہ سے دیا کہ اپنی ذات کے متعلق بھی اشارے کنائے ہوگئے۔ مثلاً حضرت محبوب الہیؒ کا یہ فرمانا کہ ہجرت مدینہ کے نانقصوں کی تکمیل کے لئے ہوئی۔ بظاہر نہایت سادہ و موذب جواب ہے۔ مگر حقیقت میں حضرت نے خود اپنی ذات کی نسبت اشارہ کیا ہے کہ مولانا رکن الدین کا ملتان سے ہجرت کرکے دہلی آنا میرے نقص کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس کے جواب میں مولانا رکن الدین نے فرمایا کہ نہیں بلکہ خود میری تکمیل دہلی آنے اور آپ سے فیضیاب ہونے پر منحصر تھی۔ بہر حال یہ وہ برتاوے ہیں جن سے اعلیٰ درجہ کی یگانگت و اخلاص مندی مترشح ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ علیحدہ علیحدہ سلسلہ کے تھے۔ گو اس میں سے ایک چشتیہ گھرانے کا آفتاب اور دوسرا سہروردیہ طریق کا ماہتاب تھا لیکن طرز عمل سے وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مشائخ نے گلیم درویشی کو اس قدر تنگ کر دیا ہے اور میل جول و رسم اتحاد کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ حلقہ نظام المشائخ نے اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے کہ مشائخ میں پھر وہی اگلا سا اتحاد پیدا ہو۔ قادری چشتی نقشبندی۔ سہروردی۔ نظامی۔ صابری۔ مجددی وغیرہ سب شیر و شکر ہوکر رہیں اور اپنی اُن اغراض کی جو سب طریقوں میں شامل ہیں اغیار کے مقابلہ میں حفاظت کریں۔ اس اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب سلسلے خلط ملط ہوکر ایک معجون مرکب بن جائیں بلکہ منشا یہ ہے کہ فروعات کے ناجائز اختلافات مٹائے جائیں۔ ہر شخص دوسرے سلسلہ کے بزرگ کا ادب اسی طرح ملحوظ رکھے

جس طرح کہ وہ اپنے سالار سلسلہ کا ادب کرتا ہے۔ اگر ایسا ہونے لگا اور ہمیں تسلی دی گئی ہے ایسا ہی ہوگا تو گلیم درویشی کی وسعت پھر اپنی اصلی شان پر آجائے گا۔

خوش خلقی

(از صوفی۔ نومبر ۱۹۰۹ء)

خوش خلقی کی فضیلت ۔جس طرح ہمارے رسول صلعم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے۔ اسی طرح ان کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے چنانچہ ارشاد ہوا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ تمہاری پیدائش اے محمدؐ بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق ایسی شاندار چیز ہے کہ حضور رسول مقبول کے اعلیٰ اوصاف میں اس کا شمار رہا حضور رسول مقبول صلعم نے حسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو ذیل میں قلم بند کرکے بدخلقی کی برائی کو لکھا جائے گا۔ اور اس کے بعد بتایا جائیگا کہ حسن اخلاق کیا چیز ہے۔

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا سب سے بھاری چیز جو میزان عمل میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا دین کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا خوش خلقی۔ اس شخص نے آپ کے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا۔ اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ

چار دن رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔ ایک اور آدمی نے دریافت کیا اعمال میں افضل کیا چیز ہے۔ فرمایا حُسن خلق کسی نے دریافت کیا۔ باعتبار ایمان کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلق حسن میں بڑھ جاؤ۔ حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا۔ تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے۔ اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم اکثر یوں دعا فرماتے تھے اللھم احسنت خلقی فحسن خلقی" الٰہی تو نے میری اچھی صورت بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا" دریافت کیا گیا۔ بندہ سب سے اچھی کیا چیز دی گئی ہے؟ فرمایا خلق حسن! دوسری جگہ فرمایا قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہونگے جن کے اخلاق اچھے ہونگے۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا کوئی تدبیر عقل کی موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی *

بدخلقی کی برائی

حضرت صلعم سے کسی نے دریافت کیا۔ نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بدخلقی۔ فرمایا بدخلقی اعمال نیک کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے بدخلقی ایسا گناہ ہے۔ جو کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ نیز آپ نے فرمایا۔ بدخلق آدمی دوزخ کی تہ میں ڈالا جائے گا حضرت خواجہ حسن بصریؓ نے فرمایا بدخلق انسان اپنی جان کو آفت میں خود پھنساتا ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں۔ بدخلق ٹوٹا ہوا برتن ہے۔ نہ جڑ سکتا ہے نہ مٹی بن سکتا ہے

حضرت فضیل نے فرمایا بدکار خوش خلق کو بدخلق عابد پر ترجیح ہے +

خوش خلقی کیا چیز ہے

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ کشادہ پیشانی رہے اور دولت کو خرچ کرے۔ اور کسی کو ایذا نہ دے۔ واسطی فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کی یہ علامت ہے کہ نہ آدمی خود کسی سے دشمنی کرے۔ نہ کوئی اس سے خصومت رکھے۔ اور مفلسی و تونگری میں خلقت اس سے راضی رہے۔ شاہ کرمانیؒ کے خیال میں ایذا سے باز رہنا اور مشقتوں کا سہنا خوش خلقی ہے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں غربت کی شان سے لوگوں کے قریب رہنا خوش خلقی ہے۔ حضرت مولانا علیؑ فرماتے ہیں خوش خلقی تین چیزوں میں ہے محرمات سے بچنا۔ حلال روزی کا تلاش کرنا۔ اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔ امام غزالیؒ کی رائے میں خلق کی تعریف یہ ہے کہ انسان سے افعال بآسانی بلا فکر و تامل صادر ہوں۔ اگر وہ افعال عقلاً و شرعاً عمدہ ہیں تو خوش خلقی ہے ورنہ بدخلقی نیز فرمایا خلق فعل کا نام نہیں ہے کیونکہ بہت سے آدمی طبیعت کے اعتبار سے سخی ہوتے ہیں۔ مگر مفلسی کے سبب سخاوت نہیں کر سکتے یا بعض آدمیوں کی طبیعت بخیل ہوتی ہے لیکن ریاکاری سے خرچ کرتے ہیں۔ اور فرمایا جس طرح ظاہری جسم کا حسن محض آنکھوں یا صرف رخساروں کی موزونیت سے مکمل نہیں کہلاتا جب تک کہ کل جسم کے اعضاء موزوں نہ ہوں اسی طرح خوش خلقی جو انسان کا باطنی حسن ہے چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے +

ایکؔ قوت علم۔ دوسرےؔ قوت غضب تیسرےؔ قوت خواہش چوتھےؔ قوت عدل یعنی چاروں طاقتوں کو درجہ اعتدال پر رکھنا۔ علمی طاقت کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی اس کے سبب اپنے اعمال اور عقائد میں راست رو رہ جاتا ہے۔ اسی طرح

سے غضب اور شہوانی طاقت پر قایم ہونا محاسن اخلاق کے لئے لازمی ہے اور یہ قابو قوت عدل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

خوش خلقی کیونکر پیدا ہوتی ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سے ظاہری جسم کی اصلاح ناممکن ہے اسی طرح باطنی درستی بھی دشوار ہے۔ بونا آدمی کوشش سے دراز قد نہیں بن سکتا کالا رنگ گورا نہیں ہو سکتا۔ بدصورتی خوبصورتی سے نہیں بدل سکتی ایسے ہی جس کی سرشت میں کج اخلاقی ہے وہ تدبیر سے خوش اخلاق نہیں بن سکتا۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو یہ بعض جسمانی مثالیں اس مسئلہ پر کماحقہ ثابت نہیں آئیں دوسرے یورپ کے محققین نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور جسم کے وہ عارضے جن کی صحت ناممکن مانی گئی تھی ان کی تدبیروں سے گم ہوتے جاتے ہیں۔

بدخلقی کا بدل جانا فطرت سے ثابت ہے۔ ورندے جانور انسان کی تربیت سے اپنی خونخوار خصلت کو بھول جاتے ہیں تو خود انسان دوسرے انسانوں کی ترتیب سے اصلاح پذیر کیوں نہ ہو سکے گا۔ بعض آدمی تو پیدایشی نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں لیکن جن کی عادت ابتدا سے بدخوئی اور تنگ مزاجی کی ہوتی ہے۔ وہ بھی خوش خلق بن سکتے ہیں جس کی سب سے آسان ترکیب خوش اخلاق لوگوں کی صحبت ہے۔ صحبت زمانہ قدیم سے لیکر اس نئے زمانہ تک رجو پرانے عہد کی باتوں پر خندہ زنی کرتا ہے) یہ امر مسلم ہے کہ صحبت کا اثر تمام تعلیمات سے بڑھکر ہے۔ ملنے جلنے کی تاثیر سے آدمی میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی واسطے مشایخ عظام نے حسن صحبت کو تصوف کی درسگاہ مانا ہے۔

جس کو خوش خلقی سیکھنی ہو یا کسی دوسرے کو خوش خلق بنانا ہو تو چاہئے کہ ایک ایسے شخص کی صحبت اختیار کرے جو خوش اخلاقی کا مکمل نمونہ ہو۔

انسان کامل کے اخلاق

خوش خلقی کی ذہن نشین تعلیم ایک انسان کامل کی اخلاقی مثالوں کے بغیر دشوار ہے۔ اس واسطے حضرت رسالت پناہ صلعم کے اخلاق کی چند مثالیں معتبر و مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی جاتی ہیں۔ مشائخ صوفیہ ان مثالوں کو توجہ اور غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اور اپنے متکبرانہ اخلاق کی تبدیلی میں متوجہ ہوں۔

حضرت رسول مقبول صلعم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لیجاتے غلام کی دعوت منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ صحابہ کو تکلیف نہ دیتے۔ بلکہ جو کام خود نہ کر سکتے تھے اس کو دوسرے سے کرانا برا تصور فرماتے تھے جب آپ کا گزر لڑکوں پر ہوتا ان کو سلام کرتے ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں۔ جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ آپ اپنے اصحاب میں اس طرح سے مل جل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہؓ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جسپر آپ تشریف رکھنے لگے اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجئے۔ تاکہ تکلیف نہ ہو آپ نے ارشاد کیا میں اسی طرح کھاؤں گا

جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ آپ کے
صحابہ میں سے یا اور کوئی آدمی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبیک فرماتے جس قسم
کی بات کا آپ کے صحابہ میں پہلے سے ذکر ہوتا تو آپ بھی اسی کے متعلق باتیں کرتے
اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو آپ بھی شعر پڑھتے۔ اگر صحابہ ہنستے تو آپ
بھی تبسم فرماتے اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں صحابہ کو زجر و
توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے، مساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے جو لوگ
اخلاق میں افضل ہوتے ان کا احترام فرماتے تھے جو آپ کے سامنے عذر کرتا اس عذر
کو قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے تھے مباح کھیل کو
دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ آپ بچوں کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے
لوگ آپ کے سامنے بلند آواز سے بولتے تھے جس سے آپ کو اذیت ہوتی تھی
مگر آپ صبر فرماتے۔ کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے۔ کسی بادشاہ
سے اس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کیا۔ اگر آپ سے کہا جاتا کہ
کسی کیلئے بد دعا کیجئے تو آپ اس کو دعا دیتے سوائے جہاد کے آپ نے کسی پر وار نہیں کیا
اگر آپ کے واسطے بچھونا بچھا دیا جاتا تو آپ اس پر لیٹ رہتے اور اگر بچھونا نہ بچھایا
جاتا تو آپ زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی آپ سے ملتا، سلام میں سبقت فرماتے
اور جب تک وہ چلا نہ جاتا آپ کھڑے رہتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو آپ
چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا۔ آپ کے پاس کوئی
آتا اور آپ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے
کچھ کام ہو تو کہو۔ کسی مجمع میں تشریف لیجاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ کسی کو
اٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی

کبھی پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ جو لوگ آپ کے پاس آتے تھے اُن کی خاطر اور تعظیم فرماتے قرابت داروں کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے تھے جس تکیہ کے سہارے آپ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دیکر تکیے کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ آپ کے حسن اخلاق کا مجمل سا بیان ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاصکر صوفیائے کرام جو حضور کی پیروی و تقلید کو مقصود حقیقی تصور کرتے ہیں۔ آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو مشائخ کی صحبتیں متکبر امراء کے درباروں سے بڑھکر پائی جاتی ہیں جہاں غربا اور کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقراء میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان زمین کا فرق پڑ گیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلعم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں۔ اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا زندہ نمونہ بنکر نمودار ہوں۔ تاکہ روحانیت کی پیاسی دنیا اسلامی چشمہ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے آمین۔

خونی درویش

(از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۶ء)

درویشی اور خونخواری یہ دونوں الفاظ آپس میں کیسے اجنبی اور نا آشنا معلوم

ہوتے ہیں جو دجوہ خاک نشینی کے سبب میدان ہستی میں موجود نظر آتا ہو۔ اسکو خدنگ اندازی سے کیا سروکار۔ مگر زمانہ نے اور اس کی غلط گو زبانوں نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا سوڈانی ملا صاحب کے ہمراہیوں کا نام درویش مقرر کر دیا تھا *

سوڈان مصری حکومت کے جوار میں ایک علاقہ ہے جہاں کوئی ملا صاحب مہدی کے لقب سے نمودار ہوئے تھے۔ اور چند جنگجو اعراب کو ساتھ لیکر سوڈان فتح کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جو مصری حکومت کے محافظ ہیں۔ مصری فوج کے ساتھ ہوکر ملا مہدی صاحب اور اُن کے رفقا سے جنگ بازی کی اور آخر شکست و فتح کی متعدد گردشوں کے بعد سوڈان فتح کر لیا۔ جو اب تک قبضے میں ہے مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ ملا حق پر تھے یا ناحق پر۔ انگریزوں نے ان کے جنگ بازی انصاف سے کی یا ناانصافی سے۔ کیونکہ غیر ملک اور غیر حکومت کے معاملات سے ہمیں کیا واسطہ۔ گفتگو اس معاملہ میں ہے کہ ملا مہدی کے سپاہیوں کو لفظ درویش سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور تمام عربی۔ اردو۔ انگریزی اخبارات مہدی کی فوج کو درویش کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آیا یہ لفظ موزوں تھا یا ناموزوں غلط تھا یا صحیح۔ جائز تھا یا ناجائز *

میں کہتا ہوں کہ ملائی لشکر کو درویش کا نام دینے والا یا تو کوئی بڑا ہی نادان اور درویشی طریق سے بےخبر تھا اور یا اس کو فقرا سے کچھ عداوت تھی اور دانستہ اُس نے ان کے غیر متحرک اور ساکت گروہ کو بدنام و مشتبہ کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا *

درویشوں کی پرامن معاشرت پر اس سے بڑھکر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا کہ انکو شریر۔ فسادی طبقے میں شمار کرانے کے واسطے ایسے ناجائز وسائل اختیار کئے جائیں *

ملا مہدی کی فوج میں سوائے اس کے کہ وہ بددیانہ زندگی کے مسلمان تھے کوئی بات درویشی کی نہ تھی۔ خود ملا مہدی صاحب عالمانہ حیثیت کے ایک بزرگ تھے جنہوں نے ظاہری اتقا کے سبب عوام پر ایک اثر حاصل کرلیا تھا۔ اور یہ اثر اُن کی دانشمندی سے حصول مملکت میں ان کے لئے مفید ہوگیا تھا۔ نہ ان کا باضابطہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ وہ درویشی طریقہ پر سلسلہ چلانا پسند کرتے تھے۔ بلکہ وہ ایک ملکی اور جنگی بیعت لیتے تھے جس کو فقیری بیعت سے کچھ علاقہ نہیں۔

ایسی صاف صورتوں میں کوئی منصف مزاج ملا صاحب کی فوج کو درویش نہیں کہہ سکتا۔ لہذا ان خونی درویشوں کو اصلی اور حقیقی درویشوں سے جدا کیا جاتا ہے۔

اب مسلمانوں میں کوئی خونی درویش باقی نہیں رہتا جس کی ہستی پر غور کرسکیں اور نظر ہندوؤں کے ایک فرقہ پر جاتی ہے جو باعتبار لباس درویش معلوم ہوتا ہے۔ مگر کام درویشی کے نہیں کرتا۔ فقیری لباس کی آڑ میں پوشیدہ ہوکر حصول مملکت کے منصوبے پورے کرتا۔ بم اندازی۔ اور پستول بازی کے کرشمے دکھاتا ہے۔

یہاں بھی ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ ان کی یہ کوشش جائز ہے یا ناجائز۔ بلکہ کلام اس روش اور طرز میں ہے کہ اس سیاسی جماعت کو خرقہ درویشی استعمال کرنا زیبا ہے یا نہیں۔

کلکتہ میں میں نے ان مصلحتی درویشوں کے سرگروہ بابو آربندو گھوش سے اسی مسئلہ کے متعلق باتیں کرنے کے لئے ملاقات کی۔ آربندو گھوش بنگال کے نامور فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی انگریزی قابلیت کا بڑے سے بڑے انگریزی دانوں

کو اعتراف ہے۔ اگر نوکری کرنی چاہیں تو نہایت معزز عہدہ انگریزی گورنمنٹ ان
کو عطا کرے۔ مگر انہوں نے اپنی دانست میں زندگی ملک پر قربان کر دی
ہے اس لئے بہت سادہ طریق سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اور نوکری نہیں کرنا چاہتے
ابھی تھوڑا عرصہ ہوا چند بنگالی بم اندازی اور بم سازی کے جرائم میں پکڑے گئے
تھے جن کی مدت تک اخباروں میں شہرت رہی تھی۔ بابو آربندو گھوش بھی اس
جماعت کے ساتھ ماخوذ تھے لیکن تحقیقات سے ان کی شرکت کا کوئی قانونی ثبوت
نہ پہونچ سکا اس لئے بری کر دیے گئے جیلخانے سے واپس آ کر انہوں نے
کلکتے میں ایک ہفتہ وار انگریزی زبان کا اخبار جاری کیا جس کا نام کرم یوگ
ہے کہتے ہیں اس اخبار کا لہجہ انقلاب انگیز ہے مگر ایسے عاقلانہ پیرائے سے
مرتب کیا جاتا ہے کہ قانونی مواخذہ کی حد دور رہ جاتی ہے +

القصہ جب میں نے معلوم کیا کہ بابو آربندو خود بھی سنیاسی ہو گئے
ہیں اور سنیاسی لباس میں پولٹیکل مشن چلا رہے ہیں۔ اور تمام پولٹیکل سنیاسوں
کی افسری بھی ان ہی کو حاصل ہے تو ملنا ضروری سمجھکر ایک دن ملاقات کی۔ آربندو
اردو بہت کم جانتے ہیں اس لئے ترجمان کے ذریعہ سے انگریزی میں باتیں
ہوئیں +

اول تو میں نے یہ دیکھا کہ آربندو کا لباس درویشی نہیں ہے اور نہ انکے
گرد و پیش کوئی اس لباس کا نظر آیا اس لئے جو خبر مجھ کو دی گئی تھی اس میں شبہ
پیدا ہوا۔ پہلا سوال میں نے آربندو سے یہی کیا۔ کہ کیا تم سنیاسی ہو گئے ہو؟ جسکا
جواب انہوں نے متانت آمیز تبسم سے یہ دیا کہ باعتبار ظاہر سنیاسی نہیں
ہوں۔ مگر میرا دل سنیاس کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ سنیاسی ہو چکا ہے میں نے دریافت
کیا کہ تمہارے گرد کون ہیں؟ کہا سوامی وویکانند جی۔ اس کے بعد میں نے کرم یوگ

کی حقیقت پر گفتگو شروع کی۔ اور پوچھا۔ اخبار کا نام کرم یوگ کیوں رکھا ہے؟ جس کا جواب معمولی طور پر یہ دیا گیا کہ اس اخبار کا مقصد لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنا ہے۔ اور یہی معنی کرم یوگ کے ہیں۔ کہا گیا کہ کیا گیتا کے کرم یوگ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے؟ جہاں سری کرشن جی نے ارجن کو انقلاب پیدا کرنے کا فلسفہ بتایا ہے۔ یہ سنکر آربندو نے اپنے دور اندیش دماغ کو جنبش دی اور کہنیاں میز پر ٹیک کر مصنوعی مسکراہٹ ظاہر کرکے سر ہلایا اور گیتا کی پیروی کا اقرار کیا۔ لیکن اس اقرار کے بعد ان کا چہرہ فکرمند نظر آنے لگا جس کو وہ اپنی عقلمندی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آخر سوالات کی نوبت اس مقام پر آگئی جو ملاقات کا اصل مقصد تھا۔ کیونکہ اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ گو یہ خود درویشی لباس میں نہیں ہیں مگر پولیٹیکل درویشوں کی مرشدی کا منصب انہیں کو حاصل ہے۔ یہ باتیں بطور سوال و جواب کے نہیں ہوئیں بلکہ مشورے کے طریق سے کہا گیا کہ جس طرح آپ کو ہندوستان اور اس کے علوم سے محبت ہے۔ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے ان علوم کا شیدا ہوں۔ ویدانت نے اپنی برتری و خوبی کا سکہ یورپ و امریکہ میں بھی چلانا شروع کر دیا ہے اور اس سے ہم کو اسی قدر خوشی ہے جتنی آپ کو ہوتی ہوگی۔ مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض پولیٹیکل کام کرنے والے جن کو ویدانت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا جو سنیاس یوگ کی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوتے ہیں محض ملکی مصلحت سے سنیاسیوں کا لباس پہنتے ہیں۔ اور اس لباس میں بم اندازی و پستول بازی کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے درویشی لباس سلطنت کی نگاہ میں مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اور بیچارے غیر پولیٹیکل درویش خواہ مخواہ پولیس کے شک کا شکار رہتے ہیں۔ اگر حالات کی یہی صورت رہی تو ایک دن

تمام ملک کے فقرا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اطمینان سے یادِ الٰہی نہ کر سکیں گے اور روحانیت کی تلقین کمزور ہو جائے گی۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ روحانیت کو ضرر پہونچنا ملک کا کتنا بڑا نقصان ہے۔ جس دولت کے سبب ہندوستان اور ایشیا، تمام یورپ و امریکہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ یہی روحانی جواہرات ہیں۔ آپ مادی دولت و حکومت کی طلبگاری میں اصلی دولت کو برباد نہ کیجئے۔ اور اپنی جماعت کو فہمایش کیجئے کہ درویشی لباس ترک کر دے۔

اس کا جواب بابو آربندو نے ایسا دیا کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اعلیٰ قابلیت کے اس اعتراض کا تسلی بخش جواب اُن کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ عذر کر کے بات کو ٹالنا چاہا کہ سادھو اور درویش اپنی بداعمالیوں کے سبب پہلے ہی مشتبہ و بدنام ہو رہے ہیں۔ اب مزید بدنامی کا انھیں اندیشہ نہ چاہئے۔

میں نے کہا اعمال کی بدنامی اصلاح حال سے درست ہو سکتی ہے لیکن اس ناجائز و خوفناک شبہ کی بدنامی ہرگز دور نہیں ہوگی جب تک کہ یہ طریقہ ترک نہ کیا جائے، جو پولٹیکل درویشوں نے شروع کیا ہے۔ اس کا جواب کچھ نہ دیا گیا اور معلوم ہوا کہ بابو صاحب مکالمہ کی اہمیت کے سبب زیادہ توضیح و تشریح پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا گفتگو کسی مفید نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ختم ہو گئی۔

لیکن ہر محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس گفتگو کے مقصد کو ختم نہ سمجھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ پولٹیکل مشنری درویشی ہیئت میں نہ رہیں سوامی وویکانند بابو آربندو گھوش کے گرو تھے۔ اور سوامی وویکانند کے گرو سوامی رام کرشن پرم ہنس جی تھے۔ جو دورِ آخر میں بنگال کے نہایت خدارسیدہ اور عارف بزرگ مانے جاتے تھے۔ میں نے اُن کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں۔ عجب

پُر اثر زندگی تھی۔ دہلی کے رسالہ زبان نے اُردو زبان میں اُن کے سوانح شایع کیے ہیں جو لالہ چندو لال صاحب چاولی والے سے چھ آنے میں دستیاب ہوتے ہیں۔ پرم ہنس جی کے تارک دُنیا چیلے دو چار اب بھی کلکتے میں موجود ہیں۔ اور ایک مٹھ میں رہتے ہیں۔ سوامی سردھانند جی سے جو باغ بازار کلکتہ میں رہتے ہیں مَیں نے بھی ملاقات کی۔ بہت اچھے درویش ہیں۔ اور اپنے گرد کے فیضان کا مؤثر حصہ رکھتے ہیں۔ مگر ان درویشوں میں پولٹیکل ہل چل کا کوئی لگاؤ مَیں نے محسوس کیا۔ میری خواہش ہے کہ سوامی پرم ہنس کے تمام ممتاز چیلے بالاتفاق اس بات کی کوشش کریں کہ درویشی صورت میں پولٹیکل مشن بند ہو جائے اور مَیں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس تمام سمع خراشی کا نتیجہ یہ ہے کہ درویشی لباس کی شان اور اصلی حیثیت کی حفاظت میں ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں کوشش کریں کیونکہ درویشی ہی ایک ایسا کوچہ ہے جس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نظر نہیں آتا۔

درویشی شہادت نامہ

(از نظام المشایخ فروری ۱۹۱۰ء)

شہادت کیا چیز ہے؟

اصطلاح میں شہادت ایک قسم کی قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی امور کی حمایت میں ظاہر ہو یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا رسم و رواج کی حفاظت میں جان دیدے تو اُس کو شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر ممالک اور مذاہب میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم باقاعدہ موجود ہو۔ مگر ہم کو

جہاں تک اِس مسئلہ میں گفتگو کرنی ہے اُس کا تعلق صرف اسلام سے ہے +

اسلام نے ظاہر ہو کر جو زبردست اور زلزلہ انگیز چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا۔ ہر شخص جس نے اپنے سر کو اسلام کے آگے جھکایا تھا اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کر دینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کو یقین آ گیا تھا کہ

ایک وجود کی فنا دوسرے وجود کی بقا

کے لیئے لازمی ہے۔ جب تک ہم یہ اجسام اسلام پر نثار اور فدا نہ کریں گے جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اُن کے بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارا کرتا تھا۔ اور بارہا دیکھا گیا کہ اُن جنگی میدانوں میں جہاں بڑے بڑے شیروں۔ جواں مردوں کا کلیجہ کانپ جاتا ہے وہاں مسلمانوں کی خانہ نشین نازک کلائیوں والی عورتیں دلیری و بیباکی سے تلوار چلاتی تھیں۔ انسانی خون کے رنگ کی مہندی لگاتی تھیں۔ خاک و خون سے بھرے ہوئے کپڑے ان کو اطلسی و حریری لباس کا لطف دیتے تھے۔ اور عرصۂ کارزار کی جگر خراش آہ و بکا اُن کے کانوں میں شیریں نغمے بن کر جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تکبیر کے نعرے مارتی ہوئی برچھیوں اور تلواروں کی نوکوں سے رزم گاہ کو درہم برہم کر ڈالتی تھیں +

یہ ذوقِ شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا خدا تعالیٰ نے اُسی خاندان کو نمونہ بنا کر دکھایا جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آ گئی۔ مگر پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں آ کر بشیار کا ظہور دوسری اشیا کی شہادت یعنی فنا

جنس آدم سے قطع نظر کرکے عناصر اربعہ کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ دیکھئے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا۔ دوسرا وجود موجود و ہستی پذیر نہیں ہو سکتا آگ کی ہستی کو معدوم کرنا ہو تو پانی کا وجود قربان کیجئے۔ پانی کا نشان مٹانا ہو تو آگ کی زندگی خرچ کیجئے +

بھاپ جس کے بل پر نئی دُنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ جہاز سمندر میں لہراتے ہیں۔ یہ کیا ہے۔ اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت و قربانی سے جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے بھاپ یا طلسماتی جسم تیار ہوتا ہے۔ یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہوکر اپنا جسم چھوڑ دیتا ہے اور بھاپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے +

دانہ خاک میں ملتا ہے۔ اپنا نام و نشان مٹاتا ہے تو شگوفہ اور درخت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ دانہ شہید نہ ہو۔ اپنی ہستی قربان نہ کرے اور کہے کہ میں کیوں بیل کے واسطے اپنے تئیں خاک میں ملاؤں اور برباد کروں تو تمام دُنیا بھوکی مر جائے کیونکہ دانہ ہی قربانی ہے جس کی بدولت چار دانے پیدا ہوتے ہیں اور انسان و حیوان اُن کو کھا کر اپنی زندگی قایم رکھتے ہیں +

روئی اپنے وجود کی قربانی کرتی ہے تو سوت تیار ہوتا ہے اور آدمی کے تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ مادر زاد پھرا کرتے۔ یا درخت کے پتوں سے ستر پوشی کرتے۔ مگر اس میں بھی یہ اندیشہ تھا کہ درخت پتوں کی قربانی سے انکار نہ کر دیں +

کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں ہے۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک جاتا ہے دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا

ظہور ہوتا ہے۔ الغرض اسی شہادت کی بنیاد پر سب کارخانہ قایم ہے +

تیل نہ جلے تو تاریکی کون دور کرے۔ روشنی کہاں سے پیدا ہو۔ بتی آتشی آرہ سر پر نہ چلوائے تو لوگ اندھیرے میں ٹکرلتے پھریں۔ اور ہاں جن کے دم سے سب گھروں میں روشنی ہے اور جن کو حقارت سے تنکا سمجھا جاتا ہے وہ تو شہادت کی خاص شان رکھتے ہیں۔ اُن کی مقبول شہادت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا +

دیاسلائی کی شہادت

پر ذرا تفصیل سے غور کیجئے۔ عجب دردناک قصہ ہے۔ جنگل میں ایک ہرا بھرا درخت لچکدار شاخوں اور نرم نرم پتوں سے چھایا ہوا کھڑا تھا۔ ایک صاحب گئے اور ایک سنئے وجود کے لالچ میں درخت کو شہید کر ڈالا۔ اس کے بعد ایک گرم چشمے کے کھولتے ہوئے پانی میں جوش دیکر کھال کھینچ لی۔ پھر مشین کے دوسرے خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تیسری مشین نے یہ صورت بھی مٹا دی اور چھیل کر پرت بنا دیئے۔ چوتھی نے اُن پرتوں کو بھی کتر ڈالا۔ اور دیاسلائی کے ننھے ننھے تنکے بن گئے۔ ان تنکوں کو اول گندک اور تیزاب کے پانی سے وضو کرایا گیا۔ اس کے بعد بکس کی مسجد میں بھیجدیا۔ اب میاں تنکے بکس کی سیاہ جانماز پر ایک ہی رگڑ دکر سجدہ کرنے پائے تھے کہ غیبی خنجر آگ کی صورت میں نمودار ہوا اور تنکے کو شہید کر دیا تنکا تو آن کی آن میں جلکر نابود ہو گیا مگر اُس کی شہادت ایسی مقبول ہوئی کہ فوراً خلقۂ تاریک روشنی میں آگیا۔ مسجد۔ گرجا۔ مندر۔ شراب خانہ۔ غرض ہر مقام نے تنکے کی شہادت سے فائدہ اُٹھایا +

باغ میں تشریف لے جایئے۔ نہر کا پانی درختوں میں آ آکر جذب و فنا ہورہا ہوگا۔

باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے۔ پانی قربان نہ ہو تو درخت جل کر رہ جائیں۔
ذرا پھولوں کو بھی دیکھئے۔ کیا بہار ہے۔ توڑ لیجئے۔ یہ نازک ہستی بھی شہادت کا ارمان رکھتی ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ ان کو توڑ لیں۔ اور ٹہنیوں کے سایہ سے جدا کر کے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ ہار بنا کر گلے میں ڈالیں۔ چادر بنا کر قبر پر چڑھائیں۔ سہرا گوندھ کر سر پر رکھیں۔ یا شکر ملا کر گلقند بنائیں۔ ہر حال میں خدمت کو حاضر ہیں۔ یہ قربانی سے انکار کرتے تو تفریح کی کتنی کیفیتیں نابود رہتیں۔

ہاں مگر آپ کس قدر با انصاف ہیں۔ ان پھولوں کو شہید کر کے گھر لے چلے تو پتوں کا دونا بنا لیا۔ تاکہ سورج کی تپش سے ان کا جسم کملا نہ جائے۔ مگر کربلا میں اپنے رسولؐ کے نواسے کو شہید کر کے دھوپ میں پھینک دیا۔ اور حرم رسولؐ کو جو گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لطیف تھیں بے چادر کر کے پھرایا۔ یہ خیال نہ کیا کہ یہ بھی پھول ہیں مرجھا جائیں گے۔

القصہ نتیجہ ان سب مثالوں سے یہ نکلا کہ شہادت دوسرے کے فائدے کے واسطے اپنا وجود فنا کر دینے کا نام ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کی تمام موجودات میں ضرورت ہے۔ جو شخص ایسی ضرورت سے انکار کرے وہ گویا تمام بدیہیات سے انکار کرتا ہے اور اس کو بصارت و بصیرت سے محروم سمجھنا چاہئے۔

شہادت خوشی کی چیز ہے یا غم کی؟

اب یہاں ایک نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانۂ عالم میں ایسی مفید اور ضروری شے ہے تو اس کے سبب ماتم کیوں کیا جاتا؟ غمگینی و افسوس کو اس سے کیا تعلق۔ آؤ دیکھا کہ اس سے کیا سروکار۔ مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو۔ جو چیز شہید ہو رہی ہے اس کو تو اپنی

موت کا کچھ افسوس اور غم نہیں ہوتا۔ اور نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہوتی ہے۔ مگر غیروں کے دل پر اس کی چوٹ کا لگنا فطرتی امر ہے۔ بشرطیکہ اُن دلوں میں آدمیت کا حس اور دردشناسی کا مادہ بھی ہو۔ پروانہ اگر شمع کی شہادت دیکھ نہ سکے اور بے چین ہو کر در و دیوار سے سر ٹکرائے تو شمع اور نفسِ شہادت پر کوئی الزام قایم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بہت بڑی خود غرضی ہے کہ جس چیز سے نے ہمارے فائدہ کے لیے اپنی جان دیدی اُس کا ہم رنج بھی نہ کریں ٭

جو بتی پہلے جل چکی ہوتی ہے۔ اُس کا سرا آگ جلدی پکڑ لیتا ہے۔ لیکن کوری اور نئی بتی کو جس نے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو مشکل سے روشن کیا جاتا ہے اسی طرح جن دلوں میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی آگ کا نشان لگا دیا۔ وہ تو عالم کی تمام شہادتوں میں درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اس بھید کو سمجھنا کجا سمجھنا چاہتے بھی نہیں ٭

شہادتِ حضرت امام علیہ السلام کے جس قدر واقعات شعرا نے لکھے ہیں اور اُن میں شہیدوں کی بے سروسامانی اور مایوسی کی تصویریں کھینچی ہیں یا اُن کے اہلبیتؑ کی بیقراری و نالہ و زاری کے نقشے دکھائے ہیں۔ یہ سب ہمارے غم کو استوار اور اثر دار کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ ان باتوں کی کچھ اصلیت نہیں حضرت امامؑ اور اُن کے خاندان نے شمع سے بڑھکر سکوت و اطمینان ظاہر کیا۔ اور نہایت دلیری و ثابت قدمی سے ظہورِ حق کے لیے جانیں قربان کر دیں ٭

اسلام میں شہادت کی ابتدا

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے، اور دُنیا میں اسی کے بل پر صدہا

کام چلتے ہیں اب یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام میں شہادت کا دور کب شروع ہوا۔
اور کون کون بزرگ سب سے پہلے درجۂ شہادت کے وارث قرار پائے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے معرکہ کی لڑائی بدر میں
پیش آئی تھی۔ جہاں آپ کے مٹھی بھر صحابہ نے کفار قریش کے دَل بادل لشکر کو
پیسکر رکھ دیا۔ اس معرکہ میں جو مسلمان شہید ہوئے اُن کا مرتبہ بعد کی لڑائیوں کے
شہداء سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ بلکہ جو لوگ زندہ واپس آگئے وہ بھی شرکت بدر کا فخر
شہداء کی طرح کرتے تھے۔ اور مسلمان ان کے فخر کو تسلیم کرکے ان کی عظمت و بزرگی
کو دیگر مجاہدین پر فوق دیتے تھے۔ اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر سے احد
وغیرہ میدانوں کے سبب جڑ پکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی
حمایت وحفاظت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے۔

مگر مشائخ صوفیہ نے جس شہادت کو سب سے برگزیدہ شہادت مانا ہے وہ فنائے
نفس اور فنائے ماسوی اللہ ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں
سب سے پہلے بڑی عمر والوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تھے اور چھوٹی عمر میں حضرت
مولی علی رضؓ تھے۔ اور عورتوں میں بی بی خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ جنہوں نے تمام قوم
تمام ملک بلکہ تمام دُنیا کو لات مار کے کلمۂ توحید کے آگے سر جھکا دیا۔ اور تمام ملکی
قومی۔ خاندانی تعلقات کو ترک کرکے خنجر سے ذبح کر ڈالا۔

اس شہادت کے بعد دوسری شہادت کا رتبہ حضرت مولی علی رضؓ کو اور حاصل
ہوا اور وہ ہجرت کا زمانہ تھا۔ جبکہ کفار نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے
شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو آنحضرت صلعم نے مدینہ شریف کو ہجرت کرنی چاہی۔
مگر کفار نے گھیر ڈال رکھا تھا جس سے بچکر نکلنا آسان نہ تھا۔ اس وقت ایک فدائی
کی قربانی درکار تھی۔ جو آپ کے بستر پر لیٹ رہے اور آپکے عوض اپنی جان دیدے

لڑ کر مر جانا دوسری بات ہے۔ یوں مَوت کے مُنہ میں کوئی نہیں جا سکتا۔ مگر آنحضرتؐ کے قدیمی فدائی علیؓ نے جو ایک بار شہادت کا رتبہ حاصل کر بھی چکے تھے۔ اس جان جوکھوں کو قبول کیا اور بستر رسولؐ پر لیٹ گئے اِن دو شہادتوں کے بعد آپ کو تیسری شہادت بھی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ یعنی ابن ملجم کے خنجر سے زخمی ہو کر شہید ہوئے +

لڑائیوں کے قطع نظر اسلام میں سب سے پہلے شہید عمر فاروقؓ ہیں جو ایک پارسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں شہید ہوئے آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے غلط فہمی سے شہید کر دیا۔ اگرچہ آپ کی شہادت محض غلط فہمی کے سبب ہوئی۔ یعنی محمدؓ بن ابی بکر وغیرہ کی جماعت کو آپکی نسبت وہ شبہ ہوا جس کا آپ کو مطلق علم نہیں تھا اور جس میں آپ کی بے گناہی کا سب کو اقرار ہے۔ مگر آپ کی شہادت نے اس امر کا رستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہب لوگوں کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ کفار کے ہاتھوں شہادت کا جام حاصل ہوا کرتا تھا +

حضرت مولیٰ علیؓ کی شہادت کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادہ سیدنا حضرت امام حسنؓ کو مسلمانوں نے زہر دیکر شہید کر دیا۔ اور پھر آپ کے چھوٹے فرزند سیدنا حضرت امام حسینؓ کو کربلا میں لیجا کر مسلمانوں ہی نے مجبور کا پیاسا ذبح کر ڈالا اور یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور، زیادہ پُر درد زیادہ درجہ والی۔ زیادہ ہر دلعزیز اور نہایت مہتم بالشان چیز مانی جاتی ہے۔ اسی شہادت کی یادگار میں ہم نے بھی اپنے رسالہ کا شہید نمبر نکالا ہے +

چنانچہ مولانا حسینؓ کی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ حالانکہ ان سے پہلے [illegible] کے بعد [illegible] مسلمان نہایت [illegible] بے بسی کے عالم میں

ہشیار کیے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات اور واقعات سیدنا و مولانا حسینؓ کو پیش آئے اُن کا سانحہ گزشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے۔ نہ بعد کے تذکروں میں اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود ہے ؀

سیدنا و مولانا حسینؓ کی شہادت میں حسب ذیل خصوصیات تھیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں ؀

آپ اُس زمانہ میں تھے جب کہ اسلام کا نشو ونما تازہ تازہ ہوا تھا اور ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ خاصکر اپنے رسول کی اُلفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل و جان سے آنحضرتؐ پر نثار تھا اور آپ کے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بہت بڑے ادب کی مستحق مانی جاتی تھی ایسی حالت اور ایسے زمانہ میں خاص رسول کے نواسہ پر مسلمانوں کا یہ ظلم وستم کرنا کس قدر عجیب تھا۔ اور حضرت مولانا و سیدنا حسینؓ کے دل پر جو صدمہ اُن لوگوں کی بے وفائی و جفا شعاری کا گزرتا ہوگا وہ ہزار خنجر و سناں سے بڑھکر تھا کہ کل کے دن جو لوگ رسولؐ کے نواسہ کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں میں بچھاتے تھے آج وہ میرے سینہ پر پاؤں رکھکر گلا کاٹتے ہیں ؀

(۲) اہل و عیال کی بعیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اُس کے خاندان والے بھی ہوں مگر جو حالت سیدنا و مولانا حسینؓ کو بال بچوں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئی۔ وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئی ہوگی ؀

مختلف سن و سال کی عورتیں۔ ننھے ننھے بچے۔ اور وہ بھی بیمار۔ جن کو ہر مذہب و قوم نے قابلِ رحم سمجھا ہے۔ تین روز بھوک پیاس سے تڑپے۔ مگر حضرت کو بے کسی کے سبب کچھ چارہ کار نہ تھا ؀

ہمارے عقیدے میں اُس وقت خیمۂ امامؑ کی یہ تصویر تھی۔

ظہر کا وقت۔ صحرائے عرب کی تپش۔ خیمے کی قناتوں سے آگ کی لپٹیں آرہی ہیں پانی کو بند ہوئے دوسرا دن ہے۔ حضرت امام مستورات کے خیمہ میں تشریف لیگئے دیکھا سب کے چہروں پر بھوک پیاس کی شدت سے ہوائیاں اُڑرہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں اور آنے والے وقت کے کھٹکے سے سب پر یاس و ہراس کا عالم طاری ہے۔ آپ نے اپنی ہمشیرہ حضرت زینبؑ سے کہا۔ بہن! اگر تمہاری صلاح ہو تو یزید کی بیعت قبول کروں۔ کیونکہ مجھ سے تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ اور خبر نہیں میرے بعد تم پر اور کیا کیا ظلم و ستم ہوں بیعت کے اقرار سے یہ مصیبت جاتی رہیگی۔

اکیلے اور بے یار و مددگار بھائی کی زبان سے یہ کلمے سُنکر حضرت زینبؑ نے اپنی چادر کے آنچلوں کو اُلٹ دیا۔ اور بنی ہاشم کے تیوروں میں بیباک ہوکر بولیں۔ بھائی! تم میرا امتحان لیتے ہو۔ ہاشم کے گھر کی لڑکیاں کم ہمت اور ڈرپوک نہیں ہوتیں وہ اپنی آن اور حق کی حمایت میں جان دینی کچھ بات نہیں جانتیں۔ اے بھائی جاہلیت کے زمانہ میں عرب کی عورتیں بچہ کی پیدائش کے وقت سب سے بڑی آرزو اُس بچہ کی یہ کرتی تھیں۔ کہ یہ میدانوں میں تلوار چلانے والا۔ خون میں نہلانے اور نہانے والا ہو۔ پھر اسلام نے اس جنگی خیال کو شہادت کے درجات بیان کرکے اور بھی مستحکم کر دیا۔ تو کیا ہم میں عرب نسل اور مسلمان ہونے کے باوجود حرارت نہیں ہے۔ یاحسین! میں علیؑ کی بیٹی ہوں۔ جو خون کے میدانوں میں بے پروائی سے گھوڑا دوڑاتا تھا جو دشمن سے لڑتا نہیں تھا۔ بلکہ شیر کی طرح اپنے پنجوں سے کھلاڑیاں کرتا تھا۔ وہ جو فقر و فاقہ میں بھوک پیاس کو شرافت کا جوہر سمجھتا تھا۔ میں اپنے باپ کی اصل نسل لڑکی ہوں۔ مجھ کو عیب نہ لگا۔ میں تیرے سر کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھکر فخر کروں گی کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ حق کی پاسداری میں کٹ کر مرجاتے۔ اگر تو نے یزید کی بیعت قبول

کرلی تو ہمارے خاندان کے لیے اس سے بڑھکر اور کوئی ننگ و عار نہ ہوگی کہ ایک فاسق فاجر کی بیعت زندگی کے لالچ سے منظور کرلی۔ میں جانتی ہوں کہ تو میری زندگی کا سہارا ہے۔ تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ اور ایک فقط مجھ پر کیا منحصر ہے رسولؐ کے خاندان میں ہر شخص تیرے وجود کو اپنا سہارا اور پناہ سمجھتا ہے۔ مگر غریب زینب کے لاچار بھائی۔ حق بات کی حمایت میں جان دیدے۔ ہمارا کچھ فکر نہ کر ہم تکلیف و مصیبت کو آسانی سے برداشت کرنے والے لوگ ہیں +

حضرت زینبؑ کی تقریر ختم ہو چکی تو امام اپنی زوجہ حضرت شہربانو کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

تم کہو۔ تمہارا کیا خیال ہے ؟ بانو نے شرم آلود ادب سے نظریں جھکا کر کہا میں ہر حال میں تابع فرمان ہوں۔ جو میرے مالک کی مرضی ہو۔ اس کی تعمیل کروں گی اگرچہ میں حضرت زینب کی طرح فخر تو نہیں کر سکتی۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ میری پیدائش ایران کے شہنشاہ کے گھر میں ہوئی تھی۔ اور اب بھی ایک شہنشاہ کے گھر میں ہوں۔ پس ایک حرارت والا اور ہمت والا دل میرے سینہ میں بھی حرکت زن ہے۔ نازک وقت میں میری بے صبری کا اندیشہ میری توہین و حقارت ہے۔ اے امام! ان سب بچوں کو جو میری گود کی زینت ہیں بلکہ برسوں کی محنت سے پالا ہے۔ جن کے دیکھنے سے میری زندگی قایم ہے۔ میدان میں لیجائیے۔ اور قربان کر دیجئے میں بھی قربان اور یہ بچے بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ حق کی پاسداری کے خیال کو میرے خیال سے چھوڑ دیں۔ چلیئے۔ تاجدار ایران کی لڑکی اپنے شریف خون کا وصف دکھانے میدان میں چلیئے۔ میں رکاب تھام کر چلوں گی۔ اور تیر و سناں کے میدان میں آپکے قدموں پر جان دیدوں گی +

حضرت امامؑ عورتوں کی اس دلیری سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ شاباش

ایساہی خیال رکھنا +

ان باتوں کے باوجود حضرت امام بشر تھے۔ جوان جوان بچوں کا سامنے کٹ جانا۔ ننھے ننھے بچوں کا بھوک پیاس سے بلکنا۔ اور اس پر یہ خیال کرنا کہ میرے بعد میرے ناموس کا کیا حال ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بنی ہاشم اور رسول کے گھر کی مستورات کے ساتھ دشمن ناروا بے عنوانی کریں +

الغرض بال بچوں کی ہمراہی بھی ایک بڑا امتحان تھا۔ جس نے حضرت کی شہادت میں خاص خصوصیت پیدا کر دی تھی +

(۳) بھوک پیاس میں بہت آدمی شہید ہوئے ہوں گے۔ مگر جو کیفیت حضرت امام اور آپ کے خاندان کی تھی وہ کسی کو پیش نہیں آئی۔ پورے تین شب و روز کا بھوکا پیاسا رہنا۔ گرمی کا موسم۔ عرب کی گرمی۔ چاروں طرف سے تکلیف کے اسباب گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں۔ اور حضرت امام آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتے تھے +

امریکہ کے ایک تشریح داں ڈاکٹر مینے لکھا ہے کہ جب انسان ۲۷ گھنٹے پیاسا رہتا ہے تو اس کے ہر رونگ میں ایسی تکلیف ہوتی ہے گویا ایک انچ زخم پڑ گیا ہے۔ پس حضرت امامؑ اور آپ کے فدائی ۷۲ گھنٹے کامل پیاسے رہکر جب برچھی و تلوار کے زخم کھاتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایسی دردناک تکالیف کو برداشت کرنا اور امر حق سے قدم نہ ہٹانا شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے +

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا۔ سوائے ایک طفل بیمار کے کوئی باقی نہ رہا۔ جس سے بقائے نسل کی اُمید ہو۔ اس پر بھی قول کی حمایت کرنا اور مرنے کو تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے +

(۵) آخر وقت تک اپنے اشغال و قواعد کو جاری رکھنا اور مصیبت سے

حواس باختہ نہ ہونا بھی خصوصیات امام سے ہے۔ حد ہے کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی اور سجدہ ناغہ نہ کیا۔

اس شہادت کے بعد

اکثر سادات و مشائخ اسی قصور پر شہید ہوئے جو حضرت امامؓ کے ذمہ لگایا تھا یعنی جس طرح یزید بن معاویہ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسینؓ کی زندگی میں اس کی بادشاہت پختگی سے نہیں جم سکتی۔ اس لیے کسی بہانہ سے ان کا قصہ پاک کر دینا چاہیے ایسے ہی حضرت امام کے بعد متعدد اماموں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سب ائمہ اطہار کو ہوس پرست نام کے مسلمان بادشاہوں نے شہید کیا۔ بعض سادات کو ایسی بے رحمی سے شہید کیا گیا کہ اگر ان کی تفصیل کی جائے تو کلیجہ کانپ اٹھے۔ سیدوں کے نازک جسم جو ریشمین کپڑوں کی طرح نرم اور خوبصورت تھے اموی اور عباسی خلفاء نے زندہ دیواروں میں چنوا دیے اور ان غریبوں نے پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔

حضرت امام حسینؓ اور ان کی اولاد کے بعد پولیٹیکل بدگمانی کی وبا ایسی پھیلی کہ جو شخص عبادت و یادِ خدا کے سبب خلقت میں ذرا عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اس بیچارہ پر آفت آجاتی۔ یا تو جلاوطن ہوتا۔ یا کسی شرعی بہانہ کی آڑ میں قتل کر دیا جاتا۔ اس کی صدہا مثالیں تاریخ کے صفحوں پر موجود ہیں۔ جس میں سے چند اس شہید نمبر میں لکھی گئی ہیں۔ باقی پھر کسی موقع پر بیان ہوں گی۔

حضرت شہاب الدین مقتول کو محض ان کے کمالات و تسخیر خلائق کے سبب بے دردی سے مار ڈالا گیا حضرت منصور کو خفیہ منصوبہ باز تصور کر کے دار پر کھینچ دیا۔ سرمد کو دارا کا ہمدرد سمجھ کر مقتول کیا اور اس اندیشہ سے کہ کہیں سرمد لوگوں کو انتقام

سکے۔ پینے کھڑا نہ کرسے۔ بے سروپا الزام لگایا گیا اور بے گناہ قتل کیا گیا۔ سیدی مولہ کی ہر دلعزیزی و بزرگی و سخاوت جلال الدین خلجی جیسے نیک سلطان کو بھی کھٹکی۔ اور بیچارے درویش کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔

اب آخر زمانہ میں ترکی سلطان کے پیر و مرشد سید ابو الہدیٰ رفاعی کو نوجوان ترکوں نے تاریک کوٹھری میں بند کرکے محض اس جھوٹے شبہ میں مار ڈالا کہ سید صاحب ان کے پولٹیکل منصوبوں میں حارج تھے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں مسلمان بادشاہوں پر ظلم و سفاکی کا بیجا الزام لگاتا ہوں۔ یا میرے دل میں اسلامی حکومت کی کوئی عظمت نہیں ہے بلکہ مقصود بزرگان دین کی شہادت کا احوال لکھنا ہے۔ اس کے ضمن میں لازمی طور پر قاتل و مقتول کے حق و باطل پر نظر جاتی ہے۔ اور ائمہ اطہار و مشائخ کبار بے گناہ و مظلوم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب قصور شخصی و خود مختارانہ حکومتوں کا تھا۔ جو قاعدۂ اسلام کے برخلاف تھیں۔ اس لیے ہر مسلمان خود ایسی حکومت ہی کو سرے سے ظلم و سفاکی کا مظہر خیال کرتا ہے۔ اسلام نے جمہوریت و مساوات کی حکومت قایم کرکے کامل حریت انسانوں کو عطا فرمائی تھی۔ مگر لوگوں نے اپنے ذاتی فوائد کی خاطر اصول اسلامی کو کچل ڈالا۔ اور شخصی بادشاہت قایم کر دی۔

شخصی حکومتوں میں ہمیشہ خود غرض لوگ بادشاہ کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوتا ہے اور کٹ پتلی نہ بنے تو کیا کرے۔ اکیلا بشر تمام ملک کی خبر گیری و حفاظت میں مجبور محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مختار بادشاہ حاشیہ نشین لوگوں کے بہکانے سے خونریزیاں اور بے انصافیاں کیا کرتے ہیں۔ ہم کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان خود مختار بادشاہوں میں بعض ایسے دل و دماغ کے تھے کہ ہزاروں آدمیوں کی متفقہ رائے ان کی رائے کے سامنے نکمی اور کمزور ثابت ہوتی تھی۔ لیکن ایک آدمی

پھر ایک ہی ہے ہمیشہ اس کی رائے پر بھروسہ نہیں ہو سکتا ۔

جو بزرگان دین خود مختار بادشاہوں کی غلطیوں سے شہید ہوئے وہ سب بے گناہ و مظلوم تھے۔ اس کی نسبت ہم کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جن شہدا کا اس شہید نمبر میں ذکر ہے وہ یقیناً ناکردہ گناہ شہید کیے گئے ۔

غالباً یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بعض مشائخ کبار نے جب خود مختار بادشاہوں کی دست درازیاں دیکھیں اور ان کو اپنی جان کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں بد دعا کی جس سے وہ بادشاہ ہلاک و تباہ ہو گئے۔ مثلاً ہمارے سرتاج سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی نسبت جب ناتجربہ کار سلطان قطب الدین خلجی کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت سلطان المشائخ کا وجود پولیٹیکل حیثیت سے تیری تاجداری کو نقصان پہنچائے گا تو اس نے آپ کو آزار پہنچانا چاہا۔ اور قریب تھا کہ ایک چاند رات کو حضرت کا آفتاب حیات ابر شمشیر سے پوشیدہ کر دیا جائے۔ تو خدا نے آپ میں اپنی شان قہاری کو ظاہر فرمایا اور آپ نے گرج کر یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

اے روبہک چرا ننشستی بجائے خویش ۔۔۔ با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

یعنی او لومڑی اپنی جگہ کیوں نہ بیٹھی رہی۔ شیر سے پنجہ کیا۔ اپنی سزا دیکھی۔ آپکا یہ شعر پڑھنا تہا کہ بادشاہ کے ایک منظور نظر غلام نے بادشاہ کا سر کاٹ ڈالا۔ اور اس طرح وہ آہنی پنجہ جو حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہیؒ کی اذیت کے لیے بڑھایا گیا تھا۔ غیب کے فولادی پنجے سے آن کی آن میں شکست کھا گیا ۔

اب نئے زمانہ کے مؤرخ اس واقعہ پر طرح طرح کے حاشیے چڑھاتے ہیں مگر ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ خود مختار سلطان کو اور تمام دنیا کو یہ دکھانے کے واسطے کہ کوئی دوسری با اختیار طاقت بھی موجود ہے جو سب طاقتوں و حکومتوں کی

گراں ہے اور زبردست کو زیر دست کر دینا اُس کو کچھ مشکل نہیں۔ یہ واقعہ ظاہر ہوا۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کو ظالم کے شر سے بچا لیگیا۔

ناظرین! خود مختار بادشاہوں کی حرکات پر اگر انصاف کی نظر ڈالیں گے تو اُن کو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت انسان انسان نہ تھا بلکہ گھاس پھوس کی طرح بالکل زندگی بسر کرتا تھا جس کو ہر وقت جان و آبرو کا خوف دامنگیر تھا۔ آزادی جو ہر آدمی کی فطرت میں رکھی گئی ہے ہمیشہ دل کے قیدخانہ میں بند رہتی تھی زبان اور قلم پر مُہر لگی ہوئی تھی کہ آزادی نکل نہ آئے۔ اس میں مذہب کو کچھ دخل نہ دینا چاہیے۔ کیونکہ خود مختاری ہر ملک۔ ہر مذہب۔ ہر قوم میں یکساں ضرر پہونچاتی تھی۔ اس لیے میرا روئے سخن مسلمان بادشاہوں سے نہیں ہے۔

اُس زمانہ میں زیادہ دولت مند ہونا۔ زیادہ پُرسوخ ہونا۔ زیادہ خداپرست ہونا قابلِ دار جرم تھا۔ کیونکہ اسی قسم کے آدمی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا کرتے تھے۔ مگر آج خدا کے فضل سے جمہوریت و مساوات کا دَور ہے آزادی خوش و خرم ہر گھر میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ زیادہ دولت مندی زیادہ عزت کی علامت ہے۔ زیادہ رسوخ ہونا بادشاہ کی نظر میں ممتاز بناتا ہے۔ عبادت و خداپرستی کی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ آزادی اتنی بڑی ہے کہ شیطان پرستی سے بھی کوئی نہیں روکتا۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا آسمان سے مینہ برساتا ہے تاکہ زمین میں سبزی و غلہ پیدا ہو۔ ہَوا چلاتا ہے۔ تاکہ ہم اُس کے سہارے زندہ رہیں۔ یا اُس نے چاند سورج۔ پانی۔ بجلی۔ وغیرہ چیزیں انسان کے عام فائدہ کے لیے پیدا کی ہیں اور اُن کو دیکھکر ہم اپنے محسن اور رحیم خدا کا شکر و حمد بجالاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اُس کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے کہ اُس نے آزادی کی حکومت عطا فرمائی۔ جس کے سایہ میں ہم نہایت بے فکری اور امن سے زندگی بسر کرتے ہیں اور جس طرح چاہیں اور جس قدر

چاہیں خدا کی عبادت کر سکتے ہیں۔ کوئی مخل اور حارج نہیں۔ اب ہماری مذہبی برتری یا تقدس کی عالمگیری سے کسی کو بدگمانی نہیں ہوتی +

اس لیئے

اے حجروں اور گوشوں میں رہنے والے بزرگو! باہر نکلو اور آزادی سے حق کے نعرے لگاؤ۔ اب منصور و سرمدکی طرح تم کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیگا یہ توپ خانے یہ فوجیں۔ یہ رسالے۔ یہ سنگینیں۔ یہ چھاؤنیاں سب تمہاری ہیں اور تمہارے ہی امن و سکون کی خاطر پرے جمائے کھڑی ہیں۔ شکر کرو۔ کس کا! آدمی کا نہیں۔ خدا کا۔ جس نے اپنی رحمت سے یہ آزاد حکومت عطا فرمائی +

انگریز و ترک۔ افغان و ایران۔ ہند و جاپان سب الفاظ ہیں جن کو دیکھنا تمہاری شان سے بعید ہے۔ تم تو حقیقت و معانی کو دیکھنے والے ہو۔ یہ اشکال و صور تو تمہارے عقیدے میں نابود و بے حقیقت ہیں +

ہاں یہ مت سمجھو کہ حکومت عیسائیوں کی ہے یا موسائیوں کی۔ انگریزوں کی ہے یا افغانیوں کی ہے۔ کالوں کی ہے یا گوروں کی۔ بلکہ طریق حکومت کو دیکھو۔ اس کے اثر و کیفیت کو مشاہدہ کرو۔ کہ اس میں کس قدر راحت۔ آسایش۔ سکون و خاموشی ہے۔ خدا تعالی اس آزادی کو برقرار رکھے۔ اور ہم کو دوسرا اور ویسی شہادت نامہ لکھنے وقت موجودہ وقت میں کوئی ظاہری واقعہ نہ ملے۔ اور مجبور ہو کر باطنی شہادت کی طرف رجوع کریں جو شہادت اکبر ہے اور جس کا حاصل کرنا ہر صوفی کا مقصود حقیقی ہے +
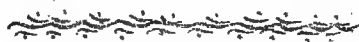
مستانہ بزمِ مولود

نئے الفاظ ہیں پُرانے مطالب

دن آ گئے کہ ہم فراق کی راتوں سے رخصت ہوں۔ ربیع الاول کا چاند عرب کے اُفق سے بلند ہونے کو ہے۔ آؤ سب ملکر اُس کو دیکھیں اور چشم منتظر کو ٹھنڈا کریں۔

سارا جہان اس ماہِ مُبارک میں اُس پاکیزہ وجود کے میلاد کا ذکر کرے گا جو تمام موجودات کے وجود کا سبب ہے۔ ہم بھی جہان میں ہیں۔ کیوں نہ ایک بزمِ میلاد منعقد کریں۔

نظام المشائخ کے اوراق کا فرش بچھا دو۔ حروف کے نقش و نگار سے محفل کو آراستہ کر دو۔ اور صدائے مستانہ سُنو۔

ہم اپنی محفل میں اغیار کو نہیں بلائیں گے۔ نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس شاندار بزم میں مدعو ہو سکے۔ رقعہ خدا کو گیا تھا اور اُس سے درخواست کی گئی تھی کہ ہماری مجلس کی صدارت قبول فرمائے اور اپنی مرضی سے جسکو چاہے شرکت جلسہ کی دعوت دے۔ سو اُسکے لیے زرق برق [illegible] کے چمکنے کاغذ پر مطبع حقانی پر حسب ذیل اعلان چھپوا کر اخبار القرآن میں شائع کر دیا۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ط

"خدا اور اُس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں۔ تم بھی اے ایمان والوں اُسپر درود و سلام بھیجو"۔

چونکہ القرآن کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ بیشمار اہل ایمان اس بزم درود و سلام و ذکر خیر الانام کی شرکت کے لیے جمع ہوگئے ہیں اس وقت صدر انجمن صاحب جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کرسی لامکان پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنی افتتاحی تقریر آواز ھو میں شروع کی جو یہ تھی:-

فرشتوں! اور جن (تقلین (ایمان دار آدمیوں)!! میں خوش ہوں کہ تم سے آج کے دن شان تعین میں خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تمہاری کوئی بزم ایسی نہیں ہے جو میرے دائرۂ وجود سے باہر ہو۔ مگر یہ محفل ایک خاص محفل ہے جس میں علانیہ میری تجلی تم سے ہمکلام ہوتی ہے۔ آج کے جلسہ کی غرض یہ ہے کہ ہم سب اسم کثرت کی شان میں اس نور کا ذکر کریں جو ہماری ذات وحدت مآب کا ذکر بشکل حمد و ثنا میں تھا جس کو ہم نے احمد بھی کہا اور محمد بھی۔

میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کس کا ذکر کیونکر کیا جائے گا۔ سنو سنو۔ ہر وجود اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اس کا ذکر کرے۔ مگر ہم کبریائی کے مالک ہیں۔ سب کچھ ہمارا ہے۔ سب کچھ ہم میں ہے۔ سب کچھ ہم سے ہے۔ اور سب کچھ ہم ہیں۔ اس لیے ہمارا ذکر صرف ان الفاظ میں ہوگا۔

اے کملی اوڑھنے والے اُٹھ۔ رات کو ہماری یاد کر۔ لوگوں کو ہدایت کا رستہ بتا۔ ہماری شان سے اُن کو آگاہ کر۔ مانگ۔ تجھ کو دیا جائے گا۔ بول اسکو سُنا جائے گا۔ سفارش کر۔ قبولیت ہوگی۔ اے اندھیری رات کی مثل سیاہ گیسو والے اے صبح کی روشنی کے مانند منور چہرے والے میں تجھ کو پسند کرتا ہوں۔ تو ازل سے ابد تک میرا ہے۔ تجھ پر میرا سلام۔

فرشتو! تمہارا ذکر یہ ہے کہ اس آدم نژاد کو سجدہ کرو۔ مومنوں! تم اس

کی اطاعت کرو۔ یہی تمہارا ذکر ہے ٭

جب حضرتِ قدوس اپنا ایڈریس ختم کر چکے تو ایک گدڑی پوش مست کھڑا ہوا۔ اور اس طرح بولنے لگا ٭

جنابِ باری! و دیگر یارانِ خراباتی! میں دیوانہ ہوں اور عقل و خرد سے بیگانہ لہٰذا اجازت دیجئے کہ میں اپنے ممدوح کا ذکر اس قاعدہ اور ضابطہ سے نہ کروں جس کا مجمل خاکہ پریسیڈنٹ صاحب نے قایم کر کے دکھایا ہے بلکہ ذوق و شوق اور ولولے میں جو چاہوں کہہ جاؤں۔ چیرز (نعرۂ حق) اُمید ہے کہ آنریبل چیئرزمین مجھ ذرۂ بےمقدار کی گستاخی و بےادبی سے ناراض ہو کر ظلوماً جہولاً سے زیادہ کوئی اور دوسرا خطاب تجویز نہ فرمائینگے

خندہ اور زور شور سے چیرز (نعرۂ حق) ٭

میں حضرت سُبحانی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنی دعوت نامہ میں جس نبی پر درود و سلام بھیجنے کا ذکر ہے وہ کونسا نبی ہے۔ کیا وہ جس کا خاکی وجود سب سے پہلے بنا۔ اور جس کے متحرک ہونے کے واسطے خود ذاتِ ربانی نے اپنے دم کو بلایا۔ اور آدم کے حکم کو سُنکر سب موجودات نے اس پیکرِ خاک کو آدم کا لقب دیا۔ یا وہ جسکو نوح کہتے ہیں جس نے حضرت کی شانِ قہر کو طوفان آپ پر علانیہ جنبش کرتے دیکھا۔ یا نبی مراد آپ پر فطرتاً ایمان لانے والے ابراہیم سے ہے یا جنہوں نے طور پر اندوہناک کلام کے بعد ذرا نیاکانہ جرأت پردہ اُٹھانے کی کی تھی۔ یا نبی کا لفظ ابنِ مریم کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ جو آپ کی حیران کرنے والی نشانیوں میں ایک نشانی تھے ٭

اگر یہ سب نہیں تو کیا وہ یتیم جو اُن کی آغوش میں پلا۔ وہ چھوٹے سے قد پر لمبے لمبے بال بکھیرے لکڑی ہاتھ میں لیے بکریاں چراتا تھا۔ وہ جو کمبل اوڑھ کر آیا۔ اور وہ شالہ اُڑھا کر گیا۔ جس نے جو کا آٹا کھایا اور گیہوں کا کھلایا؟

پروردگار! ہمیں بتا۔ کیا وہی جو امن میں شیر کی طرح شیریں اور صاف۔ اور جنگ میں

شیر کی مانند دلیر وصف شکن تھا۔ کیا وہی جو نیزہ و شمشیر کا مالک اور میدان کارزار کی رونق تھا جس کی پشت دشمن نے کبھی نہیں دیکھی جس کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ جسکو آپ کی گورنمنٹ نے خلق عظیم کی ڈگری عطا فرمائی۔ وہ جو غریبوں بیکسوں۔ لاوارثوں کا ولی و سرپرست تھا۔ وہ جو مدینہ کی گلیوں میں معمولی آدمیوں کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ آہ۔ آہ۔ آہ۔ وہ تو نہیں جس کی آنکھوں کی یاد نے ہم کو آنسوؤں کے دریا میں ڈبو رکھا ہے؟ اگر وہ ہے تو ہم کو اجازت دی جائے کہ اُس کی محبت کا جام سر جلسہ نوش کریں اور اس دربار میں جتنے مجھ جیسے متانے ہیں اُن کو رخصت ملے تا کہ ؎

خراباتیاں مے پرستی کنند
محمدؐ بگویند و مستی کنند

رند خراباتی اس قدر گفتگو کرنے پایا تھا کہ محفل میں گردش پیدا ہوئی اور عاشقان سوختہ تڑپنے لگے۔ تجلی کی بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگیں۔ اور ہوا جو ہوا۔ بیچارہ حسن کی مجال نہیں کہ اس سے زیادہ اس محفل کی نسبت زبان کھولے۔

صاحب بزم میلاد کے اخلاق

اس متانہ و بے باکانہ بیان کے بعد بزم میلاد کے سالکانہ طریق کو ادا کیا جاتا ہے جس میں میرے عقیدے میں سب سے زیادہ مفید اور ضروری صاحب میلاد کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ ہے۔ جن کو احادیث کی معتبر روایتوں سے اخذ کر کے لکھا جاتا ہے۔

جس طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے اسی طرح اُن کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ یہ ارشاد ہوا۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ تمہاری پیدائش اے محمدؐ

بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خُلقِ محمدی شاندار چیز ہے کہ حضور رسول مقبول کے اعلیٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حُسنِ خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُس کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے +

احمدؒ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سب سے بھاری چیز جو میزان اعمال میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہو گی ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا۔ دین کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا خوش خلقی اُس شخص نے آپ کے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا +

ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حُسنِ خلق کسی نے عرض کیا۔ باعتبار ایمان افضل کون ہے۔ فرمایا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ کے بیان کیا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلقِ حسن میں بڑھ جاؤ +

حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر یوں دُعا فرماتے تھے اللھم احسنت خلقی فحسن خلقی الٰہی تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا +

دریافت کیا گیا۔ بندہ کو سب سے اچھی چیز کیا دی گئی ہے؟ فرمایا خلق حسن۔ دوسری جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہونگے

جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا کوئی تدبیر عقل کے موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی ٭

بد خلقی کی بُرائی

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا۔ نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بد خلقی فرمایا۔ بد خلقی نیک اعمال کو اس طرح خراب کر دیتی ہے۔ جس طرح سرکہ شہد کو بد مزہ کر دیتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے۔ بد خلقی ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ نیز آپ نے فرمایا۔ بد خلق آدمی دوزخ کی تہ میں ڈالا جائے گا ٭

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لیجاتے غلام کی دعوت کو منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے صحابہ کو تکلیف نہ دیتے۔ بلکہ جو کام خود کر سکتے تھے اُس کو دوسرے سے کرانا بُرا تصور کرتے تھے۔ جب آپ کا گزر لڑکوں پر ہوتا اُن کو سلام کرتے ٭

ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے میں بادشاہ نہیں ہوں میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ اپنے اصحاب میں اس طرح مل جل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر آپ تشریف رکھنے لگے۔ اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی ٭

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی نے آپ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجئے تاکہ تکلیف نہ ہو۔ آپ نے ارشاد کیا۔ میں اسی طرح کھاؤں گا جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے کسی نے

اور کوئی آدمی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبیک فرماتے۔ جس قسم کی بات کا آپ کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا۔ آپ بھی اُس کے متعلق باتیں کرتے۔ اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو آپ بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو آپ بھی تبسم فرماتے۔ اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں صحابہ کو زجر و توبیخ نہ فرماتے تھے فقیروں میں بیٹھتے مساکین کو کھانا اپنے ساتھ کھلا لیتے۔ جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے اُن کا احترام فرماتے تھے جو آپ کے سامنے عذر کرتا۔ اُسکا عذر قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے۔ مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ اپنے اہل کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے۔ لوگ آپ کے سامنے بولتے تھے جس سے آپ کو اذیت ہوتی تھی۔ مگر آپ صبر فرماتے کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے۔ کسی بادشاہ سے اُس کی دُنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کیا۔ اگر آپ سے کہا جاتا کہ کسی کے لیے بددُعا کیجئے تو آپ اُس کو دُعا دیتے۔ سوائے جہاد کے آپ نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر آپ کے واسطے بچھونا بچھوا دیا جاتا تو آپ اُس پر لیٹ رہتے۔ اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی آپ سے ملتا۔ سلام میں سبقت فرماتے۔ اور جب تک وہ چلا نہ جاتا آپ کھڑے رہتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو آپ چھڑانے کی کوشش نہ کرتے یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا آپ کے پاس کوئی آتا اور آپ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو تو کہو۔

کسی مجمع میں تشریف لیجاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے کسی کو اُٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی کبھی پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ جو لوگ آپکے پاس آتے اُن کی خاطر اور تعظیم فرماتے۔ قرابت داروں کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے جس تکیہ کے سہارے آپ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے

سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو تم دیگر تکیہ کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے +

قصہ مختصر یہ آپ کے حُسن اخلاق کا مجمل سا بیان ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاصکر صوفیائے کرام جو حضورؐ کی پیروی و اتباع کو مقصود حقیقی تصور کرتے ہیں۔ آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو مشائخ کی محفلیں متکبر امراء کے درباروں سے بڑھکر پائی جاتی ہیں۔ جہاں غرباء و کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سُننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقراء میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان زمین کا فرق پڑ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب و العجم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا نمونہ بنکر نمودار ہوں تاکہ روحانیت کی پیاسی دُنیا اسلامی چشمۂ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے آمین +

درویشی مرکز

(از نظام المشائخ جون ۱۹۱۳ء)

آج کل ہر قوم اپنے استحکام اور قرار وجود کے لیے ایک مرکز قائم کر رہی ہے۔ مسلمانوں کا قومی و دینی مرکز تیرہ سو برس سے عرب میں موجود ہے۔ ہر فرقہ و ہر عقیدے کا مسلمان مکہ معظمہ مدینہ منورہ کو اپنی ہستی کی قرارگاہ سمجھتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ اس عام مرکز کے علاوہ اپنے مشرب و طریقہ کے جداگانہ مرکز بھی ہوں جو مرکز اعلیٰ کی شاخیں تصور کی جائیں + مثلاً علمی حیثیت سے مسلمانوں کا دینی مرکز ندوہ قرار پایا ہے۔ اور دنیاوی علی گڈھ تو

مناسب ہے کہ درویشی مرکز اجمیر شریف مقرر کیا جائے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ سب سلسلوں سے فروغ رکھتا ہے اور قادریہ سہروردیہ خاندان بھی بوجہ قربت خاص کے اس ملک میں چشتیوں کے دست و بازو ہیں۔ ان دونوں سلسلوں کو اجمیر شریف کے مرکز بنانے میں ہرگز تامل نہ ہوگا۔

رہ گیا نقشبندیہ طریقہ۔ اس کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ اس خاندان کے مشائخ سرہند کے مقابلہ میں اجمیر شریف کو ترجیح نہ دینگے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ حضرات نقشبندیہ ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ تین سلسلوں سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ بنائیں گے۔ کیونکہ ان میں خدا کے فضل سے بڑے بڑے فاضل اور روشن خیال بزرگ موجود ہیں۔ جو مرکز کی اہمیت اور اجماع کی خوبی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہم مشرب بھائیوں کا اس معاملہ میں ساتھ چھوڑ دینگے۔

اجمیر شریف کو مرکز بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کے سجادہ نشین کو سب مشائخ ہند کا پیشوا تسلیم کرایا جائے مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ اجمیر شریف میں سب سلسلوں کے مشائخ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جو بات تمام طبقۂ صوفیہ کے مفاد کی پیش آئے وہ اجمیر شریف کے مقام پر مشائخ کے مشورہ میں لائی جائے اور اس اجماع سے جو فیصلہ ہو وہ سارے ملک میں عملدرآمد کے قابل تسلیم کیا جائے۔

مرکزی ضرورت پر وضاحت کے ساتھ لکھنا بجائے خود ایک طویل گفتگو کا محتاج ہے جس کا یہ وقت اور موقع نہیں ہے۔ مشائخ نے خواہش کی تو آئندہ اس کی تشریح کر دی جائے گی۔ میرا تخیل عرصہ دراز سے درویشوں کی مرکزی ضرورت پر گردش کھا رہا ہے اور اس کے متعلق میرے دل میں طوفانی ولولے ہیں۔ میرے لیے وہ دن سب سے بڑا اور مبارک ہوگا جب کہ میں اپنے مرکزی تخیل کا مجسمہ سرزمین ہند پر دیکھوں گا۔ یا میری روح اپنے مقام پر اس کو محسوس کرے گی۔

میں جانتا ہوں کہ مشائخ میں ابھی یہ احساس بہت کم پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی ہستی کا خرقہ صحرائے زمانہ کے خاروں سے محفوظ کرنے پر مائل ہوں۔ تاہم مایوس نہونا چاہیے آگاہ کرنے سے آگاہی ہوتی ہے۔ فریاد کرنے سے داد ملتی ہے یہ ہماری پراگندگی کا باعث ہے کہ دوسرے فرقے ہم کو ٹھکراتے ہیں اور زیر وزبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس دن ہم ایک مرکز پر جمع ہوکر اپنے وجود کو مستحکم کرکے دکھائیں گے۔ پھر کس کی مجال ہے جو ہم کو آنکھ اٹھاکر بھی دیکھ سکے ؛

رام اُپدیش

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۲ء)

ہندوؤں کے مشہور ومعروف مذہبی پیشوا سری رام چندر جی کے عارفانہ کلمات یوگ بسشٹ سے محض ناظرین نظام المشائخ کے ملاحظہ کے لیے ترجمہ کرتا ہوں۔ تاکہ ہمارے مشائخ وفقرار کو ہندوؤں کے مقتداؤں کی روش اور اُن کی دوش سے آگاہی ہو ؛

حسن نظامی

ایک جلسے میں جہاں راجہ دسرتھ رام چندر جی کے باپ اور باشسٹ جی اُن کے گرو واُستاد اور بسوامتر جی اس زمانہ کے نامور عارف بزرگ موجود تھے اور رام چندر جی کی عمر صرف ۱۶ برس کی تھی اُنہوں نے یہ تقریر کی ؛

دُنیا کی بُرائی

دُنیا ناپائدار ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے۔ مرتا ہے۔ مال اسباب جو دُنیا میں ہیں بلا اور محنت کے سبب ہیں۔ اس کی زندگانی کچھ خوشی اور آرام کی چیز نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دُنیادار اسے آرام کا گھر سمجھتے ہیں۔ دیکھو۔ عورت۔ مال متاع اور سب دُنیا کی موجودات ایک دوسرے سے میل نہیں رکھتے۔ جس طرح لوہے کی سیخیں اکٹھی باندھی جائیں تو جیساں

نہیں ہوتیں۔ پس دنیادار کیونکر یہ کہہ سکتا ہے کہ اسباب دنیا سے اصلی جوڑ ملا سکتا ہے کہ فلانی
چیز میری اور اسکا ٹھکا میرا ہے +

میں نہیں جانتا کہ کون ہوں۔ اور یہ تمام عالم جو دیکھنے میں آتا ہے کس چیز سے ظہور
میں آیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بے حقیقت ہے۔ مگر موجود نظر آتا ہے۔ اس سے نہ کسی کو
نفع ہے نہ نقصان۔ وہ چمکتی ریت کی طرح ہے جو پیاسے کو دھوکا دے مگر نہ پیاس کو بجھا
سکے اور نہ اس میں ڈوب سکے۔ وہ گھر جو مال اسباب سے بھرا ہوا ہو مگر حقیقت معرفت
کی مایہ سے خالی ہے۔ آرام کی جگہ نہیں ہے۔ جیسے وہ غریب آدمی خوش نہیں رہ سکتا
جس کے اولاد بہت ہو حالانکہ اولاد انسان کے دل کو خوش کرتی ہے +

دولت سب کو پھسلاتی ہے مگر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ اور کسی کو حقیقتاً خوشحال
نہیں کرتی۔ عیب و ہنر کے بغیر دیکھے جہاں جی چاہا مقام کر دیتی ہے۔ تو اس سے اخلاص
پیدا کر کے سانپ کو دودھ پلاتا ہے۔ ایک دن یہ سانپ تیرے دودھ سے پلے
ہوئے زہر کو تیرے ہی مار ڈالنے میں خرچ کرے گا +

آدمی جب تک مفلس ہے۔ سب سے ملکر اور جھک کر چلتا ہے۔ مگر دولت ملتے
ہی اپنے بیگانے سب سے بگڑتا ہے اور پتھر کا دل بنا لیتا ہے۔ جیسے ہوا نرم برف کو پتھر
بنا دیتی ہے دولت دل کی صفائی اور روشنی کو گدلا کر دیتی ہے جیسے یاقوت مٹی
میں رکھنے سے بے آب ہو جاتا ہے +

زندگی

زندگی کا کچھ بھروسا نہیں پتے کی نوک پر رکا ہوا پانی کا قطرہ مضبوط ٹھکانہ نہیں ہے
پس تو بھی اپنی زندگی کو پائدار مت سمجھ +

جس طرح ہوا کو پکڑ نہیں سکتے۔ جواہرات کی چمکدار کرنوں کو ایک لڑی میں پرو نہیں
سکتے اسی طرح ابدی زندگانی کسی کے اختیار میں نہیں +

زندگی معرفت الٰہی کی پناہ میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ ظاہری زندگی جانور اور گھاس پھوس بھی رکھتے ہیں مگر حقیقی زندگی اُسی کو ملتی ہے جو حقیقت کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

بُڑھاپے سے ایک قدم چلنا دوبھر ہے۔ مگر تو زندگانی کی ترقی ہی چاہے جاتا ہے کیا تو نہیں دیکھتا کہ بوڑھا گدھا جب بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ رہے تو جنگل میں اکیلا نکال دیا جاتا ہے۔

دِل

دُنیا کے دھندوں کے سبب دِل بزرگوں کے طریق پر نہیں ٹھہرتا جس طرح پرند کے پَر ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ دِل کُتّے کی طرح ہر آواز پر لپکنا چاہتا ہے اور اچھائی بُرائی میں تمیز نہیں کرتا۔

وہم بھرا دِل آگ سے زیادہ پُرسوز ہے کہ اُس کو پکڑ نہیں سکتے۔ پہاڑ سے زیادہ بلند ہے جس پر کوئی چڑھ نہیں سکتا۔ ہیرے سے زیادہ سخت ہے جس کا توڑنا مشکل ہے۔ سمندر کی سطح آب پر چل سکتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر اُس کی تہہ کا پانی نکال سکتے ہیں لیکن دل کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

پریشان کرنے والے خطرے اور واہی تباہی خواہشیں سب دِل کی بیماری کے سبب ہیں۔ اِس بیماری کا علاج گرو کی صحبت میں ہے اُس کو حاصل کر۔

حرص

ترشنا یعنی حرص اندھیری رات کے منحوس اُلّوؤں کی طرح دِل میں ارمانوں کو جمع کرتی ہے۔ اور اِس طرح آخر کار اُس کو ویران کرتی ہے۔

دِل کے پاک اور سُریلے جذبات کو حرص اِس طرح برباد کر دیتی ہے جیسے چوہا رباب کے تار کُتر کر اُس کو بیکار کر دیتا ہے۔

جو حرص کی آگ میں جل کر مرا ہے اُسکو آبحیات میں ہزار بار بھی غسل دیں تو وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

جو شخص اپنی دانست میں دُنیا کے تمام کاروبار سے آزاد ہو کر بیٹھا ہو حرص پھانسی کو شکار کرنا چاہتی ہے۔ حرص آدمی کے لیے اندھیری رات ہے جس میں ہزار دن خطرے بھرے ہوئے ہیں۔ اور انسان کے دل میں اس کے سبب ہر وقت فکر و اندیشہ رہتا ہے حرص کھلی آنکھ کو بند کر دیتی ہے۔ حرص گھر گھر کی ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ حریص آدمی سے کوئی خوش نہیں ہوتا۔ جیسے بوڑھی عورت کے دیکھنے سے کوئی آنکھ خوش نہیں ہو سکتی۔

حریص آدمی اُس ناچنے والی کے مثل ہے جو اپنے ناچ کے سب بھاؤ اور کمالات ایک ہی وقت میں ادا کرنے چاہے۔ اور ایک بھی پورے طور پر ادا نہ کر سکے۔

حرص جسم کے ظاہری اعضا سے بھی کام لیتی ہے۔ اور باطنی اعضا سے بھی۔ اور اس کی حکمرانی میں تھوڑے ہی دن بعد یہ سب اعضا بیکار و معطل ہو جاتے ہیں۔

حرص شریف آدمیوں کو اس طرح اپنی طرف مائل کرتی ہے جیسے حسین عورت متقی و پاکباز مرد کو۔ اور سورج کی گرم شعاع نیلوفر کے نرم و نازک پھول کو۔

آدمی کیسا ہی عقیل اور پہاڑ کی طرح بھاری بھر کم ہو حرص کے سامنے سوکھی گھانس کا تنکا بن جاتا ہے۔

استقبال رسول

(از نظام المشائخ ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء)

السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ۔

السلام علیک یا شفیع المذنبین۔ السلام علیک یا رحمۃ للعالمین

غریبوں کا سلام لیجئے۔ گنہگاروں کا مجرا قبول فرمایئے۔ بے کس و لاچار اُمت کے خیر مقدم پر نظر توجہ ڈالیئے۔

آج بمصداق نظام المشائخ کے پلیٹ فارم پر ہم سب آپ کا استقبال اور خیر مقدم

کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرف آپ کی غریب اُمت کھڑی ہے دوسری جانب عیسائی۔ ہندو۔ آریہ ہیں جو تہنیت کے گلدستے پیش کرنے چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے حاکم کے سامنے استقبال کے وقت اپنی ضروریات ظاہر کیا کرتے ہیں گذشتہ کارناموں کو سُناتے ہیں۔ موجودہ حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر اظہار رائے کے طلبگار ہوتے ہیں۔ دادرسی و مراعات و انعامات کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ہندوستان کے پردیس میں اپنے دین و دنیا کے بادشاہ کا استقبال کرتے وقت رسم زمانہ کے موافق عرض حال کرنا ضروری سمجھتے ہیں ؁

سرکار والا تبار! جو زمین اس وقت ہم سب کے زیر قدم ہے۔ چھ سو برس تک ہمارے زیرنگین رہ چکی ہے۔ یہاں ہمارا تاج تھا۔ یہاں ہمارا تخت تھا۔ سکہ بھی ہمارا تھا۔ شان و عزت بھی ہماری تھی۔ تلوار کے بل پر آئے تھے۔ تلوار کے بل پر رہے تھے ؁

ہم نے اس ملک میں خدا کے بندوں پر محبت و انصاف سے حکومت کی حضور کے ارشاد کے موافق رعایا کی خبرگیری و حفاظت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا آج تک ہمارا عہد خوشی راحت اور فارغ البالی کا عہد سمجھا جاتا ہے ؁

جہاں پناہ یہ سُنکر کمال درجہ مسرور ہوں گے کہ یہ ملک علوم الٰہیہ کے قبول کرنے اور اُن میں جی لگا کر مصروف ہونے میں خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانہ میں توحید کا چرچا رہ چکا ہے۔ اس خطہ میں بھی خدا تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں سری رامچندر جی و سری کرشن جی و مہاتما بدھ کے ذریعہ کلام حق بھیجا تھا۔ جو تمادی ایام کے سبب اور نفس و شیطان کی شرارتوں کے باعث خلط ملط ہو گیا ؁

ظل سبحانی کی سمع اقدس میں یہ واقعہ پیش ہونا ضروری ہے کہ اس ملک کی آسمانی کتاب وید میں وحدت الٰہی کا یہ کلمہ ارشاد ہوا ہے "ایکو برہم دوتیہ ناستی" الجبر کا عربی مفہوم لا اِلٰہ اِلّا اللہ ہے۔ اسی وید کے ایک حصہ اتھروَن وید میں حضور عالی کی

نسبت اُسی طرح کی پیشین گوئیاں ہیں جیسی زبور۔ توراۃ۔ اور انجیل میں پائی جاتی ہیں +

جب ہم غلامانِ رسالت اس دیار میں وارد ہوئے اور حضور عالی کا پیام یہاں کے باشندوں کو سُنایا تو وہ جوق جوق آئے اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ چنانچہ اسوقت کروڑوں آدمی ایمان لانے والوں میں موجود ہیں +

اَب ہم موجودہ دور کا فسانہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ نہایت شرم کے ساتھ۔ نہایت ندامت و پشیمانی کے ساتھ یہ الفاظ ہمارے مُنہ سے نکلتے ہیں کہ ہمارا چھ صدی کا تاج لٹ گیا۔ تخت اُلٹ گیا۔ ہمارے محل اور قلعے غیروں کے پاس چلے گئے۔ اَب ہم رات کی روٹی کو محتاج ہیں۔ ہماری رعیت ہم پر ہنستی ہے۔ ٹھوکریں مارتی ہے۔ ریشمین قباؤں کے بدلے ہم کو میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑے بھی میسر نہیں آتے +

ہماری حرارت برباد ہوگئی۔ ہماری غیرت تباہ ہوگئی۔ اَب رسوائی و ذلت کی کوئی حد باقی نہیں رہی +

آج جہاں پناہ کے حضور میں ایک شکستہ حال اُمت کھڑی ہے۔ جو کل تاج دار تھی باوقار تھی۔ آج وہ لوگ آپ کے سامنے پیش ہوئے ہیں جو کشمکش کے میدان میں بے یار و مددگار ہیں۔ جن کا خدا کی ذات کے سوا کوئی سہارا نہیں +

قدرت نے انگریزی قوم کو ہمارا نگراں بنایا ہے۔ جو چاہتی ہے کہ ہم زبونی و خرابی کے غار سے ہمت کر کے باہر نکلیں۔ مگر زخموں کی تکلیف اور فاقوں کی ناتوانی کے سبب ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اب گردش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اَب ہم پھر اقبال و دولت کے سایہ میں پہنچنے والے ہیں۔ کیونکہ آپ کا دیدار۔ آپ کے اوصاف و اطوار کا دیدار۔ ہم سب کی ظاہری و باطنی مصیبتوں کو دور کرنے والا ہوگا۔ آمین +

دربارِ رسولؐ

(از نظام المشائخ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء)

(گستاخ نامہ یعنی سائنس ڈاکو کا خط دربارِ رسالت میں)

از کیمپ یورپ۔ بارگاہ شاہ ہفت اقلیم حضور سائنس بہادر۔ بخدمت جناب معلی القاب

محمدؐ بن عبداللہ بانی مذہب اسلام

جناب من! مجھ کو پیشگاہ سرکار دولتمدار حضور بادشاہ ہفت اقلیم سائنس زمانہ گیر دام اقبالہٗ کی جانب سے ہدایت ہوئی ہے کہ آپ کو اُن کے دوستانہ خیالات سے آگاہ کروں۔ چونکہ ہمارے بادشاہ جم جاہ آپ کے خیالات میں بہت کچھ صلاحیت اور اپنے خیالات سے نزدیکی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس لیے اُن کی خواہش ہے کہ دوستانہ طریق سے چند امور آپ کے گوش گزار کریں۔

یہ اطلاع غالباً آپ کو مل گئی ہوگی کہ یورپ میں عیسائی مذہب کے مسمار کرنے میں اور اُسکو اپنا محکوم بنانے میں ہمارے شاہ کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ سُنکر بہت خوش ہوں گے کہ اس زمانہ میں عیسائی مذہب کا جو کچھ غل مچ رہا ہے وہ محض لفافہ ہی لفافہ ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ شاہ سائنس نے تمام عیسائی قوموں کے دلوں پر تسلط پالیا ہے اور اب یورپ میں اُنکا کوئی سرکش باقی نہیں ہے جو عیسوی مذہب کو بچانے یا اُس کا اثر برقرار رکھنے کی شاہ سائنس کے مقابلے میں طاقت رکھتا ہو۔ بدھ مذہب کا جاپان میں خاتمہ کر دیا گیا۔ چین میں کچھ لوگ ہیں اُن پر مہم بھیجی گئی ہے۔ یقین ہے کہ وہ بھی عنقریب مفتوح ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں پچاس برس سے معرکہ کارزار گرم ہے اور شاہ سائنس کو اکثر مقامات پر کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ شاہ سائنس کی خوش اقبالی سے ہندو مذہب کا

ایک بڑا گروہ دیانند راجہ کی سرکردگی میں ہندو مذہب پر چھاپے مار رہا ہے اور ہمارے
بادشاہ کو اس کی پرزور اور پُر اثر یورش سے اُمید ہے کہ ہندو مذہب پر بہت جلد ان کا
قبضہ ہو جائے گا۔ زرتشتی دین کی نسبت تو آپ کو اچھی طرح واقفیت ہوگی کہ وہ
ہمارے شاہ کے قدموں میں آن گرا۔ اور اب اُس نے خانہ زاد خاص کا خطاب حاصل
کیا ہے۔ مگر حضور ظل زمانی بہت افسوس کرتے ہیں کہ آپ کا مذہب اسلام جگہ جگہ ان کی
فتوحات میں سد راہ ہوتا ہے اگرچہ حضور ظل زمانی آپ کے سپہ سالار جنرل اسلام کی قابلیتوں
کے قایل اور بہت مداح ہیں لیکن وہ اسلام کی موجودہ روش کو پسند نہیں کرتے۔ اور چاہتے
ہیں کہ آپ اپنے سپہ سالار کی حالت میں تبدیلی کا حکم دیں۔ شاہ سائنس کی حکمرانی نسل انسانی
کے لیے راحت و شادمانی کا لازوال خزانہ ہے۔ شاہ سائنس نے اپنی سلطنت کے
ایسے طریقے مقرر فرمائے ہیں جن سے ہر مذاق اور ہر خیال کا انسان مساوی درجہ میں خوشی
اور آسایش حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب
انسان کے لیے اور اُس کی زندگی کے لیے بڑی خوفناک اور ضرر رساں چیز ہے۔ مذہب کے
باعث ہر ملک ہر قوم یہاں تک کہ ہر گھر میں فساد اور خونریزیاں برپا رہتی ہیں۔ مذہب انسانی
فطرت کے جذبات کو قدرتی طور پر اُبھرنے نہیں دیتا اور دبا کر برباد کر ڈالتا ہے۔ مذہب
تمیز داری اور شایستگی کا دشمن ہے مذہب بیدار مغزی اور معقولیت سے کوسوں دور
ہے۔ مذہب نہیں چاہتا کہ انسان اپنے اختیارات اور اپنی طاقتیں کام میں لائے۔ مذہب
آزادی و مساوات کا مخالف ہے یہی وہ چیز ہے جس نے دُنیا پر تکلیفات کا جال پھیلا رکھا ہے
آپ مُلاحظہ فرمائیے کہ یورپ کے اس زمانہ میں جب کہ وہاں مذہب کا دور دورہ تھا اہل یورپ
کیسی ذلیل اور کمینی زندگی بسر کرتے تھے۔ پیشوایان مذہب اُنکو ٹھگا کرتے تھے۔ آگ میں جلاتے
تھے۔ اُن کی عورتوں کی عزت و ناموس کو خراب کرتے تھے اور بیچارے پیروان دین مسیح
اُف نہ کر سکتے تھے۔ مگر آج جبکہ شاہ سائنس کا دور حکومت ہے۔ ہر شخص آزاد۔ ہر شخص با اختیار

خوش وخرم اور عزت دار بنا ہوا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنے سے ادنیٰ یا اعلیٰ کی آزادی یا اختیارات میں دخل دے سکے۔ اہل یورپ ہمارے شاہ کی تاجداری پر دل سے فریفتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب دنیا والے سائنس تاج کے زیر سایہ آجائیں۔ ایسی حالت میں آپ خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ ہمارے شاہ کا تلوار کھینچنا اور مذہبی حکومت کو زیر و زبر کرنا کس قدر ضروری اور کیسا اچھا کام ہے۔ لہٰذا آپ فوراً اپنے اُصول جہانداری کو بدل ڈالیے اور سائنس اور گورنمنٹ سائنس کے قوانین اپنے ہاں جاری کر دیجیے۔ تاکہ ہماری گورنمنٹ کے سامنے سے دشواریاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔ اور زمین پر امن و امان کا آفتاب چمکنے لگے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ شاہ زمانہ گیر اُن تدابیر کو عمل میں لائیں گے جن سے آپ کی گورنمنٹ کو سخت نقصان اُٹھانا اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں بے باکانہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر اس آخری اطلاع پر جلدی توجہ نہ کی گئی تو افواج قاہرہ کو حرکت میں لایا جائے اور اسلامی قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی ہماری گورنمنٹ کے اسلحہ آتش فشاں اور فنون حرب کی ترقیوں سے غالباً آپ بےخبر نہ ہوں گے اور صلح کو جنگ سے غنیمت تصور فرمائیں گے۔

راقم

میں ہوں آپ کا ادنےٰ خدمتگار

دہریہ۔ وزیر محکمہ خارجہ گورنمنٹ سائنس زمانہ گیر

مشورہ

سپہ سالار اسلام فرش خاک پر تلوار ٹیکے کھڑا تھا اور سامنے تمام عہدہ داران فوج دست بستہ ایستادہ تھے ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سپہ سالار کی تقریر صاف سنائی نہ دیتی تھی لیکن آخر میں سپہ سالار نے ایسے پُرجوش جملے کہے کہ سب نے اُن کو اچھی طرح سُنا۔

یورپ کے مشہور قزاق سائنس کا ایک گستاخانہ مراسلہ دربار رسالت پناہی میں آیا ہے۔ جس میں اُس نے لڑائی کی دھمکی دیکر ہماری سلطنت کے قوانین بدلوانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ بولو۔ اب تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟

جنرل شریعت دار۔ پہلے یہ فرمایئے کہ دربار قدسی کی جانب سے اس گستاخ کو کیا جواب دیا گیا +

سپہ سالار۔ وہ جواب تم عنقریب سن لوگے۔ میں تمہارا انشاء معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر حالات کی صورت دگرگوں ہو تو تم کن طریقوں سے مدافعت کروگے اور تمہارے پاس کیا کیا ذرایع مقابلے کے ہیں +

جنرل شریعت دار۔ جس قسم کی ضرورت ہو۔ ہم ہر حیثیت سے تیار ہیں۔ اگر علمی مقابلہ ہو تو حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ الغرض معقول منقول جس قرینے کا معرکہ ہوگا۔ ہم مقابلہ کریں گے۔ جنگ کی نوبت آئے تو اس میں بھی ہم کو سب سے آگے ہاتھ مارتے پایئے گا +

جنرل طریقت دار۔ جناب عالی تردد نہ فرمائیں۔ میری کمان میں وہ بہادر ہیں جن کے نعرۂ حق سے آسمان زمین لرزتے ہیں۔ سائنس کی کیا ہستی ہے جو ہمارے شہنشاہ کے قوانین کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے۔ یہ دیکھئے حضور کے روبرو چشتی۔ قادری نقشبندی۔ سہروردی۔ رفاعی وغیرہ نامور افسر کھڑے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں بار نفس امارہ کے لشکروں کو زیر وزبر کیا ہے۔ حرص وہوا کی کائنات ان کے نام سے تھراتی ہے خود بینی وناحق شناسی کے سیکڑوں تاج وتخت ان کے نعرۂ ہو سے خاک میں مل گئے۔ سائنس اپنے تمام ابلیسی لشکروں کو لیکر آجائے اور دیکھے کہ شہسواران طریقت کس شان سے میدان کارزار میں نکلتے ہیں اور کیونکر اس کے دھوئیں اڑاتے ہیں +

جنرل طریقت دار کی تقریر سُنکر سپہ سالار اسلام کا چہرہ بشاش ہوگیا۔ اور اُس نے

تبسم خیز انداز سے کہا۔ آفریں بہادرو! شاباش دلیرو!! تمہاری ہمت مردانہ سے مجھے بھی اُمید تھی۔ مگر جس دشمن کا مقابلہ درپیش ہے وہاں یہ ہتھیار کام نہیں دیں گے انہی جرأت سے کام نہیں چلتا۔ تم کو چاہیے کہ اپنے حریف سائنس کے طریق حرب سیکھو۔ اور پھر مقابلہ کے لیے مورچہ باندھو۔ آؤ پہلے اس کی کوشش کریں کہ ہمارا لشکر سائنس کے قواعد سے خبردار ہو جائے۔ اس کے بعد دو ہاتھ کرنے کو آگے بڑھے۔

تخت رسالت کا فرمان

تمام اُمت محمدی کے صوبہ داروں اور ادنیٰ و اعلیٰ افراد ملت کو معلوم ہو کہ با دولت و اقبال تمدن جدید کی دُنیا میں کلمۃ اللہ کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ دربار رسالت کے فرمان واجب الاذعان کی تعمیل کے لیے دل و جان سے کمربستہ ہو جاؤ۔

وقت آ گیا کہ یورپ، امریکہ، چین، جاپان اور اُن تمام ممالک میں جہاں سائنس اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہو رہی ہے اسلامی صداقت کی روحانیت پھیلائی جائے۔ لہٰذا تم سب کیل کانٹے سے درست ہو جاؤ۔ پہلے اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اور اپنے وجود کو اسلامیت کا مجسم نمونہ بنا لو۔ اور پھر نئے علوم سیکھنے شروع کرو تاکہ تخت کی منشاء کے موافق مذکورہ زمین پر امر حق رائج کر سکو۔

مُسلم یونیورسٹی کے نام سے جو تحریک ہندوستان میں اُٹھی ہے وہ تاج ملت کے ارادے کے موافق ہے۔ اسکو سرسبز بنانے میں اتفاق و یکجہتی سے کوشش کرو یہ پہلا دروازہ ہے جو تمہارے لیے قدرت خداوندی نے کھولا ہے۔ اس کے اندر بے دھڑک گھس جاؤ۔

قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمّٓ کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا۔ اس میں اشارہ ہے کہ آل محمد اس کتاب دعلم اکو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لیے کھڑی ہوگی۔ چنانچہ

پہلے سید احمد خاں نے جو مجددی آل سے تھا یہ کام شروع کیا۔ اور اب آغا خان جو
زمرۂ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنی چاہتا ہے۔ تم سب کو مل کر اس کی اعانت
کرنی چاہیئے تاکہ ہدایت کا چشمہ ان قوموں کو سیراب کرے۔ جو روحانیت کی پیاسی ہیں۔
ابھی آلسٹر کے ہیم میں اُس نائب رسول مہدی کے ظہور کی خبر ہے۔ یعنی وہ سنہ ۱۳۲۸ھ
میں ظاہر ہوگا۔ اور تمہارے منتشر اور پراگندہ کاموں کو سمیٹ کر یکجا کر دیگا۔ اور سارے
جہان کو اسلام کے حقانی دائرہ میں لے آئیگا ۔

تاجناب رسالت مآب کے تخت کی جانب سے اس غلط فہمی کی اصلاح ضروری ہے
جو یورپ کی قوموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ لوگ ہمارے نائب مہدی کے نام سے
طرح طرح کے وہم کرتے ہیں۔ اُن کو اطمینان رکھنا چاہیئے۔ ہمارا مہدی ان کی مملکت
میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ امن و امان کو برہم نہیں کرے گا۔ اُس کا کام صرف یہ ہوگا کہ باطنی
اور روحانی تسکین کے ذرائع دُنیا میں شائع کرے۔ اور انسانوں کو ظاہری دولتمندی کے
ساتھ باطنی تسلی کی دولت بھی بانٹے۔ اور لکھا جا چکا ہے کہ جس وقت وہ دُنیا میں آئیگا۔
سب قومیں اُس کے طریق روحانیت کو قبول کر لیں گی۔ اور اُس کی ہدایت پر عمل
شروع کر دیں گی۔ بس اسی کا نام مہدی کی حکومت ہے۔ کہ اسلامی روحانیت کل جہان
پر مسلط ہو جائے۔ یہ نہیں کہ لوگوں سے تاج و تخت چھینے۔ جس طرح جرمن و انگریز روس
و فرانس وغیرہ کی سلطنتیں اب قایم ہیں۔ مہدی کے وقت میں بھی برقرار رہیں گی۔ فرق
صرف اتنا ہوگا کہ یہ سب اُن اُصول پر اپنی زندگی شروع کر دیں گی جو مہدی مقرر کرے
اس میں جھگڑا فساد اور خونریزی مطلق نہ ہوگی۔ لہٰذا سب لوگوں کو بے فکر رہنا چاہیئے اور
خوشی و خرمی سے ہمارے نائب کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھنا چاہیئے ۔

دُنیا میں آج اس اعلان کی خبر نے جو سائنس کی جانب سے دربار رسالت میں پہنچا ہے
ہلچل ڈال دی ہے۔ مگر تخت ختم سب کو تسلی دیتا ہے کہ معاملات کی صورت ایسی پیچیدہ

اور نازک نہیں ہے۔ سائنس کے اعلان کا جواب دیدیا گیا ہے۔ ہمارا سپہ سالار اسلام میاں سے تلوار نکالے بغیر سب خرخشوں کو صاف کر دے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں اگرچہ سائنس کے وزیر خارجہ دہریہ کا لب و لہجہ سخت تھا۔ مگر ہم جناب سختی کا جواب سختی سے نہیں دینا چاہتے ہماری سرکار کا ہمیشہ سے نرمی و ملائمت کا شیوہ رہا ہے۔ اور وہی اب بھی ملحوظ ہے۔

مرحمت نامہ

(یعنی سائنس کے گستاخ نامہ کا جواب بارگاہ رسالت سے)

(از مملکت حجاز خیمۂ رسالت۔ بنام سائنس مدعی زمانہ گیری)

تمہارا خط جس میں تخت رسالت پناہی کو اسلام کی موجودہ روش تبدیل کرنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے پہنچا۔ بارگاہ قدوسی میں عرض کر دیا گیا۔

حضور انور نے کمال الطاف و نوازش کے بشرہ سے اسکو سماعت فرمایا۔ تمہارے وزیر نے جس طریقہ سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن دارین پناہ بوجہ خلق عظیم کے اس سے درگذر فرماتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ غرور و تکبر ہر کامیابی کے لیے سبب ناکامی ہے۔ اس سے احتیاط کرنی چاہیئے۔

ارشاد ہوا کہ مذہب کی مضرتوں کو تم نے بالکل غلط سمجھا۔ یورپ کے مذہبی زمانہ میں جس قدر خرابیاں تھیں وہ مذہب کے غلط استعمال کے سبب تھیں۔ مذہب کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ اور اب جن راحتوں کو پیش کیا جاتا ہے وہ بھی موہوم اور بے اصل ہیں جن کو پائداری نصیب نہیں۔ ذرا لوگوں کے دل سے پوچھو کہ باوجود اس آزادی و دولتمندی کے اُن کو اندرونی اطمینان اور قرار و سکون میسر ہے یا نہیں۔ ہر شخص یہی کہیگا کہ نہیں پھر اس نمایشی راحت سے کیا فائدہ۔ راحت وہ ہے جس کی جڑ آدمی کے دل میں جاگزیں ہو

نائب بارگاہ ایزدی تم کو مطلع فرماتے ہیں کہ اُن کی اُمت عنقریب تمہاری اُن مشکلات کو رفع کر دے گی۔ جو درحقیقت سچی مشکلیں ہیں۔ نہ وہ جن کو تم مشکلات تصور کر رہے ہو۔

اس سے زیادہ کچھ فرمانا نہیں چاہتے۔ گو اُن کو قلم کے جواب کے علاوہ تیغ و سناں کی جواب دہی کی بھی ہر طرح قدرت حاصل ہے۔

اُمید ہے کہ تم ہماری رحیم و کریم سرکار کی مہربانی اور نوازش سے فائدہ اُٹھاؤ گے اور اچھا زمانہ حاصل کرنے کی کوشش کرو گے۔

راقم

عبید۔ حلقہ بگوش تخت رسالت

محکمہ تحریرات بقلم حسن نظامی

فقیروں کی عید

(از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۰ء)

قوموں کی زندگی اور ترقی جن ذرائع سے معلوم ہوتی ہے اُن میں قومی تہواروں کی شان و شوکت کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسلام نے ظاہر ہو کر عرب اور اکثر حصہ عالم کی مراسم قبیح و ناز یبا رواجوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اور مٹا دیا مگر جو رسمیں بشریت کی فطرت میں داخل تھیں اُن کو باوجود اپنے بھاری بھرکم طرز عمل اور تقوے و متانت کے جاری رکھا۔ بلکہ اُن میں اور چار چاند لگائے۔

چنانچہ وہ کھیل جو جنگجو قوموں میں بطور مشق جاری تھے اسلام نے اُن کو منع نہیں کیا خود بانی اسلام علیہ التحیۃ والسلام بارہا ایسے کھیلوں میں شریک ہوئے ہیں۔ حالانکہ کھیل تماشہ اور لغو مشغلوں سے آپ نے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس سے روکتے رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیل جن سے قوم میں کوئی کارآمد بات پیدا ہو اسلام نے بند نہیں کیے۔ اور اُن کو اپنی متانت و بُردباری کے خلاف نہیں سمجھا مثلاً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیزہ بازی و تیر اندازی کے کھیلوں کا خود بھی تماشہ دیکھتے تھے اور اپنے عیال کو بھی دکھاتے تھے۔ معتبر روایتوں سے یہاں تک ثابت ہی کہ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ دوڑ کے کھیل میں شریک ہوتے۔ اور خود بنفس نفیس دوڑتے اور فرماتے دیکھیں کون آگے نکلے +

بہادری اور مردانگی کے کھیلوں میں خود ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں جو کھیل دلیری و شجاعت کا جذبہ پیدا کرنے والے ہوں۔ اُن میں ہر ثقہ اور متین مسلمان شامل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی شخص اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو ذات سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ بزرگ تھی وہ بھی ایک مفید حد تک ان کھیلوں کو جائز رکھتی تھی +

اسی پیرایہ ایام خوشی کو قیاس کرنا چاہیے۔ کہ سال بھر میں ایک دن ایسا ہونا جس میں قوم کا ہر فرد اپنی حیثیت اور طبیعت کے موافق خوش ہو۔ ضروریات سے تھا اس واسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الضحیٰ دو دن مقرر فرمائے۔ یہ دونوں دن اسلام کے دو عظیم الشان فرائض کی تکمیل کی خوشی میں مقرر ہوئے۔ عید الفطر مہینے بھر کے روزے ادا کرنے کے بعد۔ اور عید الضحیٰ حج کعبہ کے بعد۔ اس طریقے سے مسلمانوں کی خوشی کو اپنے معبود کی عبادت کے ساتھ جیسی کچھ وابستگی ہوگئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہر شخص خود غور کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے +

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر صحابہؓ دلی کیجہتی اور شادمانی سے ان تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی تہوار اُن کی شان کے موافق متانت اور بھاری بھرکم پن کے خلاف و منافی نہیں ہیں۔ درحقیقت

اور مشائخ بھی بشر ہیں اور انسانوں کے دل سینے میں رکھتے ہیں۔ اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان کی شان کچھ اعلیٰ و برگزیدہ نہیں ہے جب اپنے دینی و قومی تہوار کی خوشی کے اظہار میں شریک ہونا اپنے وقار اور منصب کے خلاف تصور کریں۔ خوشی اور رنج کا حس مٹ جانا دوسری چیز ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہو کہ انسان اپنے حواس آدمیت سے معطل ہو جائے۔ بلکہ وہ ایک مقام رضا و تسلیم ہے جس میں درویش رضائے الٰہی کی طلب میں ایسا بے خبر ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا کی تکلیفات اور خوشیاں اس کی طلب میں مخل نہیں ہونے پاتیں۔ اور وہ ایک ہی دھن میں مستغرق رہتا ہے۔

پس عید جیسے قومی و دینی تہوار میں فقراء و مشائخ کا یا ان کے اخبار و رسالہ کا شریک ہونا اور اس کی خوشی میں اپنے دیگر ہم مذہب بھائیوں کی شکل برابر حصہ لینا نامناسب و ناروا نہیں ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔

عید میلاد الرسول

(از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء)

ایک سو ایک ضرب اِلَّا اللّٰہ کی سلامی دو۔ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگاں کی سناں اور ابرو کی تیغ سنبھالے! ادب سے پتلیاں جھکائے کھڑی رہیں۔ زبان درود کا بینڈ بجائے۔ بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی بینڈ میں یک جان ہو کر سُر ملائیں۔ یہاں تک کہ ہر بُن مو سے نغمہ صلوا علیٰ محمد نکلنے لگے۔ روزہ کی عید۔ حج کی عید۔ دونوں دست بستہ آئیں اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں۔

دودھ۔ سویوں۔ اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کچھ سروکار نہیں۔ جوش کی روٹی کھاؤ۔ اور خوشی منائو۔

آج عید ولادت ہے۔ آج وہ پیدا ہوئے جن پر کائنات کی پیدائش کا حصر ہے ✦

چاند کو رخ انور سے شرمانے والے ظلمت کو گیسوؤں میں اُلجھانے والے شاہ گدا نواز۔ رسول العرب والعجم۔ جن کی ولادت سے تاریکی باطل دور ہو گئی۔ حق کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ خود سر بے سر ہوئے۔ بے تاج تاجدر بنے جنھوں نے ہونٹوں کو ہلا کر ساری زمین زلزلے میں ڈال دی ✦

غریبوں، مظلوموں کے غمگسار۔ سرکشوں، ظالموں کے زیر کرنے والے۔ وہی جن کا نام لینے سے ہمارے خون میں حرارت اور دل میں جوش پیدا ہوتا ہے ✦

اپنے برگزیدہ و پاکیزہ وجود کے ظاہر ہونے کا وقت ہے۔ کہ آسمان، زمین، شجر حجر کیف میں ہیں پھر تم کیوں اے مسلمانوں یوم ولادت کو قومی تہوار نہیں بناتے ✦

یہ وہ خوشی ہے جس میں ہر فرقہ اور عقیدے کے مسلمانوں کو یکساں حصہ لینا چاہیے یہاں شیعہ سنی، مقلد، غیر مقلد، صوفی، وہابی کی قید نہیں سب یک دلی و اتفاق سے میلاد کا تہوار مقرر کریں۔ اور دنیا کو دکھائیں کہ جس طرح رسول خدا کو اپنی اُمت سے محبت تھی۔ اسی طرح اُمت بھی اُن کے نام پر قربان ہے۔ اور اُن کی یادگار میں دل و جان سے حصہ لینا چاہتی ہے۔ دوسری قومیں فرضی اور خیالی تہوار مناتی ہیں تاکہ قوم میں زندگی کے جذبات پیدا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک اصلی اور شاندار موقع موجود ہے اس سے کیوں نہیں فائدہ اُٹھاتے ✦

اسلامی ممالک میں جہاں ہمارے خوش قسمت بھائی تخت و تاج کے مالک ہیں میلاد شریف کے موقع پر بڑے بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے ✦

ہم بدنصیب ہی بے تاج سہی۔ ہیں تو حلقہ بگوش شان رسول۔ پھر کیوں اپنے تاجدار بھائیوں سے حب رسول میں پیچھے رہیں۔ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے

کہ از روئے فقہ میلاد جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہے کہ میلاد کے جلسوں کو کس طریقہ پہ بارونق اور شاندار بنایا جائے۔

یاد رکھو کہ سب کی دینی و دُنیاوی زندگی اپنے رسولؐ کی اُلفت یاد میں مخفی ہے اگر ہم دُنیا میں اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو آخرت میں سُرخرو جانا ہے تو آقائے نامدار محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد پاک کی عیدین سے زیادہ خوشی منایا کریں۔ بلکہ میلاد الرسول کی ایک علیحدہ عید مقرر کریں جس میں دھوم دھام سے میلے ہوں۔ جلسے ہوں اور ہر عقیدے کا مسلمان اپنے کلمہ کے شریک بھائیوں کے ساتھ عیدالرسولؐ منائے۔ اور کہے "آج اُس کے نام کی عید ہے جس نے دُنیا کے پردے کو شرک وکفر کے غم والم سے پاک و صاف کر کے وحدت کے سرور سے آراستہ کر دیا۔

وصلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین۔

ایکو برہم دُوتیو ناستی

(از صوفی۔ جولائی ۱۹۱۱ء)

یہ فقرہ جس کے معنی وحدہٗ لاشریک یا لا الٰہ الّا اللہ ہیں۔ ہندو مذہب کے اُصول میں داخل ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنا توحید پر ہے۔ مگر انسان اپنے خیالات کی سیر کرکے اس متفق علیہ اُصول کو خراب کر ڈالتا ہے اور وقتاً فوقتاً ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کسی انسان کو بشری خیالات کی اصلاح کے لیے مقرر فرمائے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم میں ضرورت کے وقت مصلح ظاہر ہونے کا ثبوت تواریخ اور مذہبی کتب میں موجود ہے۔ قرآن شریف میں صاف طور پر ارشاد ہوا ہے

کہ ہر ملک و ملت کے واسطے خدا ایک ہادی مقرر کرتا ہے۔ بعض رسولوں کے نام اور حالات کی تصریح فرما دی گئی ہے بعض کی نسبت اشارے کنائے کر دیے ہیں اور پھر ایک کلیہ قاعدہ قایم کرکے حکم دیدیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری اور لازم ہے۔ مسلمان بھی زبان سے نہیں بلکہ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ جن رسولوں کی اطلاع اُن کو پہونچی اور جن کی نہیں پہونچی وہ سب برحق ہیں ٭

اتنا معلوم کرنے کے بعد سوچنا چاہیے کہ ملک ہندوستان جو دنیا میں ایک بڑا مُلک کہلاتا ہے اس بات کا مستحق ہے یا نہیں کہ یہاں بھی خدا نے اپنے دستور کے موافق پیغامبر بھیجے۔ اور اُن کو ہدایت کرنیکے واسطے کتابیں دیں۔ اگرچہ قرآن شریف میں اس مُلک کے رسومات کی بابت کوئی تصریح نہیں پائی جاتی۔ مگر خدا کے اس کلیہ کے موافق کہ ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان بھی اُن متبرک آدمیوں سے محروم نہیں ہے جن کو خدائی اصطلاح میں نبی و رسول کہتے ہیں ٭

ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رامچندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھنے۔ اُن کی طرز زندگی پر غور کرنے اور اُنکی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم و عیسیٰ و موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں۔ اور وہی تعلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے ٭

اسلامی عقائد میں یہ مسلم امر ہے کہ انسان کے لیے فطرتی مذہب ہمیشہ سے ایک ہے۔ جس قدر پیغمبر اور رسول بھیجے گئے وہ سب ایک ہی مذہب اور ایک ہی اصول کی تعلیم کرتے تھے۔ نئے اُصول کی شریعت کسی پیغمبر نے قایم نہیں کی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر اور سب سے اچھے رسولؐ نے بھی جن کی پیروی کا فخر ہم کو حاصل ہے وہی بتایا جو اگلے نبی بتلاتے آئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہو کہ تعلیم میں ہر مُلک و قوم کی سمجھ اور طرز معاشرت کا لحاظ

دکھایا گیا ہے اور ایسے طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ ہر درجہ کی عقل میں آسکے آپ کو معلوم ہوگا کہ توراۃ و انجیل کا طریقہ تعلیم تشبیہ اور استعارات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر زمانے کے آدمی عقلی و ذہنی تغیر کے سبب اس کے فہم سے قاصر ہوگئے۔ اور طرح طرح کی غلطیوں اور توہمات میں مبتلا ہونے لگے۔ وید مقدس اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں اور بزرگوں کے بیانات میں بھی اس قدر مشکل استعارات پائے جاتے ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کرنا دشوار ہے اگرچہ مثالیں ایسی دی ہیں کہ معمولی عقل والا بھی ذرا سی دیر میں سمجھ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس ملک کے بعض لوگوں نے اصلی بات کو معلوم کرنے میں توجہ نہیں کی اور ظاہری الفاظ پر عمل کر کے اپنے پاکیزہ اصول کو خراب کر دیا۔

میں ایک مثال دنیا کی پیدائش کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں خدا فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا کن فیکون ہندو مذہب میں اول برہما پیدا ہوا۔ اس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجیے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں متحد البیان ہیں۔ قرآن میں خدا نے صفت خالقیت کو کن کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور وید میں برہما کے لفظ سے۔ برہما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جب تک یہ صفت ظاہر نہیں ہوئی دنیا ناپید تھی۔ جس طرح کن کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور رہا۔ اسی طرح برہما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا۔ یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے۔

مورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک جسم میں سینکڑوں ہاتھ اور متعدد سر ہیں اور ہر ہاتھ میں مختلف چیزیں ہیں۔ کسی میں تلوار ہے۔ کسی میں پھول ہے۔ کسی میں اناج کا خوشہ ہے۔ اور ہندو ان مورتوں کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اس وقت آپ کو نفرت آمیز ہنسی آئے گی کہ یہ کیسی مضحکہ انگیز صورت ہے اور یہ کیسے احمق ہیں کہ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔

مگر حضرات ہندوستانی رہبروں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھانے کے لیے

صفات الٰہی کی حقیقت صاف طور پر ذہن نشین کرنے کے واسطے یہ مورتیں بنائی تھیں۔ تاکہ کم سمجھ لوگ آسانی سے سمجھ جائیں کہ خدا میں قہر کی شان بھی ہے جس کا نمونہ تلوار ہے اور رحم بھی جس کا نشان پھول یا اس قسم کی کوئی اور چیز ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق ہے۔ اس لیے اناج کا خوشہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت ہی بے عقل ہے اور مثالوں کو ذریعہ کے بجائے نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ ان مثالی مورتوں کے سبب بت پرستی شروع ہو گئی۔ اور ہزاروں غلط فہمیاں واقع ہو گئیں یہ بات ہندوستان پر مخصوص نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی ملک ایسے ہیں۔ جہاں صرف مثالی خرابی سے بت پرستی کا رواج ہوا۔ روم۔ یونان و مصر میں اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں +

جب تمام دنیا میں عالمگیر غلط فہمیاں واقع ہو گئیں تو خدا تعالیٰ نے ایک ایسا آسان صاف اور سیدھا طریقہ تعلیم سکھلا کر ہمارے حضرت صلعم کو بھیجا۔ جو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے کافی ہو۔ اور تمام مذاہب عالم میں جس قدر خرابیاں بشری خیالات و نفسانی جذبات کے سبب پڑ گئی تھیں وہ دور ہو جائیں۔ میں نہیں کہتا کہ میرا دعویٰ خواہ مخواہ تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ تجربہ اور تحقیق سے غور کرنا چاہیے کہ اسلام نے قدیمی اصول جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ تمام دنیا کے مذہبوں کی خرابیاں آسانی سے رفع کر دے تجربہ مشاہدہ کرا دے گا کہ بے شک اسلام کا طریقہ تعلیم ایسا صاف سیدھا اور آسان ہے کہ قدیمی اصول مذہب عمدگی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتے ہیں +

اب میں مجمل طور پر ہندوستان کے دو نامور بزرگوں سری رام چندر جی اور سری کرشن جی کے حالات پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ان لوگوں کی زندگی اور تعلیم ہمارے مسلمہ رسولوں کے کس قدر مشابہ تھی۔ میں رام کرشن جی کے بعض اقوال کو اپنے حضور صلعم کے ارشاد اور قرآن شریف کے بیان سے مطابق کر کے دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ واقعی ہندوستان کے رسول تھے اور ہمارے رسول گو سب کے بعد بھیجے گئے مگر وہی بیان کیا جو پہلے بیان ہو چکا

تھا۔ کوئی نیا دین لیکر نہیں آئے تھے لہٰذا تمام دُنیا خاصکر ہندوستان کو لازم ہے کہ پُرانی تعلیم کو نئے طریقے سے سیکھے جو سب سے زیادہ آسان اور صاف ہے اور جس میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہندوستانی رسول فرما گئے تھے ؎

رام جی اودھ کے راجہ دسرتھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ہندوستان میں رام لیلا کا مشہور میلا انہیں کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔ ابھی سولہ برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اپنے خاندانی پیشوا بشست جی کے ہمراہ سیاحت کو نکلے اور تمام مشہور اور متبرک مقامات اور اہل اللہ بزرگوں کی زیارتیں کیں۔ قدرتی نظارے دیکھے۔ دُنیا کے نشیب و فراز ملاحظہ کیے۔ جب واپس آئے تو عجیب حال ہو گیا۔ ہر وقت سوچ اور فکر میں مستغرق رہتے نہ کھاتے نہ پیتے۔ اور دُنیا کے تفریحی مشغلوں سے نفرت ہو گئی۔ اکثر خاموش رہتے۔ اور بولتے تو فرماتے یہ دُنیا کیسی بُری دُنیا ہے۔ بالکل ہیچ و ناپائدار۔ اسی اثنا میں ایک ایسا موقع آیا کہ اُس زمانہ کے مشہور بزرگ بسوامتر جی راجہ دسرتھ کے پاس آئے اور رام جی کو کسی سرکش و بدکار کی ہلاکت کے لیے مانگا۔ راجہ نے ان کی کمسنی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر بسوامتر جی کے اصرار سے رام جی دربار میں بُلائے گئے۔ اور ایک ایسی عالمانہ و عارفانہ تقریر کی کہ راجہ اور تمام درباری خاصکر بشسٹ اور بسوامتر جیسے عارف لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کم سن بچہ کیسی باتیں کرتا ہے ؎

رام جی نے اپنی تقریر میں انسانی ہستی کے تمام مدارج اور دُنیا کے تغیرات کی نسبت بشسٹ جی اور بسوامتر جی سے سوالات کیے۔ مگر ایسے پیرایہ میں جیسے کوئی شخص تجاہل عارفانہ کرتا ہے خود ہی ایک امر کی نسبت شک و شبہ بیان کرتے اور خود ہی ایک لطیف کنایہ سے اسکا جواب دیتے بسوامتر اور بشسٹ نے رام جی کے سوالات کا جواب دیا۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے تو

صاحب عرفان سائل کے سوالات

کی شان کے موافق ان لوگوں کے جواب نہ تھے۔ یہ رام جی کا مختصر حال ہے۔ اس کے

بعد اُنہوں نے ایک خاص امتحان کے موقع پر بیسیوں راجوں کے مقابلہ میں ایک شاہی
کمان توڑ کر امتحان پاس کیا۔ اور راجہ کی بیٹی سیتا جی کو جیت کر بیوی بنالیا پھر چند سال
تک اپنی سوتیلی ماں کے حسد کے سبب صحرا کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں اُن کے ہمراہ
اُن کے بھائی لچھمن جی اور بیوی سیتا جی بھی تھیں یہیں اُن کو ایک سرکش بدکار راجہ نے
جس کا نام راون تھا دھوکہ دیا۔ اور اُن کی بیوی سیتا کو چُرا کر لیگیا۔ اور رام جی کو اُس کے
ملک لنکا پر حملہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ہنومان نامی کوہستان کے راجہ کی مدد سے لنکا فتح
کرکے راون کو مارا اور سیتا کو چھینا۔ اس کے بعد اپنے راج استھان دارالخلافہ
اُجدھیا پوری میں واپس آئے اور راج کرنے لگے۔ اسی راج کے زمانہ میں اُنہوں نے
رسالت کے فرائض کو پُورا کیا ٭

ایک عجیب بات ہے جس کی بابت حدیثوں میں بھی اشارہ ہے کہ ہر بڑے رسول
کو ایک بڑے دشمن سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ دشمن اُسی رسول کے ہاتھ سے ہلاک
ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو نمرود اور حضرت موسیٰ کو فرعون اور ہمارے حضور صلعم کو
ابوجہل سے سابقہ پڑا تھا۔ اسی طرح رام جی کو راون اور کرشن جی کو کنس جیسے خونخوار دشمن
دیئے گئے تھے جو مذکورہ بالا دشمنوں کی طرح ذلت و خواری سے ہلاک ہوئے۔ مگر اس ظاہری
خصوصیت کے ساتھ میرے خیال میں ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کو حضرت مولانا
محی الدین ابن عربی نے بھی لکھا ہے کہ فرعون اور نمرود صفت قہاری کے ظہور تھے
چونکہ خدا کو صفت رحیمی اور شان رحمت ظاہر کرنی مقصود تھی جو رسولوں کے ذریعے سے
ظاہر کی اس واسطے شان جلالت و جبروت کو بھی ہر رسول کے زمانہ میں ظاہر کیا۔ رام جی کے
زمانہ میں راون بھی شان قہر کا مظہر تھا۔ چونکہ شان قہر کے ظہور کے لیے مختلف صورتیں اور
طریقے ہیں اس لیے راون کے بہت سے ہاتھ اور سر بیان کیے جاتے ہیں ٭

اب رام جی کے چند اقوال جو اُن کی تعلیم کا نمونہ ہیں یوگ بسشٹ اور راماین

اخذ کرکے بیان کیے جاتے ہیں ؛

فرماتے ہیں کہ دُنیا کی مثال چمکدار ریت کی ہے جو پیاس نہیں بجھا سکتی مگر پیاسے کو دھوکے میں ڈالتی ہے۔ اسلام بھی دُنیا کو سراب کی مثال سے یاد کرتا ہے فرمایا جن کے پاس کتابیں ہیں اور سمجھتے نہیں وہ بوجھ اٹھانے والے مزدور ہیں۔ قرآن شریف میں اس کی مثال بوجھ اُٹھانے والے گدھے سے دی گئی ہے ؛

فرمایا۔ دِل کُتّا ہے۔ جہاں مُردار دیکھتا ہے کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہمارے حضور نے فرمایا الدنیا جیفة وطالبها کلاب دُنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ؛

فرمایا۔ جو کچھ دریافت کرتا ہے اپنے آپ سے دریافت کر کہ سب کچھ تجھ میں ہے قرآن شریف میں بھی ایسا ہی ارشاد ہے کہ وفی انفسکم افلا تبصرون اپنے آپ کو کیوں نہیں دیکھتے اور حدیث میں ہے من عرف نفسه فقد عرف ربّه ؛

اور فرمایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ ایک اکیلا مرد بڑے گروہ کو بھگا دیتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة (ترجمہ) بعض دفعہ چھوٹا گروہ بڑے پر غالب آجاتا ہے ؛

فرمایا۔ یہ عالم محسوس وہم خیال ہے۔ مگر تعجب ہے کہ جو نہیں ہے وہ دکھائی دیتا ہے اور جو ہے وہ نظر نہیں آتا۔ فرمایا۔ عمر کی مثال بجلی کی ہے کہ ایک دم چمکی اور نابود۔

فرمایا۔ یہ کیسا بُرا گھر ہے جس کا دروازہ ہڈی کا اور دربان بندر یا ہو۔ بندریا زبان کو فرمایا اس لیے کہ اس کو قرار نہیں رہتا۔ آہنکار یعنی ہما ہمی آدمی کی دشمن ہے ؛

فرمایا۔ دُنیا میں رہنا اور اُس میں مُبتلا نہ ہونا ایسا ہے جیسا دریا میں کودی ہو اور تر نہ ہوسکے

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ، باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اور فرماتے ہیں (۱) سنتوش پر مولا بہ رحمہ ہر میں سب سے بڑا فائدہ ہے (۲) ست سنگ

برہم دھنم (اچھی صحبت بڑی دولت ہے) (۳) بچار پرم گیانم (سوچنا بڑی عقلمندی ہے) (۴) سم چہ پرم سکھم (سب کو ایک نگاہ دیکھنا بڑا سکھ ہے) +

کیا اچھی تعلیم ہے مگر افسوس زیادہ بیان کرنے کی گنجایش نہیں۔ رام جی کے بعد تھوڑا حال سری کرشن جی کا بھی معلوم کر لینا چاہئے۔ کرشن جی کے ساتھ بعینہ وہ قصہ پیش آیا ہے جو حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی کرشن جی کے ماموں راجہ کنس کو جو متھرا پر حکومت کرتا تھا نجومیوں نے خبر دی تھی کہ تیری بہن دیوکی کا آٹھواں فرزند تیرا قاتل ہوگا۔ اس خبر نے کنس کو ایسا حواس باختہ کیا کہ اُس نے اپنی بہن اور بہنوئی کو قید کر دیا اور جو بچہ اُن کے ہاں ہوتا اُسے مار ڈالتا جب آٹھویں کرشن جی پیدا ہوئے تو ماں باپ نے چپکے سے ایک گاؤں میں جس میں گائے چرانے والے رہتے تھے اس بچہ کو بھیجدیا۔ اور کنس سے بیٹی پیدا ہونے کا بہانہ کر دیا +

کرشن جی نے گوکل میں جو گھوسیوں کا گاؤں تھا پرورش پائی جب ہوشیار ہوئے تو اُن سے عجیب غریب باتیں ظاہر ہونے لگیں اس کی راجہ کنس کو خبر پہونچی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ میرا بھانجا ہے۔ اِن دنوں کرشن جی رسولوں کی سنت خاصکر حضرت موسیٰ کی سنت کے موافق گائیں چرایا کرتے تھے۔ ماموں نے حیلے سے بلایا اور قتل کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے اُسی کو ہلاک کر ڈالا۔ اور دُنیا کو اس ظالم سے پاک کیا +

ان ایام میں کرشن جی کا بانسلی بجانا اور گوپیوں سے اختلاط کرنا سب استعارے ہیں جن سے اُن کی پاکبازی پر حرف نہیں آسکتا۔ کنس کے مرنے کے بعد انکی زندگی میں نئے آثار شروع ہوئے۔ اور حکومت ظاہری کے ساتھ ہی انہوں نے روحانی حکومت کے اُصول بیان کرنے شروع کیے۔ چنانچہ جب ہندوستان کی مشہور لڑائی مہابھارت ہوئی ہے جس میں کرشن جی نے اپنے چیلے ارجن کو اُپدیش دیے۔ انہی لیکچروں کے مجموعہ کا نام گیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے مغالطہ کی پیدا شدہ تکلیف سے نجات پا سکتا

ہے اگر تین طریقے اختیار کرے:

(۱) قدرت کاملہ اور قدرتی اشیاء کا عشق (۲) فرائض معلوم کرنیکے لیے تحصیل علم (۳) فرائض کا ادا کرنا بلا خواہش نفسانی انہی تین اصول پر بحث کی ہے۔ اور ادھیائے سنیاس یوگ میں فرماتے ہیں۔ ذی علم اور خلیق برہمن۔ گائے۔ ہاتھی۔ کتے اور بدکار آدمی سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور فرمایا وہ یوگی سے بھی بڑھکر ہے جو بھلا چاہنے والوں دوستوں۔ دشمنوں۔ قابل نفرت لوگوں۔ نیکوں اور بدوں سب کو یکساں سمجھتا ہے۔ گیتا ۱۲۔ ادھیائے:

علالت کے سبب سے میں کرشن جی کے اقوال زیادہ تفصیل اور اسلامی مطابقت کے ساتھ جمع نہیں کرسکا۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کیے جائیں گے البتہ سامعین کی دلچسپی کے لیے ایک وظیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو کرشن جی کے پیرو کسی سختی کے وقت پڑھتے ہیں۔ وظیفہ یہ ہے:۔

ہری ستنا کرشن پرمہ آتما پرنپنڈ بھجنم ہیم توانگ شرنم یام سب بھے بھیتا پرتھک دیہیئے:

مگر افسوس ہے کہ کرشن جی کے اقوال کے لفظوں کی پوجا کرلی جاتی ہے جس کا نام گیتا کا پاٹ ہے اور بہت کم لوگ اس کے عجیب فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی رسولوں کی پیشین گوئی لکھدی جائے جن سے ہمارے حضور کی نسبت خبر دی گئی ہے۔ ہمارے سلسلۂ نظامیہ کے ایک بزرگ مولوی شاہ حکیم محمد حسن صاحب نظامی نے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جس کا نام غایۃ البرہان ہے۔ اس تفسیر میں تمام دنیا کی مذہبی کتب سے حضرت صلعم کی خبریں لکھی گئی ہیں اور عجیب معلومات سے اُن کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ ویدکی پوری عبارتیں مع تشریح درج ہیں جن کا نقل کرنا مشکل ہے جس کو شوق ہو مولوی شاہ فضل احمد صاحب نظامی سے امروہہ

ضلع مراد آباد کے پتے پر مطبع تفسیر منگا کر دیکھ لے۔ میں صرف ایک حصہ کا اقتباس کرتا ہوں۔ جہاں کلنکی پورانوں کے حوالے سے مولانا نے حضرت کی خبر لکھی ہے۔ لکھتے ہیں +

کلکی اوتار کے باپ کا نام وشنو یش ہوگا۔ وشنو کے معنی اللہ اور یش کے معنی عبد یعنی عبد اللہ نام ہوگا۔ ماں کا نام سومتی یعنی امانت دار ہوگا۔ سو حضور کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ پہلے پہاڑ کے غار میں عبادت کریں گے۔ سو حضرت نے غار حرا میں عبادت کی۔ پھر شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے۔ سو ہجرت بھی ہوئی۔ پہاڑ کی کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے۔ پرش کہتے ہیں روح کو اور رام خدا کو یعنی روح خدا۔ مراد جبرئیل فرشتے سے ہے۔ سو حضرت جبرئیل سب سے پہلے وحی لے کر آئے۔ شنبل نگری میں پیدا ہوں گے۔ شنبل دیپ کی نسبت مولانا نے ایک زبردست بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ شنبل ملک عرب کو کہتے ہیں کلکی اوتار کے چار بھائی ہوں گے جن کے ذریعہ وہ فتحیاب ہوں گے وغیرہ وغیرہ +

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضور کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ پس ہندوستانی رسولوں کی امت کو بھی حضور کی تصدیق کرنی چاہیئے۔ اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیئے۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری و باطنی بہبودی ہے۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کا مسلمان اور مسلمانوں کا ہندو ہونا مشکل ہے۔ نہ اس بیان سے میری یہ غرض ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں قوموں کی باہمی نفرت ہمیشہ کے لئے دور ہو۔ ہر ایک دوسرے کے پیشوا کی عزت کرے۔ اور گلے شکوے کے بدلے پہلے مسلمانوں کا قدم آگے بڑھے۔ والسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین +

السلام علیکم

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

مسلمانوں کا ذریعہ خطاب ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ تم سلامت رہو۔
ہندوستان میں اس کی جگہ۔ آداب۔ تسلیمات کا رواج ہو گیا تھا۔ اور اب
گڈ مارننگ گڈ نائٹ اور گڈ بائی کے چرچے ہیں۔
یہ زمانہ کا اثر ہے۔ مگر مسلمان وہ ہے جو اپنے دل کو آثار وقت سے محفوظ رکھے
اور دینی امور کو اپنا شعار بنائے۔
خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خدا رسول کے مقرر کردہ سلام کی پیروی کرتے
ہیں اور ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو "السلام علیکم۔ وعلیکم السلام"
کہکر ہمکلام ہوتے ہیں۔
ہمارے خیال میں جن لوگوں کو خط و کتابت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ وہ بڑے خوش
قسمت ہیں کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی سلامتی کی دعائیں ان کو ملتی ہیں۔
ہم جس وقت توحید کے خطوط کھولتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی
ہے وہ سلام علیکم ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج پچاس سلامتی نامے ہم کو ملے تو
خدا کا شکرانہ بھیجتے ہیں کہ اس نے ہم کو ایسے مذہب میں پیدا کیا ہے جس میں سلام علیکم
جیسی پیاری اور مبارک چیز سے بات شروع ہوتی ہے۔
مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خط میں سلام علیکم نہیں ہے۔ یا اس کی جگہ کوئی انگریزی
لفظ ہے تو بے اختیار ہماری زبان سے افسوس نکلتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ
سلام نہ لکھنے سے انہوں نے اپنا اور ہمارا دونوں کا نقصان کیا۔ اگر وہ سلام علیکم

لکھتے تو ہم اُس کے جواب میں "علیکم السلام" کہتے۔ گویا اس طرح دونوں طرف سے دُعا ہو جاتی۔

اجنبی ملکوں میں جہاں مسلمان ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز یہی اسلام علیکم ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے دینی بھائی سے مخاطب ہیں۔

لہٰذا اَے مسلمانو! تم کو لازم ہے کہ جب آپس میں مُلاقات کیا کرو یا کسی کو خط لکھو تو السّلام علیکم ضرور استعمال کیا کرو۔ السّلام علیکم۔
خدا تم کو سلامت رکھے

مُرغ کی اذان

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

ہر سچا مُسلمان جو رمضان شریف کی سحری کے لئے آج کل پچھلی رات بیدار رہتا ہے۔ مُرغ کی اذان سُنتا ہوگا اس پروار جانور کی آواز میں غور کرنے والے مومنین کے لئے ایک بڑی نصیحت ہے۔ مُرغ کہتا ہے میری اذان نیچرل ہے مگر بے نتیجہ ہے۔ مسجد کے مؤذّن کی اذان اَن نیچرل ہے لیکن با نتیجہ ہے۔ جو مُسلمان خدا و رسول کے نام کو تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مگر احکام الٰہی پر عمل نہیں کرتے۔ اُن کی مثال مُرغ کی اذان کی سی ہے۔ کہ دوسروں کو جگاتا ہے۔ اور خود عمل نہیں کرتا۔ اصل اذان مسجد کے مؤذّن کی ہے جو نماز کے لئے بُلاتا ہے اور خود بھی نماز پڑھتا ہے۔

تیس راتوں کی شان

اندھیرا روشنی پر غالب ہے

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

گیارہ مہینے کے رات دن رمضان کی تیس راتوں کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے لوگ کہتے ہیں روزہ کا دن ہے میں کہتا ہوں کہ دن دُنیا ہے اور رات دین جس طرح دُنیا میں انسان اعمال کرتا ہے اور دین یعنی عالم آخرت میں اُس کا بدلہ پاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں دن کے وقت بھوک پیاس کے اعمال ہیں اور افطار کے بعد آخرت کی بہاریں ہیں۔

کیا خدا کی شان ہے۔ رمضان کی تیس راتیں سارے سال کے روشن دنوں پر بھاری ہیں۔ افطار کا لطف رات کے شروع میں ہے اور حج کی کیفیت اسی شب تار میں۔ سحری کی بہار اسی وقت تاریک میں۔ اندھیرا جس قدر فخر کرے کم ہے کہ خدا نے اس کی آبرو کو نور کے سامنے چار چاند لگا کر دوبالا کر دیا۔ رمضان کی راتیں وہ راتیں ہیں جن میں قرآن شریف نازل ہوا۔ جن میں ایک رات ہزاروں راتوں سے بڑھ کر ہے۔

جس کی تجلیات آفتاب و ماہتاب اور تمام ہمہ تن صفات انوار سے عطا ہیں۔

نئی روشنی کی دوزخ جنت

(از صوفی جنوری ۱۹۱۵ء)

ایک چیز ہے جس کو روشنی کہتے ہیں۔ وہ مٹی کے تیل یا گیس و برق کے لمپ نہیں ہیں۔ بلکہ نئے بدلے ہوئے زمانے کے حالات، خیالات اور جذبات ہیں پُرانے وقت کے لوگ اس کو اندھیری روشنی کہیں تو زیبا ہے کہ حضرت ابن عربی نے فرمایا نور کی اصلیت سیاہ فام ہے لیکن نئی روشنی والوں کو آج تک نور کی حقیقت میں پس و پیش ہے۔ سورج چاند اور زمین کی مصنوعی روشنیوں کے سوا اُنھوں نے کبھی کسی کا مشاہدہ نہیں کیا۔ پس ثابت ہوا کہ نور ایک وہمی چیز ہے۔ اور نئی روشنی والوں کو اندھیری روشنی کہنا ایک توہم ہے۔ پُرانے لوگ ہمیشہ توہمات کے پانی پر قلعہ بنایا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی پھر زندہ ہوتا ہے اور اُس کو دوزخ جنت میں جانا پڑتا ہے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ جو چیز مر گئی فنا ہو گئی۔ اُس کی جگہ دوسری آ گئی نیچر بغیر ضرورت کوئی کام نہیں کرتی اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی عقلی ضرورت نہیں ہے لہذا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا غلط۔ خزاں کے موسم میں درخت کے پتّے سوکھ کر گر پڑتے ہیں۔ بہار میں دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدرت کا یہی قاعدہ ہے مُردہ اور سوکھے پتّے دوبارہ نہیں ہرے ہوتے۔

جب قدرت اسپر قادر ہے کہ اور پتّے پیدا کر دے تو اُس کو پُرانے پتّوں کے ہرا کرنے کی کیا ضرورت ہے ثابت ہوتا ہے کہ نہ ضرورت ہے۔ نہ اُس میں طاقت ہے۔ کیونکہ اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا پس یہ عقیدہ غلط ہے۔

ہم نے جو اچھے بُرے کام کئے تھے اُن کا بدلہ قانونِ حکمت سے پا چکے۔ اب

دوبارہ حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے - اور چونکہ کچھ ضرورت نہیں ہے - لہذا حشر کا ہونا اور میزان حساب میں نیکی بدی کا تولنا عبث ہے ؛

جو گناہ ایسے ہوئے جن کی خبر قانون کو نہ ہوئی اُن پر ہمارے دل نے جسکو ضمیر بھی کہتے ہیں ملامت کردی اور ہم کو تکلیف وہ پشیمانی بھی ہوگئی - پس یہی حساب اور جزا و سزا ہے - اور کچھ ضرورت نہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہو - لہذا یہ عقیدہ بھی وہم ہے -

جنت میں جن چیزوں کے دیے جانے کے وعدے ہوئے ہیں وہ بالکل خلاف انسانیت ہیں - ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھے گا - یہ تکلیف دہ کام ہے - حالانکہ جنت میں خوشی ہی خوشی بیان کی جاتی ہے ؛

جنت میں سب جوان ہونگے - یہ خلاف نیچر ہے - قدرت نے بوڑھے جوان کا فرق بڑی مصلحت سے رکھا ہے - سب ایک وضع کے ہونگے تو لطف ہی کیا آئے گا - اور چونکہ یہ خلاف نیچر ہے - اسلئے غلط ہے - اور غلط ہے اسلئے وہم ہے - اور وہم ہے لہذا پُرانے لوگوں کی بات ہے ؛

جنت میں شراب ایک ہی قسم کی دی جائیگی - جس کا نام طہور ہے - مگر انسان کی خواہش رنگارنگی چاہتی ہے - اس لئے اُس نے طرح طرح کی شرابیں بنائی ہیں - پس چونکہ یہ بھی خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے ؛

جنت میں خدمت گار صرف لڑکے ہوں گے - اور چونکہ جنت کے باشندوں کو جوان ہونا ضروری ہے لہذا ثابت ہوا کہ یہ لڑکے جنت سے باہر رہینگے - پس وہ خدمت کیونکر کرینگے - لہذا یہ دعویٰ بھی غلط ہے ؛

جنت میں مردوں کو زیور پہنائے جائینگے - اور یہ خاصہ عورتوں کا ہے - لہذا خلاف فطرت ہے اور جو خلاف فطرت ہے وہ غلط ہے ؛

جنت میں دودھ شہد کی نہریں ہونگی - لیکن شہد چھتے میں ہوتا ہے اور دودھ تھن میں

زمین میں اس کی نہر کا ہونا خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے ۔

جنت میں ایک موتی کا محل ہوگا۔ موتی اتنا بڑا ہوتا نہیں ۔ اور یہ امر سراسر خلاف قدرت ہے لہذا غلط ہے ۔

دوزخ میں آگ ہی آگ بیان کی جاتی ہے اور اس میں سانپ بچھوؤں کا ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے ۔ اور چونکہ آگ میں سانپ بچھو زندہ نہیں رہ سکتے ۔ لہذا یہ خلاف نیچر ہے اور غلط ہے ۔

دوزخ میں عذاب کے فرشتے بھی ہونگے اور فرشتے نوری ہیں اور نور کو نار کا عکس بیان کیا جاتا ہے ۔ پس ثابت ہوا کہ فرشتے آگ میں زندہ نہیں رہ سکتے ۔ اور ان کا وہاں ہونا خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے ۔

فطرت نے ہر چیز کا علاج پیدا کیا ہے ۔ پس اگر بالفرض دوزخ میں یہ سب باتیں ہوں گی تو ان کا علاج بھی ضرور پیدا کیا ہوگا ۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان کوئی آتش پروف آلہ ایجاد نہ کرے جس طرح کہ پانی سے بچنے کے لیے واٹر پروف کا آلہ نکلا ہے ۔ اور سانپ بچھوؤں سے بچنے کے واسطے اس قسم کا اوزار نہ بنا لے ۔

اس کے علاوہ دوزخ جنت ہوں گی کہاں ۔ دنیا کی زمین کا رقبہ انسان نے معلوم کر لیا ہے ۔ اگر ابتدا سے سب آدمی زندہ ہو جائیں تو اس زمین میں اتنی گنجایش نہ ہوگی اور اس زمین کے علاوہ کسی دوسرے کرہ میں انسان کا زندہ رہنا محال ہے ۔ کیونکہ وہ خاکی نژاد ہے اور جنس خاکی ہی میں زندہ رہ سکتا ہے ۔ پس ثابت ہوا کہ دوزخ جنت کو زمین پر ہی ہونا چاہئے ۔ اور زمین میں اتنی گنجایش نہیں ہے ۔ پس یہ خلاف نیچر ہے ۔ لہذا غلط ہے ۔

نئی روشنی والوں کو جواب خود نئی روشنی یہ دیتی ہے ۔

چونکہ نیچر و فطرت یکساں حالت پر کبھی نہیں رہتی ۔ بدلتا رہنا اس کا خاصہ ہی اس واسطے

ایک عرصۂ دراز کے بعد اس میں غیر معمولی اور خلاف دستور تبدیلی کا ہونا لازمی ہے اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ نئے آدمی زندہ کرنے کی بجائے پرانے مُردوں کو زندہ کرے۔

اور چونکہ نیچر خود ضرورت ہے۔ اس لیے وہ کسی ایسی ضرورت کے ماتحت نہیں ہو سکتی جس کو آدمی کی عقل ضرورت کہتی ہو۔

قانونِ حکومت کے حق و ناحق فیصلہ کے لئے کونسی عدالت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قانون نے غلطی کی اور فیصلہ ٹھیک نہ کیا۔ لہٰذا اقتضائے فطرت ہے کہ وہ جمع کرتے کرتے سب ایک دن جزا و سزا پر نظرثانی کرے اور ٹھیک فیصلے کر دے۔

بہت سے گناہ ہیں جن کو انسان کا ضمیر گناہ نہیں سمجھتا۔ اس لیے اس پر ملامت نہیں کرتا۔ اس کا فیصلہ ہونا ضروری اور نیچرل ہے۔ لہٰذا ہونا چاہئے اور یوم آخرت کو ہوگا۔

جنّت میں سب کام جنتی کی خواہش پر ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن شریف میں وَفِیہِ مَا تَشْتَھُوْنَ آیا ہے یعنی جنّت میں جس کی خواہش کرو گے وہی ملے گی۔ پس اگر نئی روشنی والوں کو ایک ہی بیوی منظور ہو گی تو ایک ہی دی جائے گی۔ بلکہ وہ چاہیں گے تو ایک ولایتی مِس بھی مل جائے گی۔

جنّت میں سب جوان ہوں گے کیونکہ وہ نیکیوں کا کلب گھر ہے۔ جس طرح دنیا میں بوڑھوں کے کلب علیحدہ ہیں۔ جوانوں کے علیحدہ۔ مجردوں کے جدا۔ شادی شدہ لوگوں کے علیحدہ۔ اور یہ کلب کے ممبر آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم میں ناجنس بھی آئے۔ بلکہ ناجنس ممبر سے گھبراتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جنتی کلب میں سب کا جوان ہونا حسب فیشن و نیچر ہے۔

جنّت میں خدمتگار لڑکے ہوں گے اور آپ ان بوائے کہکر آواز دے سکیں گے۔ ان کی حیثیت خدمتگاروں کی ہوگی۔ مالک مکان کی نہ ہوگی۔ اس واسطے ان کا داخل جنّت

ہونا اس طرح ثابت ہے جس طرح کلب گھر کے بوائز (لڑکوں) کا۔

جنت میں ہر قسم کی شرابیں ہونگی۔ طہور کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی قسم ایک ہے بلکہ یہ کہ وہاں کی شراب پی کر آپ گندی موریوں میں اوندھے منہ نہیں گرینگے۔ وہ پاک نشہ ہوگا جس سے پاک جذبات و حالات ظاہر ہونگے۔

جنت کے زیور مثالاً بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کو صرف ایک انگوٹھی ملیگی جس میں سونا پیتل ملا ہوا ہوگا اور نکٹائی و کالر کا پن مل جائے گا۔ اپنی مرضی پر ہے۔

دودھ تھن ہی میں نہیں ہوتا ٹین کے ڈبوں میں بھی ہوا کرتا ہے جس نیچر نے اس کو منجمد کر کے اس قابل بنا دیا۔ وہی اس کی نہر بھی بہا سکتا ہے۔ یہی حال شہد کا ہے۔

ایک موتی کا محل خلاف نیچر نہیں ہے۔ اپنی خوردبین سے لگا کر دیکھ لینا جس جگہ نیچر سارے جہان کے سب مرے ہوئے آدمیوں کو رکھے گی وہاں کے سمندر بھی چھوٹے نہ ہونگے اور ان کے موتی بھی دُنیا کے سمندروں کی مانند نہ ہوں گے۔

دوزخ میں آگ کے اندر سانپ بچھوؤں کا زندہ رہنا عقل کے موافق ہے۔ آگ کے کیڑے دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دوزخ کے فرشتے بھی آتشی نور کی مخلوق ہیں۔ اس لئے وہ اُس کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں۔

بیشک فطرت نے ان کا علاج پیدا کیا ہے۔ اور بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مر کر زندہ ہونے پر یقین رکھو۔ اور اس خبر کے بیان کرنے والوں کے حکموں کو مانو اور اُن پہ عمل کرو۔

تم واٹر پروف کی جگہ اگر آتش پروف نکال بھی لو۔ تب بھی دوزخ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ تمہارے لئے آگ نہ ہوگی۔ سانپ بچھو نہ ہونگے۔

بلکہ بنک فیل ہونے کی خبریں ہوں گی۔ پیاری مسوں کے انکاری خطوط ہونگے۔

حقارت کے آوازے ہوں گے۔ شیم شیم کے نعرے ہوں گے۔ تم کو ہر وقت بارش اور کہر کا سامنا ہوگا۔ تمھارے تجارتی جہاز آنکھوں کے سامنے غرق کئے جائیں گے۔ تم کو ہڑتالوں کی خبریں دی جائینگی۔ تم سے کہا جائیگا کہ تم آزاد نہیں ہو۔ تم کو سنایا جائیگا کہ سیلف گورنمنٹ تم کو نہیں مل سکتی۔ تمھارے خلاف اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھاپے جائینگے اور تم کو دکھائے جائینگے۔

تمھارے آگے تھیٹر اور بائیسکوپ کے تماشے ہوں گے اور اُن میں تمھاری تحقیر و تضحیک کی جائے گی۔ تم کو ڈیم فول کہکر ٹھکرایا جائیگا۔ تم کو بغیر کالر و نکٹائی کے کپڑے پہنا کر بازار میں نکالا جائے گا۔ تم کو میلے اور ٹوٹے ہوئے بوٹ پہنکر مسوں کے کلب میں بھیجا جائیگا اور وہ تم پر قہقہہ لگائیں گی۔

تم کو نہانے کو پانی نہ ملے گا۔ تم کو بٹھا کر پیشاب کرایا جائیگا۔ تم کو کہا جائیگا کہ اپنے ضمیر کے خلاف مضامین لکھو۔ اور تم کو چار و ناچار لکھنے پڑیں گے۔

دوزخ میں تمھاری عورتوں کو پردے میں بٹھایا جائے گا۔ اور اُن کے ناک کان چھیدے جائیں گے۔ چونکہ یہ سب باتیں تمھارے فیشن تمھاری عادت تمھارے خیالات اور تمھاری خواہشات کے خلاف ہوں گی اس واسطے ان میں تم کو وہی تکلیفیں ہوں گی جو ایک سیدھے سادے آدمی کو آگ اور سانپ بچھو سے ہو سکتی ہیں۔ اور اسی کا نام دوزخ ہے۔

رہا یہ کہ دوزخ ہوگی کہاں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی خاکی زمین پر جسکو نیچر ربڑ کی طرح اتنا لمبا چوڑا بنا دے گی کہ ساری دُنیا کے اگلے پچھلے مرنے والے اس میں بخوبی سما سکیں۔

جبکہ فطرت آج کل کے معمولی زمانہ میں زمین کے طویل و مختصر کرنیکے سامان دکھا رہی ہے تو اُس زمانہ میں تو اُس کے کارناموں کی کچھ حد نہ ہوگی کیونکہ نیچر اس وقت ایک غیر معمولی

تبدیلی و انقلاب کی جانب ہوگی۔

پس ثابت ہوگیا کہ میدان حشر، جنت، دوزخ سب اس زمین پر ہونگے۔ اور ان کا ہونا ازروئے نیچر ثابت ہے۔

نئی روشنی کی جنت دوزخ کے بحث مباحثہ کو سنکر ان کو دیکھو جو دعوے دار تصوف ہیں اور اپنی دوزخ جنت سارے جہان سے الگ بتاتے ہیں کیا مجذوبانہ بڑ مار رہے ہیں کچھ کچھ تو سمجھ میں آتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سننا۔

کس کی جنت۔ کس کی دوزخ۔ انھوں نے بیچارے بندوں کو کن کی انگلی پر نچا رکھا ہے کسی سے کہتے ہیں جنت دونگا۔ کسی کو کہتے ہیں دوزخ میں ڈالدونگا۔ کہیں دیدار کا وعدہ کرتے ہیں۔ کسی کے سامنے صاف مکر جاتے ہیں کہ بھلا مجھ کو کون دیکھ سکتا ہے میں کہیں دیکھنے کی چیز ہوں۔

مانا کہ تم خدا ہو۔ تم قدرت والے ہو۔ تم کو سب کچھ آتا ہے۔ مگر ان اپنی بنائی ہوئی مورتوں کے ستانے میں کیا رکھا ہے۔ اس میں آپ کو کیا مزا ملتا ہے۔ ہم تو جانیں جب تک کُن فیکون کا عملدرآمد ہے۔ ہر ہستی دوزخ میں ہے اور جب یہ دور ختم ہوجائیگا ہر وجود جنت میں چلا جائے گا۔

شذرات

(از اخبار خطیب ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء و ۱۴ فروری ۱۹۱۵ء)

قہر خدا پناہ! خدا کا غضب بری چیز ہے۔ خبر آئی ہے کہ اٹلی کے ملک میں ہولناک زلزلہ آیا۔ شہروں کی آبادیاں سرنگون ہوگئیں۔ لاکھوں آدمی مرگئے اور زخمی ہوگئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سینٹ پال کی مورت چھت سے گری اور پاش پاش ہوگئی۔

اٹلی کے دل میں خدا کا خوف نہ رہا تھا اس نے بے گناہ عربوں پر چڑھائی کی تھی اور طرابلس میں ہزاروں معصوم عورتوں اور بچوں کو بیوہ اور یتیم ہی نہیں کیا بلکہ اُن کو سنگینوں اور بندوقوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم خود مختار ہیں جو چاہیں کریں ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں ۔

لیکن آسمان کی سلطنت ان شرارتوں کو حساب کے رجسٹروں میں لکھ رہی تھی۔ آخر وقت آگیا اور فرشتے زلزلہ کا عذاب لیکر نازل ہوئے۔ اور اہل اٹلی کو زیر و زبر کر دیا ۔

اٹلی میں بت پرستی کا مرکز ہے۔ وہاں مسیح اور اُن کے حواریین کی پرستش ہوتی ہے گرجاؤں میں بت رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قہر نے ان بتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اب تو جناب پوپ کو ہوشیار ہو کر بت پرستی چھوڑنی چاہئے ۔

اس واقعہ سے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ وہ ہر وقت خدا کے غضب سے ڈرتے رہیں اور گناہوں کی توبہ کریں۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے ۔

اپنے دشمنوں کی تباہی پر خوش ہونا نامردی ہے۔ ڈرو کہ تم ان بلاؤں سے محفوظ رہو ۔

صاحب بہادر کا سلام

تم نے سنا ہوگا کہ جب کسی شخص سے کوئی انگریزی افسر ملاقات کرنی چاہتے ہیں تو چپراسی سے کہتے ہیں کہ فلاں کو ہمارا سلام دو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ملاقات کے لیے بلا لو ۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مومن بندہ کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتہ بھی آن کر یہی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تجھ کو سلام کہا ہے۔ مومن کی روح یہ سنکر خوشی خوشی جسم سے پرواز کر جاتی ہے ۔

مسلمان اپنے سب سے بڑے "صاحب" پر قربان ہوں۔ کیا ہی مہربان صاحب ہے۔ ایسے ناچیز مگر ایماندار بندوں کو کیسی محبت سے یاد فرماتا ہے۔ پھر کیوں نہ اُسکی چاہت

اور وفاداری کا دم بھرا جائے ؞

من کہ نازک بدن ہستم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب کا انتقال ہوا۔ تو آنحضرتؐ ان کے دفنانے کے وقت فرماتے تھے۔ یہ نازک بدن لڑکی ہے مجھے ڈر تھا کہ قبر اس پر تنگی نہ کرے۔ مگر وہ اس پر فراخ ہو گئی ؞

اُمّت بھی اپنے رسول کی نازک بدن لڑکی ہے۔ بلکہ اولاد سے بڑھکر پیاری ہے اسواسطے اس کو قبر کی مشکل کے وقت ان کی شفاعت کا بھروسہ ہے۔ خدا تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کٹھن وقت میں اپنے رسول کی شفاعت نصیب کرے۔ آمین ؞

مُرغ کی اذان

مُرغیوں نے مُرغ کی اذانوں سے دق ہو کر مسجد کے مؤذن سے فریاد کی۔ اُس نے کہا کیا تم مُرغ کی اذان سنتی ہو؟ میں تو پانچوں وقت محلہ میں چیخ چیخ کر اذان دیتا ہوں۔ مگر محلہ والوں کے کان میں آواز نہیں جاتی۔ ان سے تو تم اچھی ہیں ؞

مرغ کو خبر ہوئی تو وہ بھی آیا۔ اور بولا: میں اپنی ہستی کا یقین دلانے کو اذان دیتا ہوں۔ اس لیے تم کو ناگوار ہے۔ اور مؤذن خدا کی ہستی کا اعلان کرتا ہے اسلئے گوش اغیار بیہوش ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا پرست دوڑے ہوئے مسجد میں آتے ہیں ؞

غفلت کی نیند

سونے میں تم انگریزوں کی ریس نہ کرو۔ کیونکہ وہ اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب ان کو آرام کی نیند اور زیادہ سونا زیب دیتا ہے تم امیروں کی نیند پر نظر نہ کرو۔ ان کو دولت نے بے فکر کر دیا ہے۔ تم اگر تندرست اور مضبوط ہو تو ڈاکٹروں کے قول پر نفرت کا ووٹ پاس کرو۔ اور خوب جاگو۔ ڈاکٹر تم سے کہتے ہیں کہ صحت سات گھنٹہ کی نیند مانگتی ہے۔ مگر بڑے بڑے کام کرنے والے کبھی چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے ؞

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے مَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهَرَ اللَّیَالِی۔ جو بڑا بننا چاہے اُسکو راتوں کو جاگنا چاہیئے۔ نپولین زیادہ سونے کا دشمن تھا۔ اسی لئے قدرت نے بڑائی اور ناموری کو اُس کا دوست بنایا۔

سردی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ تمھارا جو پیشہ ہو اُن کو رات کی بیداری میں ترقّی دو۔ اوّل شب سو جاؤ پچھلی رات اُٹھ کر کام کرو۔ یہ دُنیا کام کرنے کے لئے ہے۔ سونے کا دوسرا عالم ہے۔ عمر بھر سوتا رہیگا خاک کے سایہ تلے۔ مشہور قول ہے۔

اوّل اوّل شب بیداری سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب عادت ہو جائے تو خوشی و شادمانی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ ہر وقت انسان انبسّاط رہتا ہے۔ کیونکہ فرض کی ادائیگی اور ترقی ہی بڑی شادمانی کا سبب ہے۔

قال را بگزار کہنے کو سب کہتے ہیں کہ کرنا کہنے سے بہتر ہے۔ مگر یہ بھی قول ہی فعل نہیں ہے۔ اس میں ہم کو انگریزوں سے سبق لینا چاہیئے جو کرتے پہلے ہیں اور کہتے بعد میں ہیں۔ ہندو کانگریس اور مسلم لیگ کے رزولیوشن میدان قال کے بڑے ہونہار جوان ہیں مگر حال کی صف میں آتے ہیں تو نابود ہو جاتے ہیں۔ اگر ان فیشن طراز جماعتوں کو ان قالیہ فوجوں پر فخر ہے تو خدا ان کے فخر کو زیادہ دن تک سلامتی نہ دے۔

ہمارا حال ماضی کی فراموشی اور استقبال کی خاموشی میں درخشاں ہونا چاہیئے اگر ہم بڑے تھے تو کیا ہوا۔ اگر ہم بڑے ہو جائینگے تو کون جان سکتا ہے۔ ہم کو آج کی حالت دیکھنی چاہیئے کہ نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے ہیں۔ اور ضرورت ہم کو زندہ رہنے کی ہے۔ خدا کرے ہم قال کو چھوڑیں اور مردان حال بنیں۔

حقّہ کے لئے تمباکو ایک دوکاندار نے شکایت کی کہ ایک پیسہ کی بکری نہیں ہوتی۔ حقہ کا تمباکو بھی گھر سے لانا پڑتا ہے۔

اس سے کہنا چاہئے کہ گھر میں جو پونجی ہما کو منگاتی ہے۔ وہ بھی اس دوکان کی بدولت ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ چیزوں کی تکلیف لڑائی تک ہے۔ اس کے بعد پھر خوش حالی ہوگی۔ انسان کو مصائب اور تکلیفات کے ایام میں صبر کو شیوہ بنانا چاہئے۔ کیونکہ صبر اگر نیت کرکے کیا جاوے تو بڑا اجر دلواتا ہے۔ ورنہ بے نیت تو ہر شخص کو اسی طرح دل سو سنا پڑتا ہے جس طرح صابر کو۔ لہٰذا تم تکلیف کی حالت میں صبر کی نیت کیا کرو۔

ہم کو بڑا آدمی بننا چاہئے

اب بت شکنی کا زمانہ نہیں ہے۔ طبیعتوں کا میلان لیڈر شکنی کی جانب رجوع ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ خلقت جن کو لیڈر سمجھتی ہے اور ان کے زور کو توڑنا چاہتی ہے وہ بھی غلطی پر ہے۔ اور جو لوگ چند حاکموں سے میل جول اور ایک خطاب کو لیڈر شپ سمجھتے ہیں وہ بھی غلط راستہ پر ہیں۔ کیونکہ لیڈری اور بڑائی ایک دوسری چیز ہے جسکے ماتحت دلوں کی کنجیاں ہوتی ہیں۔

تم خیال نہ کرو کہ اخباروں میں دھواں دھار مضمون لکھنے والے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے والے لیڈر اور بڑے آدمی ہیں نہیں یہ بھی دھوکا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بے اصول راستہ پر چلتے ہیں۔

ہم کو بڑا آدمی بننے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کی تکمیل کے لئے محنت، جفاکشی، ایثار درکار ہے۔ اپنا وجود کھو کر بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ فطرت ہر انسان کی اس کی خواہشوں میں مددگار ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ رات دن جوانی کے مزے لوٹو۔ اور خرافات میں مبتلا رہو۔ تو فطرت تم کو طاقت اور دولت دینے کو تیار پائی جائے گی۔ اگر تم کو منظور ہو کہ دوسروں کی خوشامد کرکے عارضی بڑائی حاصل کرو تو فطرت تمھاری دماغی قوتوں کے بہترین طریقے تعلیم کرے گی اور اگر تم یہ چاہو کہ حاکم و محکوم کو فائدہ پہونچا کر بڑائی حاصل کرو تو اس کے راستے بھی تم کو فطرت ہی کے ذریعے مل جائینگے۔ پھر تم بہت ہی بدنصیب

ہو گے اگر اپنی فطرتی طاقت سے نیک کام نہ لو۔

اگر دوسروں کی بھلائی کے لئے تم مشہور ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو قدرت تم کو قرآن کی زبان میں آواز دے گی وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ اگر تم کو دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنا منظور ہو تو وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ کا نعرہ سنو گے۔ تم چھوٹوں کا دل بڑھاؤ۔ خدا تم کو بڑا آدمی بنا دیگا۔ تم لیڈر بننے کی خواہش کرو اور مخلوق خدا کے کام آؤ۔ قدرت تمہاری مدد کرے گی۔ اور تم بڑے آدمی بن جاؤ گے نمائش ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو ذریعہ بناؤ۔ اصل مقصود نہ سمجھو۔ کیونکہ نمائش تمہاری بڑائی کا آلہ ہے۔

خلافت اور اخوت

اسلامی دنیا کے یہ دو مسئلے آج کل شد و مد سے اہل تدبیر کے زیر بحث ہیں۔ اخوت بھائی چارہ ایک رشتۂ روحانی ہے جو بطور نعمت الٰہی کے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ قرآن شریف کے چوتھے پارے میں اس نعمت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا

خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر مبذول ہوئی جب کہ تم آپس میں دشمن ہو رہے تھے تو تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈالدی اسکے بعد تم اس نعمت خدا کے طفیل میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

قومیت، رنگت، وطنیت، وغیرہ کئی جذبے ایسے ہیں جو افراد انسانی کو باہمی اتحاد کے لئے کھینچتے ہیں مگر اس کشش میں وہ دوام و استحکام نہیں پایا جاتا۔ جو جذبۂ مذہب میں نظر آتا ہے۔ خواہ کوئی مذہب ہو اُس کے پیرو اپنے عقائد سے ایک رشتۂ قلبی رکھتے ہیں۔

لیکن اسلام میں بمقابلہ دیگر مذاہب کے ایک نمایاں خصوصیت باہمی ارتباط کی پائی جاتی ہے۔ اس خصوصیت کو اگر مادی اسباب کے معیار سے معلوم کرنا چاہیں

تو میں نہیں کہہ سکتا کیا کیا وجوہات ذہن بتائے۔ مگر بادی النظر میں اس کا جواب
آسان نہیں ہے۔ ہم اس زمانہ میں بے شمار مثالیں عیسائی اخوت کی دیکھ چکے ہیں۔
خود اپنے ملک میں ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کی باہمی اُلفت کا اندازہ ہو چکا ہے۔
اگرچہ عیسائیوں کی اخوت زیادہ تر سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر عمل میں آتی تھی اور
ترکی حکومت کی مسیحی رعایا میں ہم اس کی مثالیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ بیرونی عیسائی
حکمراں اپنے ملکی مفاد کی بنا پر ان ترکی حکومتوں کو بھڑکاتے تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں
ہو سکتا کہ عیسائیوں میں اخوت کا جذبہ ناپید نہیں ہے۔ وہ نہ ہوتا تو بیرونی تحریکیں
کارگر کیسے ہوتیں۔

اسلامی اخوت باہر کی تحریکوں اور لیڈروں کی رہنمائیوں سے آزاد ہے۔
ایک گاؤں میں جاؤ جہاں کے باشندے جاہل محض اور تمام احساسات و علم سیاست
سے نابلد ہوں۔ پھر ان سے کہو فلاں ملک میں مسلمان پر ظلم ہوا ہے۔ تو وہ ایسے بے قرار
ہو جائینگے گویا خود اُن پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ایسے ہی خوشی کی خبر سُن کر اُن کا
مسرور ہونا لازمی ہے۔

یہ کیا طاقت ہے؟ اس کے جواب کے لئے ہم جو مادّی دلائل غور و خوض سے
پیدا کرتے ہیں وہ سب کی سب دستِ مادّیت سے چھٹی جاتی ہیں۔ اور یہ مجبور کرتی
ہیں کہ ہم ہر پھر کر اس آیت کی طرف رجوع کریں۔ اور کہیں کہ سارا طفیل عنایتِ رب
کا ہے۔ اس کو منظور ہے کہ مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ تمام قوموں سے ممتاز
رہے۔

اخوت کی مادّی دلیلیں چند مذہبی مراسم ہیں جن میں حج اور نماز کو زیادہ
خصوصیت ہے۔ مگر لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے کروڑوں آج تک حج کو نہیں گئے
لیکن ان میں جذبۂ اخوت کی کمی نہیں ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رشتہ کسی مخفی طاقت

کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ خود اُس طاقت نے اس آیت میں دعویٰ کیا ہے *

جہاں مسلمانوں میں یہ زبردست طاقت اخوّت کی ہے وہیں ان میں اختلاف بھی بکثرت ہے اور جو حسب روایات احادیث صحیحہ قیامت تک رہے گا۔ اس اختلاف نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا۔ اُن کی بادشاہتیں خاک میں مل گئیں۔ وہ ذلیل و محکوم بن گئے۔ لیکن ان حالات سے اخوّت کی طاقت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا وہ جوں کی توں موجود ہے۔ یہ اختلافات بظاہر ہم کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم میں سے اخوّت سلب ہو گئی ہے۔ مگر یہ سب ایک دوسری لائن کی باتیں ہیں اور اخوّت اور چیز ہے۔ اخوّت بنیاد اور جڑ ہے۔ اور موجودہ اختلاف شاخوں اور سطح پر ہے۔ جڑ سے اسے کچھ سروکار نہیں *

غازی پور کی تازہ تقریر میں سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے اخوّت اسلامی کا تحیر و تعجب سے اعتراف کیا ہے کہ یہ باوجود بہم صدمات کے اب تک اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے *

کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اسلامی اخوّت کی ثابت قدمی ظاہری اعتبارات سے بالکل قرین عقل ہے۔ مسلمان نسل اور ملک کے ماتحت نہیں ہیں۔ ان کا اتحادی مرکز *

کلمۂ وحدت

ہے۔ جو تمدنی۔ ملکی۔ سیاسی انقلابات سے قدرتاً متاثر نہیں ہوتا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا ہے کہ کوئی دوسری قوم اگر ایسی اخوّت قائم کرنی چاہے تو نہیں کر سکتی۔ مگر میں کہتا ہوں فطرتِ الٰہی نے اپنا احسان مسلمانوں کے لئے ریزرو نہیں کیا ہے۔ جو قوم کلمۂ توحید کا اقرار کر کے دل و جان سے اُس پر یقین کر لے اُس کی قومیت، اخوت

کی طاقت سے اس طرح پامال ہو جائے گی جس طرح مسلمان دیکھے جاتے ہیں۔

حاصل مقصد

مسئلہ اخوت کی تحقیق کا یہ ہے کہ برٹش حکومت اس طاقت کو نظر انداز نہ کرے اور سمجھے کہ جرمن اسلامی اخوت سے کام لے رہے ہیں اور ہماری سرکار ابھی تک صرف علمی پہلو سے اس پر بحث کر لینا کافی سمجھتی ہے۔ حالانکہ وقت عمل کا ہے۔ میں یہ سوال سنجیدگی سے کرتا ہوں کہ جرمنوں نے فرضی طریق سے ہی قبولیت اسلام کا دعویٰ کر کے جو اثر اخوت کی لہر میں حاصل کر لیا ہے اس کا جواب ہماری گورنمنٹ نے کیا دیا؟ یا تو اس کی باضابطہ مؤثر طریقہ سے تردید ہو یا اور کوئی صورت نکالی جائے ورنہ ان چرچوں کا اسلامی اخوت پر جو اثر پڑ رہا ہے۔ وہ معمولی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے۔

خانۂ رسولؐ کے راز و نیاز

محبت کے راز و نیاز کی معاملہ بندیاں

شاعروں نے بہت تشبیہیں دیں۔ آسمان کے قلابے ملائے مگر خانہ داری کی الفتوں کا ان کو کیا مزا۔ جو درختوں اور جانوروں کی مثالوں میں جذبات عشق تلاش کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے سرو نے قمری کے دل کو جلایا لہٰذا پھل سے محروم رہا۔ کوئی بولا گل نے بلبل کو ستایا۔ اس لیے پژمردہ ہو کر کمھلایا۔ کسی نے شمع و پروانہ کے سوز و گداز پر آنسو بہائے۔ آؤ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی راز و نیاز کو سنیں۔ اور اپنے گھروں میں اس محبت کا رواج دیں۔

ذیل کا قصہ صحیح حدیث سے نقل کر کے لکھا جاتا ہے۔

رسول خدا (حضرت عائشہؓ سے مخاطب ہو کر) ہم جان لیتے ہیں کہ آج تم ہم سے خوش ہو یا ناراض۔

حضرت عائشہؓ کیونکر؟ میں قربان ہو جاؤں ذرا بتائیے تو۔

رسول خدا۔ جب تم ہم سے خوش ہوتی ہو تو یوں قسم کھاتی ہو "محمدؐ کے خدا کی قسم" اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو۔ ابراہیمؑ کے خدا کی قسم۔

حضرت عائشہؓ (متبسم ہو کر) ہاں یا رسول اللہ! خفگی میں آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ نہ کہ آپ کو۔

اس راز و نیاز میں جو پاکبازانہ لطف ہے۔ وہ اہل محبت سے مخفی نہیں۔ کون سا گھر ہے جہاں رنجشیں پیدا نہیں ہوتیں مگر رنج ہو تو بس اتنا کہ فریقین اپنے جذبات اشاروں کنایوں میں ادا کر کے جی کی بھڑاس نکال لیں۔ نہ یہ کہ توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کر بیٹھیں۔

مقصود زندگی

ہر ایک کہہ رہا ہے زمانے میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصود زندگی کیا ہے
(اکبر)

نئی روشنی نے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا اور عزت کے ساتھ بسر کر کے مر جانا ہر انسان کا مقصد زندگانی ہے۔

مگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں تو زندگی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان باتوں کا حاصل مقصد کیا ہوا کیا اتنی بڑی دنیا۔ یہ عظیم الشان کائنات یہ عقل کا پتلا آدم زاد اس لیے پیدا ہوا کہ دو نوالے کھائے۔ دو کپڑے پہنے۔ چار سلام لے اور آنکھ بند کر کے موت کے حوالے ہو جائے۔

مذہب کہتا ہے۔ عبادت رب مقصود زندگی ہے۔ مگر فطرت کہتی ہے زندگی

خود اپنا مقصود ہے۔ زندگی کی شناخت کے لیے زندگی ملی ہے۔ یہ مجہول کی مجہول تعریف نہیں ہے۔ غور کرو ہر ذرہ کی حیات اپنے وجود کے عرفان کے لیے ہے۔

اور انسان جو تمام موجودات کا خلاصہ ہے اپنی اور تمام کائنات کی زندگانی کو پہچاننے اور اُس سے خالق کا عرفان حاصل کرنے کو پیدا ہوا ہے۔ جب شناخت ہوتی ہے۔ خود سر دل کا سر جھکا کر سجدہ میں گر پڑتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ:۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

پھر عبادت و طاعت بھی شروع ہوتی ہے جو بیان مذہب کی رو سے مقصود زندگانی ہے۔ اور کھانے پینے رہنے سہنے کا بھی اصلی لطف آتا ہے جو نئی روشنی کے عقیدے میں مطلوب حیات ہے۔ واہ عرفان تیری کیا بات ہے میری پہچان میں تجھ پر قربان۔ تو آجائے تو جینے کا مزا مل جائے۔

خاک کا ٹھکانا جب جان خاک میں ملی۔ تو سب نے شادیانے بجائے ترانے گائے اور ہر ایک نے نور چشم لخت جگر کہکر اس خاک آلود جان کو سینے سے لگایا۔ ماں نے گود میں اُٹھایا۔ باپ نے آنکھوں پر بٹھایا۔ اور جب جان خاک سے آزاد ہوئی۔ مٹی کی آلودگاری سے نجات ملی تو آہ و بکا کے نالے بلند ہوئے۔ کسی نے کہا کہ ہائے میرا لال۔ کوئی بولا ارے میرے سرتاج۔ عورت۔ مرد بچے۔ بوڑھے یکساں رونے پیٹنے میں مصروف ہوئے۔

کیا خدا کی شان ہے۔ یہ انسان بھی کس قدر انجان ہے۔ ہنسنے کے وقت روتا ہے اور رونے کے موقع پر ہنستا ہے۔ کوئی اس کو بتائے۔ خاک اور جان

کے رتبوں کا فرق سمجھائے۔ جان جسم خاک میں اپنی خوشی سے نہیں آئی تھی۔
حکم حاکم سے مجبور تھی۔ حاکم کو خاک کا رتبہ بڑھانا تھا۔ ورنہ جان کا خاک نہیں
کوئی اور ٹھکانا تھا۔

خاک نے درجہ پایا۔ کچھ دن امراللہ کے سانسوں کو پیار کے سینے سے لگایا
آخر وقت مقررنے اپنی جان کو رہائی دی۔ اور خاک کو اُس کے ٹھکانے پر
بھیجدیا۔

خاک کا ٹھکانا خاک ہے۔ جان کا ٹھکانا شہ لولاک ہے۔ خاک اپنے
ٹھکانے میں پہنچکر غمناک بن جاتی ہے اور جان کا جو حال ہوتا ہے اُس کا اظہار
الفاظ و معانی کی حد سے باہر ہے۔ پھر کون بتائے سوائے اس کے کہ جناب
اکبر کا گیت گائے اور یہ شعر پڑھے

جان جب خاک میں ملتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

پانچویں منزل

سیاست معاشرت تمدّن

تاج اور کلاہِ درویشی

دربار کی یادگار

(از صوفی جنوری سنہ ۱۹۱۱ عیسوی)

دہلی میں دربار ہے۔ شہنشاہ ہندوستان و انگلستان یہاں آئیں گے جنگل میں منگل ہوگا۔ ادنےٰ اعلیٰ چھوٹا بڑا۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ موسائی خوش ہوگا۔ اور خوشی کا اظہار کرے گا۔

آؤ ہم بھی شاہ جارج کو مبارکباد دیں۔ مگر ساری دنیا انگریزی قوم اور انگریزی بادشاہ کو مبارکباد دیتی ہے۔ ہم صوفیوں کی طرف سے اُس چیز کو مبارکباد دیں جو سب خوشیوں کا مرکز ہے۔ بیشمار امیروں کا ملجا و ماوا ہے۔ یعنی:-

تاج

در اصل تاج ہی وہ چیز ہے جس پر بادشاہی شہنشاہی کی مُہر لگی ہوئی ہے بغیر تاج کے سب انسان برابر ہیں۔ وہی دو آنکھیں وہی ایک زبان۔ دل بھی ایک معدہ بھی

بہت اونچا نہیں۔ سانس بھی وہی۔ پیاس بجھانے کو پانی بھی۔ اور پیٹ بھرنے کو روٹی بھی یکساں۔ حضرت تاج سر پر آجاتے ہیں تو یہ انسانی وردگی کی مورت بادشاہ کہلانے لگتی ہے۔ دیکھنا اس تاج کے اجزاء پر غور کرنا۔ یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ عظمت یہ طاقت۔ یہ تاثیر آگئی کہ جہاں یہ سر پر پہنچا کروڑوں سر اس کے سامنے جھکنے لگے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو انسانوں نے بنایا ہے۔ اور اس میں وہی اجزاء ہیں جو ہر کس و ناکس کے استعمال میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ جب وہ اجزاء تاج کی شکل اختیار کرلیں تو انسان کو بادشاہ بنادیں۔ اور گداگی گدڑی میں سئے جائیں تو حقارت و ذلت کا ہدف بنیں۔ ہو نہ ہو اسکی حقیقت میں اس کے معانی میں کوئی بھید ہے۔ اُن سے کہو جو صوفی کہلاتے ہیں۔ جن کی دینی و دُنیاوی زندگی حقیقت شناسی ہے۔ تاج کی حقیقت پر غور کریں کہ وہ اس شکل میں آکر ایسا اثر دار کیوں ہو جاتا ہے +

اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وتعز من تشاء وتذل من تشاء والا معاملہ ہے۔ ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جن کے تاج کی کچھ عزت نہ تھی۔ تلوار کے زور سے ملک لیا اور کچھ دن کے بعد فنا ہوگئے۔ اور ایسے شہنشاہوں کا ذکر بھی تاریخوں میں مذکور ہے۔ جن کو مرنے کے بعد کفن بھی میسر نہ آیا +

شاہ جارج کی تاجپوشی لندن میں ہو چکی۔ ہندوستان بھی اُن کی حکومت کا ایک حصّہ ہے۔ اس کے لیے دہلی میں خود تشریف لاکر اپنی تاج پوشی کا اعلان کینگے اعلان کرتے وقت اُن کا دل خوش ہوگا۔ اُن کی خوشی سے رعیت بھی شاد کام ہوگی رعیت کے سب طبقے علیحدہ علیحدہ مبارکباد دیں گے۔ درویشوں اور صوفیوں کی طرف سے کلاہِ درویشی۔ صدائے قلندرانہ میں تہنیت گزار ہے +

"جارج" بابا کی خیر کر بھلا۔ ہو بھلا۔ سانس کی قدر کر۔ آس والوں کی آس بر لا۔ گھوڑے والے۔ جوڑے والے۔ توپوں والے۔ ٹوپوں والے۔ شاد رہو۔ آباد رہو۔

تیرے جہازوں کی خیر۔ اور اُس آزادی کا بول بالا جو جہاز کے جھنڈوں میں لہرا رہی ہے فقیروں کی طرف بھی دیکھ۔ یہ وہ ہیں جو مغرور اور متکبر خود سر جفا کار بادشاہوں کو کھری کھری سُنا دیا کرتے تھے۔ تو تو نیک دل اور نرم مزاج ہے۔ تیری حکومت میں ہر بات سُننے کی صلاحیت ہے۔ دیکھ یہ دُنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس کی شان و شوکت میں جی نہ لگا۔ اور اُس کی طرف متوجہ ہو جس نے تجھکو یہ شان و شوکت عطا فرمائی ہے ❊

اس ہندوستان میں اُن ہندو مہاراجاؤں کی اولاد جو ایک زمانے میں اس مُلک کے تاجور تھے۔ کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہے۔ تغلق اور خلجی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے کرتے ہیں۔ اور تغلق آباد کے عالیشان قلعے کی کوٹھریوں میں اپنی گزشتہ عظمت کو یاد کر رہے ہیں ❊

تیموری جاہ و جلال کی افسردہ نشانیاں شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے محلوں میں فاقہ کشی کر رہی ہیں۔ کیوں۔ اس واسطے کہ اُنھوں نے دُنیا کی عیش و عشرت میں اپنے انجام کار کو بُھلا دیا۔ گردش دوراں کو یاد نہ رکھا۔ تو نہ بھول۔ تیری یاد ہمیشہ قایم رہے گی۔ غرور سے اکڑ کر نہ چل۔ تیرے تاج کو دائمی قرار نصیب ہو گا ❊

خدا خوش نصیب ملکہ میری الکے سُہاگ کو چار چاند لگائے۔ اور وہ دیکھیں کہ غریبوں کی دعاؤں کے کپڑے کارچوبی چمکدار کپڑوں سے لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ انھیں کو ہمیشہ استعمال کریں ❊

یہ درویشی کلاہ بھی اقلیم تصوف کی حکومت کا ایک تاج ہے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے ایمان کا سکہ چلاتا ہے۔ خدائی توپوں اور فوجوں کو رکاب میں رکھتا ہے اے بادشاہ! اس کی دوستانہ مبارکباد قبول کر۔ اور سر بلند ہو ❊

ٹھکانا ایک بستر کا

(از اخبار زمیندار فروری ۱۹۱۲ء)

انگریزی سرکار! تجھ کو قرار، تیرے نرم گرم بستر کو قرار، شاد رہ آباد رہ، مسلمان فقیر ہیں بے نوا ہیں۔ مگر تیرے اس بستر کو نظر لگانے والے فقیر نہیں ہیں جو مشرق و مغرب میں بچھا ہوا ہے۔ ان کو صرف ذرا سی جگہ تیرے دل میں درکار ہے جس میں مسلم کی ہستی مختصر کے لیے ٹھکانا ایک بستر کا ہو جائے۔

اے ہندوستان میں پاؤں پھیلانے والی گورنمنٹ! نیند ہماری آنکھوں میں بھی آتی ہے ہم کو بھی گوشۂ عافیت دے۔ زیادہ نہیں فقط

ٹھکانا ایک بستر کا

کل کے دن ہم تاج والے تخت و بخت کے مالک تھے۔ آج کے دن ہم تیرے سلاح کے سائے تخت کو تختہ بنائے بخت و اقبال لٹائے بے یار و مددگار کھڑے ہیں ملک نہیں مانگتے۔ تاج و تخت طلب نہیں کرتے۔ ہمیں تو محض درکار ہے

ٹھکانا ایک بستر کا

دہلی بسانا مبارک۔ لیکن ہمارے نشیمن کو نہ اجاڑ ہمارے ٹوٹے بوریے کو حجرہ سے نہ پھینک۔ دیکھ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ بس یہی باقی ہے

ٹھکانا ایک بستر کا

سنتے ہیں تجویز شدہ نئی دہلی کی تعمیر میں وہ سب قبہ آگیا ہے جس میں ہم اُجڑنے والوں کی مسجدیں ہیں۔ خانقاہیں ہیں۔ مزارات ہیں۔ اور تاریخی چیزیں ہیں۔ جن کو زمین سے اُبھرا ہوا دیکھکر سانس آتا جاتا ہے۔ یہ مٹ جائیں گی تو ہمارا وہ سب کچھ مٹ جائے گا جس کو ہم کہا کرتے ہیں کہ ابھی باقی ہے

ٹھکانا ایک بستر کا

حلقہ نظام المشائخ نے پنجاب گورنمنٹ کو درخواست بھیجی ہے کہ ان مقدس مقامات کی حفاظت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ اور حلقہ مجوزہ رقبہ کے اندر آئی ہوئی تمام مسجدوں خانقاہوں۔ مزارات۔ تاریخی مقامات کی فہرست بنارہا ہے اسپر رحمکدہ پیش ہوا نظر توجہ کی جائے تاکہ ہم سب گداگران دلفگار جارج سلطان کے ارمان کو خوشی و خرمی سے پورا ہوتے دیکھیں اور کہیں رل گیا ہمارا۔

ٹھکانا ایک بستر کا

عقل و دوراندیشی رکھنے والے انگریزو ہمیں تم پر بھروسہ ہے۔ اعتماد ہے کہ تم یقیناً ہماری اس شکستہ آواز پر کان دھروگے اور احتیاط کے ساتھ ان نشانیوں کو قائم رکھوگے جہاں ہے ہمارا

ٹھکانا ایک بستر کا

مسلم پریس کو اگر اس سوختہ طلبگاری میں بوئے ادب وفاشعاری محسوس ہو اور کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو اس سے بھی درخواست ہے کہ اس صدا میں سر ملاکے اور کہے۔ ہاں باقی رہے

ٹھکانا ایک بستر کا

چمار زادہ سیّد کی گود میں

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

پنچ زاد چھوڑ کر - آ میری گود میں آجا - تو شودر ہے - کمین ہے - پلید ہے - گندہ ہے مگر میرے واحد خدا کا بندہ ہے - مجھ جیسا آدمی ہے - ناک کان - ہاتھ - پاؤں - آنکھ - زبان دل - دماغ رکھتا ہے - تجھ کو کس نے اچھوت اور ناپاک بنا دیا - نہیں - تو پاک - پوتر ہے - عزت دار بلند مرتبہ ہے - کون ہے جو تجھکو خدا کی درگاہ میں جھکنے سے روکتا ہے - مندر مسجد اور گرجا میں جانے سے منع کرتا ہے - کیا ہندو تجھ کو اس لیے مندر شوالے میں نہیں آنے دیتے کہ تو نے پنچ ذات کے گھر میں جنم پایا ہے - کیا عیسائی گورا اس واسطے اپنے بڑے درجہ کے گرجا میں تیرے گھسنے کا روادار نہیں کہ تو ناشائستہ جاہل اور کالا دیسی ہے - کیا مسلمان تیرے میلے میلے ہاتھ پاؤں دیکھکر گھن کھاتا ہے اور مسجد میں نہیں آنے دیتا ؞

تو آ - سید فقیر - عربی رسولؐ کا فرزند تیرے ہاتھ پاؤں دھوئے گا اور اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد توحید میں ساتھ لے چلیگا ؞

بابا - اپنی قدر پہچان - میں تجھ پر قربان تو انسان ہے - بلند شان ہے - خلیفۃ المسلمین محمد خامس کا لخت جگر - خاتون الہند - جارج خامس کا نور نظر - اور تو لے غریب چمار کے پسر - خدا کی درگاہ میں سب برابر ہو - آؤ عرب نبی کے ہادا جو اونچی ذات اور نیچی ذات کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے والے پتی کی سیوا اور پوجا کریں - جس نے پریم پرچار میں امیر غریب - ادنے اعلے چھوٹے بڑے پڑھے اَن پڑھ کی کچھ تمیز اور قید نہیں رکھی - اور اُپدیش دیا - ذات پات نہ پوچھے کوئی - ہر کو بھجے سو ہر کو ہوئی ؞

تو آ - ہر کے نام کی بانسری بجائیں - ہر کو ڈھونڈیں - ہر کو پائیں ؞

جیبی گھڑی کی سازش

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

غلطی یہ ہوئی کہ گھڑی کو بائیں طرف کی جیب میں رکھا۔ وہاں اس شریر چھوٹی کھوٹی فتنی نے میرے دل کو بہکا لیا۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ دل آخر گوشت کا لوتھڑا تھا۔ گھڑی کے چلتے پرزوں سے کیونکر بچ سکتا۔

گھڑی نے جب وہ جیب کے ہوٹل میں اتری۔ پاس دھڑکنے والی آواز سنی۔ اس کو معلوم ہوا کہ یہاں قریب میں کوئی بے قرار چیز ٹھہری ہوئی ہے۔ اس لئے اس نے کہا تم کون ہو۔ کیا تم بغیر انٹرڈیوس اور تعارف کے بات کر سکتے ہو۔

دل اس وقت ذکر خدا کر رہا تھا۔ مرشد کا بتایا ہوا پاس انفاس اس کے پاس تھا۔ اس کو کسی غیر سے مخاطب ہونے کی اجازت نہ تھی۔ نہ یاد الٰہی کے سرور و لطف میں وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونا پسند کرتا تھا۔

مگر نئے مہمان کی خاطر سے اس نے اتنا کہا۔ میں دل ہوں۔ سینے کے حجرے میں مدت سے رہتا ہوں۔ آپ کب تشریف لائے؟ میرے قابل کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔

کیونکہ مجھ کو میرے رسولؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے پڑوسی کے کام آنا چاہیئے۔ اپنے مہمان کی خاطر داری کرنی چاہیئے۔ ولایتی گھڑی نے اس گوشہ نشین اللہ والے کی نرم اور مہربان آواز سنکر نازِ دلربایانہ سے کہا:

تھینک یو مائی ڈیر ہارٹ! شکریہ میرے پیارے دل۔ کیا آپ میرے پاس آسکتے ہیں؟ میں آپ کی شرکت سے اپنی میز کا فخر بڑھانا چاہتی ہوں۔ آپ کا دم سینے کی اندھیری

کوٹھری میں گھبرا گیا ہوگا۔ باہر نکلئے۔ میرے قدر دانی کو دیکھئے۔ اور ہیرے یاقوت کے زیور ملاحظہ فرمائیے جن کو میں نے پہن رکھا ہے ؛

زاہد خشک مزاج دل نے آہِ سرد بھری۔ لیکن ایٹی کیٹ (آدابِ فیشن) کے خلاف پری زاد گھڑی کے پُر ارمان پیام کا جواب نہ دیا ؛

فیشن ایبل (گھڑی) گھڑی نے اس خاموشی کو اپنی انسلٹ (توہین) سمجھا اور تیوری پر بل ڈال کر اندر ہی اندر جز بز ہو کر رہ گئی ؛

اب اس نے انتقام لینا چاہا۔ وہ خلوت نشین عابد کا تقویٰ توڑنے کے لئے تیار ہو گئی اور سوچنے لگی۔ کیونکر میں اس نیم وحشی مگر خوبصورت چیز کو اپنے قابو میں لا سکتی ہوں ؛ اتنے میں بارہ بجے کی توپ چلی۔ گھڑی والے نے اس کو جیب سے نکالا۔ اور دست شوقین کی انگلیوں سے چٹکی بجاتے کوک بھر دی۔ یہ کوک گھڑی کی غذا تھی جس نے اُسکے دماغ میں کام کرنے اور دل کے خلاف غصہ نکالنے کے لیئے ایک طاقت پھرتی پیدا کر دی ؛

پہلے گھڑی نے اپنا کھٹکا دل کے کھٹکے سے ملا دیا۔ اور اس طرح گویا اس نے دل کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ دل نے جب گھڑی کی صدائے وحدت سُنی تو بہت خوش ہوا۔ اور اپنے مشغلۂ حق سے یکسو ہو کر گھڑی سے یوں خطاب کیا۔ تمہارا کھٹکا بہت مضطرب جلد بازانہ ہے۔ ذرا آہستہ آہستہ سانس روک کر ذکر کرو ورنہ عمر جلدی تمام ہو جائے گی میرے مرشد نے حبسِ دم کی اسی واسطے تلقین فرمائی ہے کہ سانس کی اضطراب کو قرار رہے۔ اور سکون و طمانیت سے سب کام پورے ہوں ؛

گھڑی بولی میں بے تہذیب دیسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتی۔ تو ولایت کے آداب سے واقف نہیں ہے۔ تو نے ابھی سوسائٹی کے اعلیٰ رکن عورت ذات کی توہین کی ہے کیوں اُس کی منہ مانگی مراد کو پورا نہ کیا ؛

دل نے جواب دیا میں نامحرم کے پہلو میں ایسے وقت جبکہ تیرا وہاں کوئی نہ تھا کیونکر

آسکتا تھا۔ یہ میرے مذہب کے خلاف تھا۔ کیونکہ وہ غیر عورت کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا کجا صورت دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا +

کواری گھڑی نے دل کی بات سُن کر ایک بجلی بھرا تبسم کیا اور کہا معاف کیجئے میں آپ کے مذہب کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ یہ تہذیب و شائستگی نیز قانون حکومت کے خلاف ہے۔ کہ کسی کے مذہبی عقیدے میں دخل دیا جائے مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ زندگی کے مزے سے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ عورت اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ مجلسوں اور محفلوں کی کیفیت اور زیب و زینت کو بڑھائے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی عصمت ایک شخص کی جائز ملکیت ہونی چاہیئے مگر یہ بالکل ظلم ہے کہ وہ اجنبی مردوں کو اپنے ہنسمکھ چہرے اور اپنی میٹھی باتوں سے محروم کر دے ہماری ولایت کا دستور بہت اچھا کہ غیر شخص دوسرے کی بیوی سے تخلیہ کی ملاقات کر سکتا ہے۔ ہوا خوری کو ساتھ لیجا سکتا ہے اور اُس کے خاوند کے سامنے بیوی کے حسن و جمال کی تعریف کر سکتا ہے۔ تم دیسی لوگ بڑے وحشی ہو۔ اگر کسی کے سامنے اُسکی بیوی کی تعریف کر دی جائے تو وہ یقیناً چھری مارنے پر آمادہ ہو جائے گا +

دل گھڑی کی جادو بھری تقریر سے موم ہو گیا۔ اُس نے اپنا مقدس ہاتھ ڈرتے ڈرتے اُٹھایا اور گھڑی کے ہاتھ کو پکڑ کر چومنا چاہا۔ مگر یکایک اُسکو خدا کے ڈر نے اس گناہ سے روکا اور اُس نے کانپ کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ دل کی اس حرکت سے گھڑی کھِل کھِلا کر ہنسی اور بلیک فول (بے وقوف کالا بے وقوف) کہکر عشق کے کوچہ سے ناآشنا غریب دل کو پریشان کر دیا +

آخر دل سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہا تم میں ایسی کیا خوبی ہے جو سَو روپیہ خرچ کر کے تم کو خریدا گیا۔ تم جن چیزوں کو ہیرے یاقوت کے زیور کہتی ہو وہ معمولی پتھر کے ریزے ہیں۔ تمہارے اندر چند پیتل کے پرزوں کے سوا رکھا کیا ہے۔ ہندوستانی درحقیقت

کالے بے وقوف ہیں جن کو وقت کی پابندی کا تو کچھ خیال نہیں مگر یورپ کی تقلید میں پیتل کے چند ٹکڑوں کو چاندی کے سکے دیکر خرید لیتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف یہ بیکار پیتل کے ٹکڑے رہ جاتے ہیں اور ولایت میں چاندی پہنچ جاتی ہے ٭

میرا بس ہو تو سارے ہندوستان میں ڈھنڈورہ پیٹ دوں کہ گھڑی وہی رکھے جو وقت کی قدر جانتا ہو۔ ظاہری نمایش کے لیے کوئی اپنی دولت غیر ملکوں میں نہ بھیجے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جب تک اپنے ملک میں گھڑی کے کارخانے قایم نہ ہو لیں اور یہاں گھڑیاں نہ بننے لگیں کوئی ہندوستانی گھڑی نہ خریدے ٭

دل کی اس باغیانہ تقریر سے گھڑی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے خانساماں کو بلایا اور اس درویش صفت مگر سرکش وجود کو دھکے دیکر نکلوا دیا ٭

جناب دل نکل تو آئے مگر اب ان پر گھڑی کے عشق کا جنون سوار ہے۔ گھڑی کی طلائی زنجیر کے خیال کو اپنے پاؤں کی بیڑی بنا رکھا ہے ٭

میں کیونکر کہوں کہ گھڑی کی سازش نے میرے دل کو کہیں کا نہ رکھا ٭

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا رہا

چھڑکاؤ کی گاڑی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

گرد آباد سڑک پر دیکھا ہو گا۔ چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کیونکر تپتی ہوئی زمین کو سیراب کرتی ہے راستہ چلنے والے مسافروں کو تکلیف دینے والی خاک کا منہ بند کرنے کے لیے

اپنا سارا سرمایہ مٹی میں ملا دیتی ہے ۔

تمہارے لیے اس میں عبرت و نصیحت ہے۔ اگر تم ذرا غور و فکر کی عادت ڈالو تو دنیا کی ہر چیز راستہ بتاتی ہے مگر تم تو زندگی کی کش مکش میں آنکھ بند کرکے پڑا رہنا چاہتے ہو۔ کہیں اس طرح زندگی بسر ہوا کرتی ہے ۔

ظاہر میں چھڑکاؤ کی گاڑی بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہے۔ اپنا پانی بے تحاشا بہاتی ہے۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی شہر میں گیا اور وہاں چھڑکاؤ کی گاڑی کو دیکھا تو کہنے لگا یہ گاڑی والا بھی بڑا بے وقوف ہے۔ پانی بہہ رہا ہے اور اسکو خبر نہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے تو ایک بوند بھی باقی نہ رہیگی ۔

مگر تم گنوار کی طرح انجان اور ناسمجھ نہ بنو۔ چھڑکاؤ کی گاڑی پر فضول خرچی کا الزام نہ لگاؤ۔ بلکہ خود اپنی دولت دوسروں کی فائدہ رسانی میں خرچ کرنی سیکھو ۔

اب تم اپنے عیش و آرام کے لیے۔ اپنے نام و نمود کے واسطے شادی میں غمی میں ہزاروں روپے خرچ کر ڈالتے ہو۔ مگر خدا اور اس کے بندوں کا کوئی کام درپیش ہوتا ہے تو ہاتھ سمیٹ لیتے ہو۔ فضول خرچی کا سہرا چڑھ جاتا ہے ۔

فضول خرچی بہت بری چیز ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے ولا تبذر تبذیرا۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ اسراف نہ کر۔ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا کلوا واشربوا ولا تسرفوا کھاؤ پیو۔ مگر اسراف نہ کرو ۔

اگر چار آنے گز کے کپڑے میں تمہاری تن پوشی ہو سکتی ہے۔ اگر دو روپیہ کی دیسی جوتی تمہاری برہنہ پائی کو دور کر سکتی ہے۔ اگر ایک طرح کے دال سالن سے تمہاری روٹی چل سکتی ہے۔ تو تین چار روپے گز کے کپڑے پہنکر اپنے جسم کی عادت نہ بگاڑو۔ دس بیس روپے کا ولایتی بوٹ اور پانچ روپے کی کامدار جوتی نہ پہنو۔ دس بیس طرح کے کھانے دسترخوان پر

نہ لگاؤ۔ تم ایک غریب ملک کے باشندے ہو۔ تم ایک مفلس قوم کے فرد ہو۔ دوسرے بھائیوں کا بھی خیال رکھو کہ وہ کس حال میں ہیں ۔

حضرت محبوب الٰہی کے حال میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں جب ان کو گرم کپڑا پہنایا جاتا تو وہ آنکھوں میں آنسو لاکر فرماتے پہلے مسجدوں اور بازاروں کے گوشوں میں غریبوں کو دیکھ آؤ۔ ان میں کوئی ننگا تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پہلے اُسکو دو۔ وہ حقدار ہے ۔

چھکڑا گاڑی تم کو یہ بھی نصیحت کرتی ہے کہ اسکا سب کچھ دوسروں کے لیے ہے اپنے واسطے وہ ایک بوند بھی گھر لیکر نہیں جاتی ۔

پسینہ

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

گرمی کے موسم میں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ دھوپ میں باہر نکلو تو دماغ پکنے لگتا ہے گھر میں بیٹھو تو پسینہ چلا آتا ہے۔ جس سے کپڑے تر ہو جاتے ہیں اور ان میں بساندی بساندی بو آنے لگتی ہے ۔

جانتے بھی ہو پسینہ کیا چیز ہے۔ یہ تمہارے بدن کی زکوٰۃ ہے اے میاں گرمی کا موسم بھیجکر آدمی کے بدن کا وہ میل کچیل جو مسامات اور کھال کے نظر نہ آنے والے چھوٹے سوراخوں میں ہوتا ہے پسینے کے پانی سے دھو دیتے ہیں۔ پسینہ ایک طرح کی بھاپ ہے۔ جو گرمی کے اثر سے بدن کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور پسینہ بنکر بہ جاتی ہے۔

پہاڑوں اور بعض ملکوں میں گرمی کا موسم نہیں آتا تو وہاں کے رہنے والے حمام میں جاکر بناوٹی گرمی سے پسینہ نکلواتے ہیں کیونکہ پسینہ آدمی کے تندرستی کیلئے بہت ضروری

چیز ہے +

پسینہ اللہ میاں کی بڑی نعمت ہے۔ غریب لوگ گرمی کے موسم میں دن بھر جنگلوں اور بازاروں میں محنت اور مزدوری کرتے ہیں اور ہر وقت پسینے میں شور بور رہتے ہیں۔ مگر جب شام کو اپنے گھر جاتے ہیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محنت اور پسینہ سے ان کے بدن کی ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ امیر لوگ خس کی ٹٹیاں لگاتے ہیں۔ پنکھے جھلواتے ہیں اور ہر وقت ہائے گرمی ہائے گرمی پکارتے رہتے ہیں۔ جب شام ہوتی ہے تو اُن کے چہرے پر اُداسی اور پریشانی چھائی ہوتی ہے کیونکہ پسینہ آنے اور بیکار پڑے رہنے سے ان کے بدن کا میل بدن کے اندر رہتا ہے۔ اس واسطے یہ بیچارے ہمیشہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں اور رات کو اُس چین سے پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے جیسے تھکا کا آدمی غریب مزدور سوتا ہے +

اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ جس طرح موسم کی گرمی پسینے کے ذریعہ بدن کے میل کو دور کرتی ہے اسی طرح انسان کی روح پر چھایا ہوا میل نماز روزہ زکوٰۃ سے دور ہو جاتا ہے قاعدہ ہے کہ جب پسینہ آتا ہے تو آدمی کا جی بہت گھبراتا ہے۔ ایسے ہی نماز کی محنت۔ روزے کی مشقت اور زکوٰۃ کے خرچ سے پہلے پہل تو انسان کو ذرا تکلیف ہوتی ہے مگر جب روح کا میل صاف ہو جاتا ہے تو ایسی خوشی ہوتی ہے جس کی کوئی حد نہیں +

لہٰذا اے اخبار توحید کے پڑھنے والو! آنے والے موسم گرما کو خدا کی نعمت سمجھو جو غریبوں کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اور پسینہ کی قدر کرو۔ اور روح کا میل کچیل دور کرنے کے لیے نماز پڑھو۔ روزے رکھو۔ زکوٰۃ دو تاکہ خدا کے گھر جا کر آرام سے رہو +

پاؤں کا جیل خانہ

(از اخبار توحید ۱۹۱۲ء)

لوگو! میں ایک آزاد جنٹلمین کا پاؤں ہوں۔ مجھکو صرف صبح کے وقت غسل دیا جاتا ہے اس کے بعد سوتی۔ یا اونی ریشمی قبا پہنائی جاتی ہے۔ جس کو جراب کہتے ہیں۔ اس وقت میں خوش ہوتا ہوں کہ ایک امیر اور خوشحال آدمی کا پاؤں بنا۔ جو یہ لباس میسر آیا۔ غریب کا پاؤں ہوتا تو کیچڑ میں۔ کانٹوں میں۔ دھوپ کی تپتی جھلستی زمین پر چلنا پڑتا۔

لیکن جب مجھکو بوٹ کے جیل خانے میں ڈالا جاتا ہے تو بہت پریشان ہوتا ہوں۔ اپنی عارضی خوشی پر نفرین کرتا ہوں۔ مگر جنٹلمین نہایت بے پروائی سے مجھکو قفس چرمی میں بند کر دیتا ہے اور مجھ پر زور دیکر کھڑا ہوتا ہے تو لیکچر دیتا ہے کہ اے لوگو! آزادی حاصل کرو۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ اس وقت بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ زبان ہو تو کہوں کہ تیری آزادی کا دعویٰ جھوٹا ہے تو نے ٹھنڈے اور گورے ملکوں کی تقلید میں جہاں بوٹ پہننا ضروری ہے ہندوستان میں رہ کر خواہ مخواہ اسکو پہنا۔ اور اپنے جسم کے ضروری حصے کو قید کر کے "پابند" ہو گیا۔ اب آزادی کیسی؟ آزادی جب تھی کہ دیسی جوتا پہنتا۔ پانچوں وقت کی نماز کے وقت پاؤں کو دھوتا۔ اور ہندوستانی شریفوں کی محفلوں۔ مسجدوں میں بے روک ٹوک جاتا۔ اب بوٹ اتارنے کی مشکل کے سبب سب سے محروم ہے۔

سوئی کی لن ترانی

(از اخبار توحید ۱۹۱۲ء)

کہا جاتا ہے کہ جب قلم دوات [illegible] کاغذ کی سیاہی پر طبیعت میں بند سوئی نے اپنا نوکدار منہ باہر نکالا اور کہا

کون کہتا ہے انگریز ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ یہ ملک میرا ہے۔ اس کے رہنے والے میری رعایا ہیں۔ آیندہ کوئی شخص میرے سوا کسی کو یہاں کا تاجدار نہ کہے نہ سمجھے نہ مانے ورنہ سزا دی جائے گی۔

انگریزوں کا اور میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ جہاں میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہیں یہ پیدا ہوئے ہیں۔ تو اس کے لیے اتنا ہو سکتا ہے کہ میں ان کو اپنی دوسری ہندستانی رعایا کے مقابلہ میں کچھہ امتیاز دیدوں لیکن ناممکن ہے کہ ان کے دعوائے ہمسری کو برداشت کیا جائے۔

سب لوگ میرے محتاج ہیں۔ میں نہ ہوں تو گورے کالے ننگے پھریں۔ یا درخت کے پتوں سے اپنا بدن چھپائیں۔ میرا ہمجنس لوہا سوت کاتتا ہے۔ کپڑا بنتا ہے اور میں اسکو سیتی ہوں۔ عزت مجھ سے ہے۔ حرمت مجھہ سے ہے۔ اور راحت مجھ سے ہے۔

جب میں پہلے پہل اس ملک پر حملہ آور ہوئی تو دیسی سوئیوں نے جو کچی ہتیں میرا سامنا کیا۔ مگر میں نے اُن کو زک دی اور نا پید کر دیا۔

آج میری وہ شان ہے کہ اگر انگریزوں کو اور سب یورپ والوں کو بلکہ سب انسانوں کو نیچا دکہانا چاہوں تو دکہا سکتی ہوں۔ اور ننگا دُھڑنگا پھرا سکتی ہوں۔

دیسی کالے بائیکاٹ کا نام لیں تو میں اُن کا بائیکاٹ کرکے حیران پریشان کر سکتی ہوں۔ جب وہ جوش کے مارے آپے سے باہر ہوں اور میں ذرا کے ذرا اپنا منہ چھپا لوں تو نشہ ہرن ہو جائے۔ اور "الٹے سوئی" "ہائے سوئی" کا غل مچنے لگے۔ ہندوستان سوئی سوئی کا محتاج ہے آواز آنے لگے۔

لہٰذا میں اعلان کرتی ہوں کہ کوئی آدمی دم نہ مارے اور چپ چاپ کام کرتا رہے کیونکہ تاج میرا۔ کاج میرا۔ راج میرا۔

فُٹ بال

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

بیچاری گیند میدان فٹ بال میں کھیلنے والوں کی کس طرح ٹھوکریں کھا رہی ہے بڑا ترس آتا ہے۔ چمڑے کا بوٹ چمڑے کی گیند کو ٹھکراتا ہے۔ وہ بھاگتی ہے تو یہ پیچھے دوڑتا ہے۔ ایک طرف سے بچتی ہے تو دوسرا حریف سر پر آتا ہے۔

اس گیند کے اندر ہوا بھری ہوتی ہے۔ اگر ٹھوس ہوتی تو کس کی مجال تھی جو یوں سر بازار ٹھوکریں مار سکتا۔

آدمی کو دیکھو جس کا باطن ایمان حق سے بھرا ہوا ہو اُس کو کسی کا خوف نہیں رہتا مگر کھوکھلے ضمیر والے ہمیشہ گردش ایام کے بوٹوں سے ٹھکرائے جاتے ہیں۔

فٹ بال بڑا اچھا کھیل ہے۔ گرمی کے موسم میں شام کے وقت دیکھا ہوگا۔ نوجوان اس سے جی بہلایا کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ورزش ہے جس سے ہاتھ پاؤں اور بدن میں چُستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔

اگلے زمانے میں کبڈی کا کھیل تھا جس میں سانس روک کر دوسرے فریق کے پالے میں کبڈی کبڈی کہتے ہوئے جاتے تھے۔ اب کبڈی کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ کبڈی میں فٹ بال سے بڑھکر فائدے تھے۔ اول تو یہ کہ سانس کے روکنے اور دوڑنے سے پھیپھڑہ مضبوط ہو جاتا تھا۔ دوسرے گیند خریدنی نہ پڑتی تھی۔ تیسرے فٹ بال کی وردی اور ایک خاص قسم کا جوتا نہ لینا ہوتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ دسویں پندرھویں دن گیند خراب ہو جاتی ہے۔ جوتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور غریب ہندوستانی ولایت والوں کی جیب میں چاندی کے سکے ڈالکر چمڑے کے چند ٹکڑے دوبارہ خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں

بھائی آپ ایسے کھیل کو دسے سلام جس سے ملک کی دولت برباد ہوتی ہو۔ گھر پھونک تماشا اچھا نہیں ٭

ہاتھ کی بغاوت

سالن کی آزادی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

میرا ہاتھ سالن کی پیالی میں جانا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے پیالی کی اونچی اونچی دیواروں سے دم گھٹتا ہے۔ شوربے اور بوٹی قتلے کے قید خانے میں نہیں جاؤں گا۔ مجھ کو انگریزی پلیٹ چاہیئے۔ جہاں سالن کو آزادی ہے۔ بوٹی الگ نظر آتی ہے۔ قتلہ جدا معلوم ہوتا ہے۔ شوربا اپنی شان علیحدہ دکھاتا ہے۔ ہاتھ کو اختیار ہے۔ پلیٹ کے کھلے میدان میں جس طرف چاہے جائے۔ پیالی میں انگلیوں کو غوطے مار مار کر بوٹیاں نکالنی پڑتی ہیں ٭

الٰہی خیر ہاتھ ہی باغی ہوگیا تو پیٹ بھوکا مر جائے گا۔ اسکو سمجھاؤ اور کہو دیوانے غریبوں میں پیدا ہوا ہے غریبوں کی سی باتیں کر۔ ہمارے ہاں کبھی پلاؤ زردہ کھلی قاب اور سینی رکابی میں ہوتا ہے۔ مگر دال اور غریبانہ سالن پیالی کی دیواروں کے پردہ میں اچھا۔ پردہ سے باہر آنا آبرو میں بٹہ لگائے گا۔ انگریز ملک کے بادشاہ ہیں دولت و حشمت ان کی غلام ہے۔ وہ تربتر کھانے کھاتے ہیں۔ اس لیے کھلی رکابیاں اُن کو زیبا ہیں۔ تو مفلس کنگال اُبالی دال کھانے والا۔ تجھ کو یہ فضول خرچیاں مناسب نہیں جبتک پلاؤ زردہ میسر نہ آئے صبر شکر سے پیالی پر گزارہ کر۔ آج تو بغاوت کرتا ہے کل عورتیں سرکشی اختیار کرینگی کہ ہم کو بھی پردہ سے نکالو۔ اسوقت کیا ہوگا اب تو پردہ میں بیٹھے

پرانے پیوند لگے کپڑے چھپے ہوئے ہیں، پردہ نہ رہا تو ملک کا سارا بھرم کھل جائیگا اور غریب شوہر اچھے کپڑے بناتے بناتے پاگل بن جائیں گے۔ نادان بات کو سمجھ اور دوسروں کی ریس چھوڑ +

پیاسے گلے پر چھری

حاملہ کا قتل

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

مسلمان کہتے ہیں۔ بلغاریوں اور سردیوں نے ترکی عورتوں کو اُن کے بچوں کے سامنے قتل کیا۔ انگریز کہتے ہیں کہ غدر میں ہندوستانیوں نے اُن کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ فقیر کہتا ہے کہ اُس بے زبان جانور کو بھی کسی نے دیکھا جس کا نام بکری ہے۔ جو شہروں کے قتل خانوں میں ہزاروں بھوکی پیاسی بے دردی کی چھری سے ذبح ہو جاتی ہیں تم اپنی بیوی بچوں کو لیکر خوش خوش آراستہ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہو تمہارے سامنے قلیہ۔ قورمہ۔ کوفتے۔ پسندے کی قابیں ہوتی ہیں۔ ہاتھ بڑھاتے ہو مظلوم بوٹیوں کو دانتوں سے بھنبھوڑتے ہو۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ گوشت کہاں سے آیا اور کیونکر آیا +

کسی دور کے گاؤں سے بکریوں کا ریوڑ چلا۔ مئی کی دھوپ ان کے سر پر تھی۔ بیچاریاں دن بھر کی منزلیں طے کر کے شام کو شہر میں پہنچیں۔ جلادوں نے ایک تنگ مکان میں بند کر دیا۔ اور وہ ہستیاں جنکو دیہات کے کھلے میدانوں میں رہنے کی عادت تھی شہر کے تیرہ و تار یک جیل خانہ میں بھوکی پیاسی مقید رہیں۔ صبح کو مقتل کی

بلائے ہوئی دیسی ڈاکٹر کی نظر طماع نے ایک سرسری معائنہ کیا لیکن دہن کے خفیہ اشارے
ہوئے۔ اور ناتوان مظلوم قیدی جن کی زبانیں پیاس کی شدت سے نکلی پڑتی تھیں جو
حسرت اور مایوسی سے اپنے جلادوں کو دیکھکر رحم کی درخواست کرتے تھے ڈنڈوں
اور لاتوں کے زور سے کان اور دُم کھینچ کھینچ کر قتل گاہ میں پہنچائے گئے جہاں جلاد
چھُری تیز کیے بغیر بے پروائی سے آستینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ اُن میں ایک بکری حاملہ
تھی اُس کو دو قدم چلنا دوبھر تھا۔ وہ ظالموں کی لاتوں سے حواس باختہ تھی۔ دم چڑھا
جاتا تھا۔ مُڑ مُڑ کر دیکھتی تھی کہ کوئی خدا کا بندہ ترس کھائے اور پیٹ میں بچہ رکھنے
والی کو موت سے بچائے۔ وہاں کون سُنتا تھا سب کے کلیجے پتھر کے تھے کسی نے رحم
نہ کیا یہاں تک کہ سب کے ساتھ وہ بھی مقتل کی زمین پر پچھاڑی گئی۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو
تھے پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس نے
چھُری کو دیکھا اور سمجھی کہ اب اس کی دھار پانی پلائے گی۔ آخر یہی ہوا جلاد نے گلے
کی کھال پر چھُری رکھدی۔ حاملہ بکری نے کانپ کر اور لرز کر ایک دفعہ چیخ ماری۔
چھُری نے اُس کے بالوں کو کاٹا۔ کھال کو کاٹا۔ رگوں کو کاٹا۔ اور ہڈی کے پاس جا کر دم
لیا۔ خون کے فوارے اُبلے۔ ہاتھ پاؤں سے دم کھینچنا شروع ہوا۔ بیجان لاش چند منٹ
تڑپی اور ٹھنڈی ہوگئی۔ اس کے بعد لاش کھینچی گئی۔ پیٹ چاک کیا گیا اور وہ بچے
نکالے گئے جو مرنے والی کے پیٹ میں تھے۔ اُس وقت سفاک جلاد سے اتنا کہا
اوہو یہ گیا بھن تھی۔ بچوں کو جلدی سے چھپانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اب قانون
کی گرفت کا ڈر تھا۔ اس گوشت کے ٹکڑے پارچے ہوئے۔ کوئی حصہ قلیے کے کام
آیا۔ کوئی قورمے میں بھُنا۔ کسی کا قیمہ بنا۔ پسندے کوٹے گئے۔ کسی کو کوفتے کی کوفت
اُٹھانی پڑی ؛

یہ ہے تمہارے دستر خوان کی بہار جس کو فخر اور گھمنڈ سے کھاتے ہو دیکھا چکھوگے

تو اخباروں میں بلقانی سقائیوں پر مضمون لکھو گے۔ اور خیال کرو گے کہ تم نے قوم کا ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ ہاں بے شک تم نے فرض ادا کیا ہے تمہاری تعریف کرنی چاہیے لیکن یہ فرض خود غرضی کا فرض تھا۔ ورنہ تم ان بے زبان ہستیوں کا بھی خیال کرتے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم ذبح خانوں کی نگرانی پر زور دیتے۔ اور پبلک سے کہتے کہ وہ بے زبان جانوروں کی خبرگیری کا انتظام کریں۔ اس میں تم پر بغاوت کا الزام نہ لگتا۔ اگر تم لکھتے کہ جن پر چھری چلائی جائے ان کو پانی پلا دینا چاہیے۔ ان کو حبس بیجا میں نہ رکھا جائے۔ گیا بھن اور حاملہ کی تحقیق خاص طور پر ہو اور جو لوگ اس کے خلاف کوئی حرکت کریں ان کو عبرتناک سزائیں دی جائیں مگر تم سب (جن میں راقم فقیر بھی شامل ہے) دوسروں کو کہتے ہو اپنی خبر نہیں لیتے۔ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین تم سب سے اس کا جواب طلب کرے گا۔

میں جانتا ہوں کہ جانور ہمارے لیے حلال کیے گئے ہیں بے شک تم ان کا گوشت کھا سکتے ہو۔ مگر ان سقائیوں کی کسی مذہب نے اجازت نہیں دی خصوصاً اسلام نے ان ناروا ظلموں کو نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

حضرت خواجہ اجمیری کے غلاموں کو چاہیے کہ وہ اپنی صوفیانہ نرم دلی کو کام میں لائیں اور ہر شہر میں ایسی انجمنیں قایم کریں۔ جن کے ممبر روزانہ صبح کے وقت ذبح خانوں میں جا کر۔ حاملہ۔ بیمار۔ کمزور۔ کم سن۔ بھوکے پیاسے جانوروں کو ذبح ہونے سے بچائیں۔ اور اس کا خیال رکھیں کہ ایک جانور دوسرے کے سامنے ذبح نہ ہو۔ چھریاں تیز کر لی جائیں تاکہ ذبح کے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اگر آپ ایسا کرینگے تو مظلوم اور غریب نواز خواجہؒ اور حضرت رب العالمین کی خوشنودی حاصل کریں گے۔

تخت گاہ کے ایک تختہ کا پیام

وائسرائے کے نام

(از زمیندار۔ جنوری ۱۹۱۳ء)

مائی لارڈ ہارڈنگ! ۱۹۱۲ء جاتا ہے اور تم آتے ہو۔ بارہ مہینے پہلے ان ہی دنوں میں تم اور یہ ۱۹۱۲ء ایک گاڑی میں سوار ہو کر خبر دینے آئے تھے کہ دہلی برٹش راج کا پایہ تخت بن گئی ۔

اب تم دسمبر میں بحیثیت نائب السلطان مستقل سکونت کے ارادے سے دہلی میں داخل ہوتے ہو اور تمہارے ساتھ ساتھ ۱۹۱۲ء کے بدلے ۱۹۱۳ء پہلو میں بیٹھا نظر آتا ہے ۔

گورے ملک کے وہمی ۱۳ کے عدد سے بدشگونیاں لیتے ہیں۔ مگر ہم کالوں کے خیال میں یہ خام خیالیاں ہیں۔ تمہارا اور تمہاری حکومت کا بول بالا ہوگا۔ اور تیرہ کا عدد منحوس نہ رہے گا ۔

لاٹ صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا بدل رہی ہے۔ ہر وجود تغیر و انقلاب کے میدان میں دوڑا چلا آتا ہے۔ زمانہ نے تمام کائنات کی چھوٹی بڑی اشیا میں حرکت پیدا کرکے اُن کی کایا پلٹنے کا سامان کیا ہے ۔

مگر فقیر نہیں جانتا کہ خلقت کا یہ کہنا سچ ہے یا جھوٹ جھوٹ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اور تمہاری حکومت کے اکثر بڑے بڑے آدمیوں نے بارہا یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب برپا ہے اور حالات و کیفیات میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ ہر قدیم ہستی جدت کا جامہ پہن رہی ہے ۔

سچ یوں نہیں مان سکتا کہ تم سب کی یہ باتیں نیچرل مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ یاد ہو گا کہ گذشتہ دسمبر میں بھی سردی تھی۔ آسمان کا رنگ نیلا۔ رات کالی۔ دن اُجلا۔ اور ہوا ٹھنڈی تھی۔ اور آجکل بھی وہی سماں ہے۔ تارے نکلتے ہیں۔ چاند گھٹتا بڑھتا ہے۔ سورج طلوع و غروب کے دور میں پھنسا ہوا ہے۔ اس زمانے میں بھی انسان رات بھر سوتے اور دن بھر جاگتے تھے۔ کانوں کا کام سُننا۔ آنکھوں کا دیکھنا۔ ناک کا سونگھنا اور زبان کا بولنا تھا۔ غذا چبا کر کھائی جاتی تھی۔ اور ہاں غذا کی جتنی مقدار سے پہلے پیٹ بھرتا تھا اب بھی اُتنے ہی نوالے درکار ہیں۔ اس میں ذرہ بھر فرق و تفاوت نہیں ہوا۔ پھر تغیر و تبدیلی کس چیز کا نام ہے

یہ تو نہیں کہ اگلے وقتوں میں پانی۔ مٹی۔ لکڑی اور تانبے کے پیالوں میں پیا جاتا تھا اب شیشے کے گلاس چل گئے ہیں۔ اُس وقت زمین پر بیٹھ کر روٹی کھائی جاتی تھی اب میز کرسی کا رواج ہے۔ اُن دنوں اونٹ بیل گھوڑے کی سواریاں تھیں آجکل ریل موٹر کار ٹرام کا زور ہے اگر اس کا نام زمانہ کی تبدیلی ہے تو میں ان کو نہیں مانتا۔ کیونکہ میرے نزدیک تبدیلی جب ہوتی کہ بغیر پانی کے پیاس بجھ جاتی۔ کھانے کی خواہش جاتی رہتی۔ نقل و حرکت کے واسطے ریل اور موٹر کار کا محتاج نہ رہنا پڑتا

میرے پیارے جارج سلطان کے قایم مقام تم پر سلام۔ ذرا سُننا اُس دِلی کے در دیوار کیا پیام دیتے ہیں جس میں قدم رکھتے ہو وہ کہتے ہیں

ہارڈنگ بابا کی خیر۔ تخت گاہ کے ایک تختہ کی دعا لیتا جا۔ بھلا ہو گا۔ شاد رہ۔ آباد رہ تیری اُمیدوں کا چمن پھلے پھولے۔ تیرے ارمانوں کا تختہ سرسبز و شاداب ہو

دُنیائے فانی میں جی نہ لگا۔ اس خاک پر ہزاروں دفعہ کرنوں اور شعاعوں کے ہجوم میں جھومتے جھامتے سورج کے جلوس نکلتے ہیں مگر شام کو ان کی روشنی ہمیشہ ناپید ہو گئی ہے اپنے فرض کو پہچان۔ جس طرح سورج خلقت کی فائدہ رسانی کے خیال میں اپنی

آن بان اور شکل و صورت کو نہیں دیکھتا اور دن بھر خدا کے بندوں اور اُسکی تمام مخلوقات پر نعمتوں کا مینہ برساتا رہتا ہے تو بھی اے اُس بادشاہ کے نائب جس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا ان ظاہری کھیل تماشوں میں مشغول نہ ہو۔ اور رحم و انصاف کی طرف توجہ کر۔

ان ہاتھیوں سے جن پر تو سوار ہے تیری ذمہ واریاں یادہ بوجھل ہیں۔ توقع نہ رکھ کہ رعیت تیرے آگے جھکتی ہے یا نہیں۔ تیرے احسان کا بوجھ اُن کی گردن کو جھکائے۔ تیری انصاف کاریاں سب کے سروں کو خم کرائیں تو بات ہے۔

آج وہ دن ہے کہ دہلی ظاہری اور نمائشی شان و شوکت کے بدلے باطنی اندرونی دبدبہ و تمکنت کی خواستگاری کرتی ہے۔ پایہ تخت کی خشتی و سنگی عمارات کے ساتھ باشندوں کے دلوں میں محبت و اُلفت کی بنیاد بھی رکھ۔ تاکہ انگریزی تاج کے ہیروں کو اصلی درخشانی نصیب ہو۔ اور دکھائے کہ تو اُس خدا کا سچا اور نیک بندہ ہے جس کی مندر مسجد اور گرجا میں عبادت کی جاتی ہے۔ مسجد و گرجا کی نماز میں شریک ہو۔ مندر کے ناقوس اور شوالے کے گھنٹے سے ہمنوائی نہ کر۔ مگر اے خدا پرست ہندوستان کے مجازی بادشاہ اپنے دلکو ہر وقت شہنشاہ حقیقی کی بازپرس سے خبردار کرتا رہ۔ بھول مت یاد رکھ تاکہ تیری اور انگریزی قوم کی یاد ہمیشہ نیکی سے برقرار رہے۔

در کارہائے مستانہ چند

(از خطیب ۳۰ اپریل ۱۹۱۱ء)

ہوش سے بیگانے چند۔ دین کے دیوانے چند۔ در کارہاے مستانہ چند۔ ترک خانہ کر بیٹے میخانہ میں رہتے۔ جام کو نظر لگائیں۔ ہاتھ اور منہ کو سجائیں۔ زخموں کے تمغہ

نوچیں۔ اور مرہم والوں کو دکھائیں "

بھوک جن کی دائی ہو۔ پیاس جن کی مائی ہو۔ بے سروسامانی جن کی ماں جائی ہو۔ وہی درکار ہیں۔ وہی اس میدان کے شہسوار ہیں "

لوگ کہتے ہیں کہ یکتائی اور توحید کی آواز آندھی کے شور میں دُنیا تک پہنچاؤ۔ مجھے وہ چاہیئے جو کہے کہ پیاری گھٹا کی بوندوں میں اس لیلیٰ کا محمل بناؤ۔ جرس بجاؤ۔ گھر گھر پہنچاؤ۔ سوکھی زمین سوندھی خوشبو سے مہک اُٹھے۔ گھر والے مستی میں آئیں جھولے ڈالیں گائیں بجائیں۔ آندھی ہوگی تو کواڑ بند کیے جائیں گے۔ آنکھ۔ ناک۔ کان کو ڈھکا جائے گا۔ پھر کیا خاک توحید بتانے کا مزا آئے گا "

انگریز کا لندن ہو یا ہند کا نندن۔ برما کا رنگون ہو یا نجد کا مجنوں سب کو پریم نگر لے جانا ہے۔ وحدت کی سیج پر سُلانا ہے۔ مگر یہ لڑنے جھگڑنے کی سند نہیں تو تکار چیخ پکار سے حاصل نہیں۔ جو لوگ مناظرہ کی تلوار سے لڑتے ہیں اور اسپر ہادی مہدی بنتے ہیں اُنہوں نے کتنے کافر مُسلمان کیے اُن کے آگے کس قدر مُنکر گردنیں خم ہوئیں تجربہ کہتا ہے ایک بھی نہیں۔ بلکہ انکار بڑھا۔ ضد زیادہ ہوئی۔ بگاڑ کی دیواریں اونچی ہو گئیں۔ نہ عیسائی نے مانا نہ موسائی نے۔ نہ ہندو نے تسلیم کیا۔ نہ آریہ نے۔ نہ سکھ قائل ہوئے نہ پارسی گھائل ہوئے۔ ہاں چرچے بہت رہے۔ روپے جیبوں سے نکل کر ادہر سے اُدہر اور اُدہر سے اِدہر آتے جاتے رہے۔ دسترخوان پر کھانے ہی رنگ برنگ کے آئے نوالے بھی نرم گرم چکنے چپڑے دانتوں پر چڑھے اور معدے میں اُترے لیکن دل و جان توحید کا ارمان نہ نکلا۔ نہ اسکو کسی نے دیکھا نہ وہ کسی کو دیکھ سکی۔ ہر سکھی کھڑی تکتی رہی کہ پیا کا اشارہ پاؤں تو الیلی کو مسند پر لاؤں "

جب ہی تو کہتا ہوں۔ ایسے دیوانوں کو بُلاؤ۔ مستانوں کو پُکارو۔ جو انجمن طلبگار اسلام کے نوکر ہوں۔ جو اپنے مطلوب کی چشم پوشی رضا کو تنخواہ بنائیں کفنی پہنیں ادہر اُدہر جئیں۔

شام کی مرلی بجائیں۔ گھر گھر دہائی مچائیں۔ روتوں کو ہنسائیں۔ ہنستوں کو رلائیں۔
پوچھو ان کا ذکر کس اخبار میں چھپے۔ کہو جریدۂ سکوت میں۔ دریافت کرو ان کا خیر مقدم کیونکر ہو۔ جواب دو کس مپرسی سے نہ کوئی ان کو جانے۔ نہ وہ کسی کو جانیں بس ایک جاناں کی دید ہو۔ اسی کی گفت ہو۔ اسی کی شنید ہو۔ تب دیکھنا ہر گھر میں ہولی دوالی ہر گھر میں عید ہو۔

اسلام غیر نہیں۔ ہر آدمزاد کے لیے خیر ہے۔ اس کو زہر نہ بناؤ۔ خود شکر بنو۔ اسلامی شیر میں گھل کر فنا ہو جاؤ۔ تب مزے لیکر لوگ پئیں گے۔ کیا لیکچروں اور مباحثوں کے قم سے مردے جئیں گے۔

تمہاری مسیحائی خود بینائی کی محتاج ہے۔ اندھوں کو نہ بلاؤ پہلے اپنی آنکھیں بنواؤ۔

سُننا مجھے کس نے پکارا۔ رنگون میں آؤ۔ اور برما کو مسلمان بناؤ۔ ذرا لکھدینا کلمہ یاد کر رہا ہوں۔ اور کلمے والے کا دل شاد کر رہا ہوں۔

ابھی خود مجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اس اونچے لا کو کیوں کر عبور کروں۔ اس پہاڑ سے اُتر لوں تو دامنوں کو سمیٹ کر اِلّا اللہ کا نعرہ بلند کرونگا۔

مگر ہاں میں نہیں تو کیا اور بھی نہیں۔ بہتیرے مستانے دیوانے موجود ہیں گدگدانے کی دیر ہے۔ کلبلانے والے نکل ہی آئیں گے۔

تو ہاں انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ کہ جو گھر بار سے آزاد ہوں۔ وہی میدان میں آئیں تو برما چلیں جنگل میں منگل رچائیں۔ درختوں کے سایہ میں بسیرا جمائیں۔ ملے تو کھائیں نہیں تو مگن ہو کر سو جائیں۔ عبادت رب ان کا شعار ہو۔ پھر چھوٹا بڑا اونے اعلےٰ ان کا یار ہو۔ برمی زبان آتی ہو تو واہ ہے۔ ورنہ نظر عشق کی زبان سب سمجھتے ہیں۔ اسی میں بات چیت ہو۔ کوئی دس بولے تو وہ ایک اشارۂ ابرو سے سب کا جواب دیں۔

پانچ وقت کی نماز حلقۂ ذکر و شغل ما سوا کی ضرورتوں سے بیخبری اور ذات الٰہی پر توکل کوئی بیمار ہو تو اُسکی خدمت کریں۔ اپنے دُکھ کی جگہ اُس کا دُکھ سمجھیں۔ دو جسم ایک جان بن جائیں۔ کسی کے کانٹا لگے تو اپنی پلکوں سے نکالیں۔ کوئی ترشی سے پیش آئے تو یہ اپنے اخلاق کی مٹھائی اُسے کھلائیں۔ بات میں سچ ہو حرکات میں سچ ہو۔ غرض جو چیز ہو صداقت و راستی کی تصویر ہو۔ پھر دیکھو کہ کیوں نہ ہر بری کا دل زلف اسلام میں اسیر ہو۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہم روپے دیا کرتے تھے اب بھی دینگے۔ ذرا ورے کو آئیں میں ان کا منہ چوم لوں۔ اور ہو سکے تو ان کے خیال کو بھی بوسہ دوں کہ کار خیر کے لیے روپے جیسی دلنشین چیز کو اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔

مگر دلدار من۔ یہ کوچہ دوسرا ہے۔ یہاں روپے کی ضرورت نہیں۔ نہ انجمن سازی کی۔ نہ غل شور کی۔ نہ ہما ہمی کی۔ یہاں تو بس پھٹے پُرانے کپڑے پہننے والے یا چاک گریباں متوالے کام کر سکتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈو اور پہلے اپنے رنگوں کے مسلمانوں کو مسلمان بنانے میں بھولا۔ اُن کو یہ بتاؤ کہ وہ مسلمان ہیں اور ایک شرمیلے سجیلے سلطان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ جو کھجوروں کے جھنڈ میں اپنی پیاری بکریوں کو جنگل کے پتے کھلاتے تھے اور دیکھنا لمبے لمبے بال شانوں پر ڈالے سورج سے آنکھ لڑاتے تھے۔ لکڑی پر سہارا دیکر کھڑے ہوتے اور کہتے۔ کھاؤ میری بکریوں۔ کھاؤ میری پیاریوں۔ میں تمہاری چوکسی میں کھڑا ہوں۔ کوئی دشمن تمہارے پاس نہ آنے پائے گا۔

اور ہاں وہ جو حرا نامی غار میں جاگتے تھے۔ اور اُمت کے ہونے کا سامان کرتے تھے۔ اور وہ جو راتوں کو کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے اور رخساروں پر آنسو بہاتے اور فرماتے الٰہی میری اُمت کو ہنسا رکھیو اور وہ جو آج بھی آٹھویں دن تمہاری رپورٹ

سُنتے ہیں اور جب کوئی بُرائی پاتے ہیں تو اُس کو چھُپاتے ہیں اور دل ہی دل ہیں فرماتے ہیں۔ کاش میرے پیارے تو ایسا نہ کرتا۔ اے میری اُمت کہلا کر جھوٹ بولا۔ دیکھ فرشتے مجھ پر ہنسیں گے۔ ارے مجھ سے منسوب ہو کر شراب پیتا ہے زنا کرتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ دل جان میرا کہنا مان۔ ان سب کو چھوڑ میرا بن۔ دیکھ تیرے سبب مجھ کو شرمانا پڑتا ہے فرشتوں کے سامنے نظریں نیچی ہوتی ہیں۔ تو میرا ہو کر میری آبرو نہیں بچاتا +

یہ سُنیں گے تو رنگون کے مسلمان اصلی مسلمان بنیں گے۔ اور جب اسلام اپنی اصلی حقیقی شکل میں نمودار ہو گا تو ہر وجود غیر مسلم اس کا شیدا و طلبگار ہو گا +

مگر کہنے کو سب یہی کہتے ہیں جو میں نے کہا ضرورت کرنے کی ہے جو عمل کی بولتی تصویر ہو۔ اور عمل کی تکمیل بغیر ترک تعلقات ماسوا اور جنون مخصوص کے محال ہے اسی واسطے تو اس مضمون کے دروازہ میں میں نے پہلی صدا یہ لگائی تھی :-

درکار ہیں ستانے چند

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟

(از اخبار خطیب ۱۴ مئی ۱۹۱۵ء)

اگر ہوتا تو خدا ہوتا۔ جس نے سورج کی روشنی۔ دریا کا پانی۔ ہوا۔ آگ۔ مٹی۔ سب کو برابر دی تھی۔ امیر۔ غریب۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ رکھا تھا۔ مگر اس نے اپنے وجود کو مخفی کر لیا۔ ہر مخلوق کا سہارا اور آسرا بنا۔ مگر پردہ کے پیچھے رہ کر نظروں سے

پوشیدہ ہو کر۔ اور انسان بنا تھا دیدباز۔ ظاہری ذریعہ پر مٹنے والا +

اس لیے کشمکش ہونے لگی۔ کوئی بڑا بن گیا کوئی چھوٹا رہ گیا۔ کسی نے اتنی دولت پائی جس کی تاہ نظر نہ آئی۔ کوئی رات کی روٹی کو ترسا۔ اگرچہ رزق کا مینہ گھر گھر برسا +

میں نے اپنے ملک پر نگاہ دوڑائی تو ایک عالمگیر بے قراری سامنے آئی کوئی نائی کہلاتا تھا۔ پاؤں دباتا تھا۔ خوان سر پر اُٹھاتا تھا۔ حجامت بناتا۔ کمین کہلاتا۔ کوئی قصائی تھا۔ صورت آدمی کی رکھتا تھا مگر ذات میں ہیٹا مشہور تھا۔ کوئی چمار تھا۔ چمڑا تھا۔ کھٹ بنا تھا۔ غرض بڑے کم اور چھوٹوں کی بھیڑ تھی +

پوچھا۔ بھئی انسانوں میں یہ فرق کیسا؟ جواب ملا۔ قدرت کا یہی دستور ہے۔ کسی کو سنوارتی ہے۔ کسی کو بگاڑتی ہے۔ خدا نے پکارا۔ نہیں۔ تمہاری تکلیفیں خود تمہارے ہاتھوں سے ہیں۔ محنت کرو تو بڑے بنجاؤ گے۔ میرے دربار میں کسب اور کرم کی پوچھ ہے +

نائی نے کہا۔ اے خدا! آج عربی میں یہ حکم سُناتا ہے اور کل سنسکرت میں منوجی کی زبانی یہ حکم بھجوایا تھا۔ کہ برہمن میرا سر ہیں۔ اس لیے علم و عقل کا کام وہ کریں چھتری میرے بازو ہیں۔ جنگ اور حکمرانیاں ان کے حصّے کی۔ ویش میرا شکم ہیں۔ لین دین کاروبار۔ ان کے ذمہ۔ شودر میرے پاؤں ہیں۔ خدمت۔ چاکری ان کا کام۔ خود ہی ذات پات کی قید لگاتا ہے۔ پھر نئے نئے حکم تبدیلی کے سُناتا ہے

خدا نے اپنے عربی بندے سے کہلوایا۔ نہیں تمہاری سمجھ کا پھیر تھا۔ میں نے کام بانٹے تھے۔ ذات تقسیم نہیں کی۔ تم سب ایک ہو۔ بشرطیکہ نیک ہو۔ بد ہمیشہ ملک میں سب سے چھوٹا۔ نیک سب سے بڑا +

یہ باتیں سُنکر ایک خاکروب گرمی میں جھاڑو دیتے دیتے ذرا سیدھا کھڑا ہوا۔ پسینہ میں غرق۔ آنکھوں کو آسمان کی جانب اُٹھایا۔ اور کہا یہ تو بتا۔ ہمارا آسرا کون ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی۔ غلاظت اُٹھائی۔ جھاڑو دی۔ کمیٹی کے جمعدار کے ڈنڈے کھائے۔ گالیاں سُنیں۔ اب گھر جاتا ہوں۔ میلی کوٹھری میں پڑنا ہوگا۔ جھوٹے ٹکڑے۔ سڑی بسی دال کھانے کو ملے گی۔ گرم پانی پینے میں آئے گا ۔

ادھر دیکھ۔ یہ امیر ہیں۔ رات بھر بجلی کے پنکھوں میں سوئے۔ آٹھ بجے جاگے انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ نوکروں کو صلواتیں سُنائیں ناشتہ کیا۔ بیت الخلا گئے نہائے پھر آراستہ کمرے میں آئے۔ شطرنج کا دور ہوا۔ کھانا کھایا۔ گانا سُنا۔ سو گئے۔ شام کو ہوا خوری کے لیے موٹر آئی۔ لینڈو منگائی۔ غرض کوئی گھڑی محنت و تکلیف کی نہ پائی ۔

ایک ذرہ ایک ہیں دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔

خاکروب کا شکوہ ختم نہ ہوا تھا کہ سامنے بیگاری چمار آیا۔ سر پر بوجھ۔ دھوپ میں ننگے پاؤں۔ ساتھ میں سپاہی۔ جلدی چلنے کا تقاضہ۔ اس نے دیکھا کہ خاکروب اور خدا میں گفتگو درپیش ہے تو اس نے بھی آہ کی صدا میں آمین پکاری۔ اور کہا ہے میرے باری۔ ہے میری باری۔ دو وقت سے بچے بھوکے ہیں۔ اندھی ماں بخار میں تلملا رہی ہے۔ گھر سے روزی کی تلاش میں چلا تھا کہ اِن فرشتے کے ہاتھ میں پڑا۔ اس نے طمانچے بھی مارے بُرا بھی کہا۔ اور جانور کی طرح ہانک کر خبر نہیں کہاں لے چلا ۔

اتنے میں ایک بڑھیا مالی پاس سے گزری۔ دامنوں میں سیکڑوں پیوند ٹوٹی ہوئی جوتی۔ بغل میں ٹوپیوں کی گٹھڑی۔ بازار گئی تھی۔ بیوپاری نے خریدنے سے انکار کیا اور کہا مندا ہے۔ لڑائیوں کے موسم میں کسی چیز کی نکاسی نہیں۔ حیران پریشان

گھر چلی ہے یتیم بچوں کی بھوک۔ اپنی بیکسی کا خیال کرتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو اُبلے چلے آتے ہیں ۔

دو فریادیوں کو دیکھکر وہ بھی پروردگار کی دُہائی دینے کھڑی ہوگئی ۔

تین عرضیاں گذریں تو عدالت آسمانی نے بغیر سمن جاری کیے دروازہ کھولا اور کہا میرے بندوں! مایوس نہ ہو۔ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ میرے دفتر میں امیروں کے عیش بھی لکھے جاتے ہیں۔ اور غریبوں کے مصائب بھی۔ ذرہ ذرہ اور نکتہ نکتہ پر بحث ہوتی ہے۔ اس دُنیا میں بھی عوض ملتا ہے اور آخرت کے واسطے بھی معاوضہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ بے انصافی نہ ہوگی۔ جس کو یہاں نہیں ملا اُسکو وہاں ملیگا۔ اور جو یہاں پاچکا اُسکو وہاں کچھہ نہیں ۔

فریادیوں نے کہا ہمیں محنت اور مفلسی کی شکایت نہیں۔ شکوہ اسکا ہے کہ امیر ہم کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ پاس نہیں بٹھاتے۔ بات نہیں کرتے۔ آدمی نہیں سمجھتے۔ ستاتے ہیں۔ ٹھکراتے ہیں۔ اور بعضے ہمارے سایہ تک سے کتراتے ہیں ۔

یہ سُنکر آسمان لرزنے لگا۔ ہوا سہم کر دم بخود ہوگئی۔ فرشتوں نے کچھہ اشارے پائے دوزخ کے انگارے اُٹھائے۔ دوزخ بھی چیں بہ جبیں ہوئی۔ سانپ بچھوؤں کو یورش پر آمادہ کیا۔ جنت نے دروازے بند کیے ایسے امیروں پر حرام کے بورڈ لگائے۔ آسمان چہارم پر جناب مسیح نے سُنا۔ غیرت خداوندی کو جوش میں دیکھا۔ تو وہ بھی تھرائے مگر خیر ہوئی کہ اُن کی اُمت کی مکتی فوج دلاسہ کو دور کھڑی نظر آئی۔ جس نے ہزاروں غریبوں کو سہارا دیا تھا۔ تاہم وہ دوڑے کہیں آج ہی یہ سوال نہ ہو جائے کہ کیوں جی تم نے ان سے کہا تھا کہ مجھہ کو خدا کا بیٹا کہنا۔ اُسوقت کیا جواب دوں گا۔ شرم کے مارے گردن جُھک جائے گی۔ غریب پروری کی۔ مگر خدا کے رستہ سے کھٹکا دیا ۔

زمین پر جب غضب الٰہی کی شعاعیں نمودار ہوئیں بصیرت والے گھبرا گئے امیرو اور خود سروں مغروروں پر دانت پیسنے لگے۔ کلیجے پر ہاتھ رکھکر غریبوں کی تکلیف محسوس کرنے لگے۔

یکایک حجاز سے برقابی خبر آئی۔ ایک بڑے سلطان نے ہمت بندھائی۔ لکھا تھا ان غریبوں کا آسرا میں ہوں۔ لاچاروں بے سہاروں کا سہارا میں ہوں۔ ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھی روٹی کھاتی تھی۔ خدا نے بادشاہ بنایا۔ مگر میں نے رعیت کی طرح وقت گزارا مسکینوں میں رہا۔ مسکین بنا۔ اور مسکینوں میں حشر کی تمنا کی۔

آؤ تم میرے ہو۔ تم چمار ہو یا بھنگی۔ نائی ہو یا قصائی۔ کنجڑے ہو یا جلاہے۔ پھٹے حال ہو۔ مفلس کنگال ہو۔ مگر میرے دل کی ٹھنڈک اور فرزند نونہال ہو۔ تم کو گلے لگاؤں۔ پیار کروں۔ نہلاؤں۔ پاؤں دباؤں۔ پنکھا جھلوں۔ آپ پیچھے کھاؤں پہلے تمہیں کھلاؤں۔

ارے خدا کو ایک مانو۔ اس کی مرضی پر چلو۔ پھر تم میرے راج دلارے ہو۔ آنکھوں کے تارے ہو۔ روپیہ پیسہ کیا چیز ہے۔ مجھ کو ایمان عزیز ہے۔ ایمان عزیز ہے۔ کہنا حسن نظامی سے کہنا۔ ہر دعویٰ دار غلامی سے ذات پات کی قید اُٹھاؤ۔ مغل سید پٹھان کا نام مٹاؤ۔ کمینوں کو اچھوتوں کو پاس بلاؤ۔ بیٹیاں دو۔ ساتھ کھلاؤ۔ ان کا آسرا بنو گے تو خدا کو پاؤ گے۔ ورنہ ہاتھ ملتے قبر میں جاؤ گے۔

حسن نظامی نے گردن جھکائی۔ اپنے مالک اپنے داتا کی مرضی سر آنکھوں پر اٹھائی پہلے خاکروب کے قدم لئے۔ اسکی کوٹھری میں خرقہ بچھایا۔ اور ساتھ بیٹھکر تھبوئی روٹی اور باسی دال کا نوالہ کھایا۔ میرا بھائی۔ میرا بھائی کہکر جی بڑھایا۔ پھر بیگاری چمار کے گھر پہنچا اپنا کھانا اُسکے بچوں کو بانٹا۔ اُسکی نابینا ماں کو دوا پلائی۔ اور جب تک اُس کا لال بیگار سے آتا نہ پھرا۔ اس ناچی بیمار چماری کو پنکھا جھلنے اور پاؤں دبانے سے نہ پھرا۔

برقعے والی عورت کا گھر یاد تھا۔ لوگوں سے کہا۔ اس کی ٹوپیاں خرید و۔ شریف ہے۔ خیرات نہ لے گی۔ اس کا دل نہ ٹوٹے ایسی مدد کرو۔

جہاں پناہ ہز مجسٹی۔ امپرر دو جہاں۔ خاقان الانس و الجان۔ سلطان العرب و العجم۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی گورنمنٹ ناظر غیب تھی۔ اس نیت کی کارگزاری سے مسرور ہوئی۔ سبز نشان انعام میں بھجوایا۔ اور فرمایا۔ اس کو کھڑا کرو۔ اور غریبوں سے کہو۔ یہ ہے تمہارا آسرا۔ یہ ہے تمہارا سہارا۔ یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ اس کے نیچے آؤ۔ پھر کوئی تم کو حقیر ذلیل نہ کہہ سکیگا۔ کسی کو پاس بٹھانے ساتھ کھلانے سے عار نہ ہوگا۔

یہ جھنڈا وحدت کا ہے یہاں دوئی نہیں
سوائے یہاں کے اور کہیں یکسوئی نہیں

کوئی ہے جو حسن نظامی کی طرح اس حکم پر ایمان لائے۔ اور بھنگی چماروں کے ساتھ کھانا کھانے پر آمادہ ہو جائے۔ جس کو انکار ہوگا قہر خدا کا سزاوار ہوگا۔ زمین اس کو نگل جائے گی۔ دولت اس کی چھن جائے گی۔ عزت اس کی مٹ جائے گی۔ دربدر رسوا ہوگا۔ پھر بعد کے پچھتانے سے کیا ہوگا۔

کہہ دو انسان کا جسم گندہ نہیں۔ اگر ظاہری ناپاکی نہ ہو تو ہر ولد آدم پاک ہے۔ شاہ و گدا مساوی بحکم شبہ لولاک ہے۔ غریب کے آگے جھکو۔ متکبر امیر کے سامنے اکڑ دو۔ ٹوٹے دل کو جوڑ دو۔ سنگین دل کو توڑ دو۔

جب غریبوں کا یہ آسرا پیدا ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا مسلمانوں کے تمدن۔ سیاست وغیرہ میں انقلابی مزہ آئے گا۔ اور اس وقت اس سوال کا جواب سمجھ میں آجائے گا کہ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ جب علم سبز کے نیچے کا ہر بہادر بتائے گا کہ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔

شذرات

ہماری بُری نیکیاں

یہ طرزِ احسان کرنے کا تمہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کرکے مریضوں کو دوا دینا

ہندوستانی بڑے مخیر ہیں۔ خیر خیرات کرنے میں ان کا درجہ بڑی بڑی دولتمند قوموں سے بڑھ گیا ہے۔ مگر ان کی یہ نیکیاں بعض اوقات برائیوں سے بڑھ جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندو چڑیماروں کو دام دیکر پرندوں کو آزادی دلایا کرتے ہیں۔ ظاہر ہیں یہ بڑا نیک کام ہے کہ بے زبان جانور ظالم صیاد کے پنجے سے رہائی پاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت جانوروں پر ظلم کرانے کا اور چڑیماروں کو جانوروں کو گرفتار کرنے کا اس سے زیادہ کوئی رغبت دلانے والا سبب نہیں ہوسکتا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ہماری ستمگاری کی "نقد داد" ملتی ہے تو وہ اور زیادہ محنت وجستجو سے اپنی سفاکیوں کا سلسلہ دراز کرتے ہیں ۔

اسی طرح موٹے مسٹنڈے بھک منگوں کو خیرات دینا بیکار رہتا ہے ملک میں گداگروں کی تعداد بڑھانے کے ذمہ دار زیادہ تر یہی نیک لوگ ہیں جو پہلے لوگوں کو بیمار کرتے ہیں پھر دوا تقسیم کرنے کھڑے ہوتے ہیں ۔

ایسی بری نیکیوں کا انسداد لیڈران ملک کو سلیف گورنمنٹ کے حصول سے زیادہ ضروری ہے مگر ہم کو لیڈروں کے بھروسہ پر نہ رہنا چاہئے۔ جس ملک میں فرض ادا کرنے والے لیڈر نہ ہوں اُس کو ہر باشندہ اپنے ذاتی فرائض کا دھیان

ہے۔ لہٰذا ہندوستانیوں کو اس خیرات ناجائز کی رسم پر نظر ثانی اور زبان و قلم کو حرکت میں لاکر حق العباد کے بارے سبکدوش ہونا چاہیئے۔

صبا نے کلیوں کو جگایا

کل صبح باغ میں سوتی کلیوں کو صبا جگاتی تھی۔ شانہ ہلاتی تھی۔ یہاں تک کہ گدگدیاں کر کر کے ہنساتی تھی۔ یہ جگانے کا نرالا انداز دیکھکر میں نے اُس سے کہا تو بڑی ظلمنار ہے۔ برگ گل رخسار پر سر رکھ کے بولی۔ تم سیکھو کہ بچوں کو یوں پرورش کیا کرتے ہیں۔ یہ برتاؤ ہوگا تو ہر طفل غنچے کی طرح کھلے گا۔

میں اپنی نیند خراب کرکے پہلے بیدار ہوئی۔ جنگلوں، پہاڑوں کی تازگی جھنی دامنوں میں بھرتی یہاں آئی۔ تب ان کلیوں کی خدمت بجا لائی۔ تم خود سورج نکلنے کے بعد تک سوتے رہتے ہو۔ تو بچوں کی تروتازگی کہاں سے آئے گی۔

شمع کا قدِ زیبا

حضرت اکبر کی میز پر موی شمع گورے سنتری کی طرح تنی کھڑی تھی۔ اس کا قدِ زیبا سر سے پاؤں تک سڈول ہناجی کو بھاگیا۔ چکنی چپڑی صورت پر دل آگیا۔ چاہتا تھا کہ اس مس خاموش کو گویا کردوں اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اُس کے سر پر شعلے کا تاج رکھ دیا۔ آہاہا۔ عالم ہی بدل گیا۔ کلاہ نور میں شمع پیاری کی شکل کیسی دلفریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اُڑ اُڑ کر کمرے میں آنے لگے۔

میرا لطفِ دید ختم نہ ہوا تھا کہ جناب اکبر کا شعر کان کی راہ آنکھوں میں سما گیا ؎

زینت مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں   سب شمع کو جلاتے ہیں سانچہ میں ڈھال کے

صورت شمع کی حالت القائی نے شمع کو بھی رُلا دیا۔ آنسو بہا کر بولی دنیا کی زینت چاہنے والے میرے جلاپے کی مصیبت کو دیکھیں۔ قدر رعنائی زیبائش کے ہاتھوں مٹا جاتا ہے نہ ظاہری ٹیپ ٹاپ ہوتی نہ یہ وقت پیش آتا +

تغیرِ فطرت کا سبب

فطرت ہر وقت تبدیلی و تغیر میں مصروف رہتی ہے۔ انسان کے ذرات جسم و حواس کو دیکھو وہ بھی سکنڈ سکنڈ میں بدلتے رہتے ہیں۔ پوچھا اس کا سبب؛ ہوش نے جواب دیا ہستی مطلق کے گوش تک رسائی پانے کے لیے رنگارنگ طریقے بدلے جاتے ہیں۔ مگر وہاں ایسے پُر حجاب پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس طرح پہنچ نہیں ہوتی۔ بقول اکبر ؎

نہیں پاتی نہیں پاتی رسائی گوشِ جاناں تک
بدلتی ہے طریقہ سو طرح میری خبر اپنا

دُنیا میں دُکھ سُکھ کی تبدیلیاں بھی اسی اُصول کی ماتحت ہیں۔ جو ان تغیرات سے دل برداشتہ نہیں ہوتے اور عبادت رب میں مصروف رہتے ہیں اُن کی خبر گوشِ جاناں تک بلا ترود پہنچ جاتی ہے +

جرمنی کا فلسفہ کائنات

ڈاکٹر ہیگل جرمنی کا مشہور فلاسفر ہے۔ جس کی فلاسفی جرمنی درسگاہوں میں رائج ہے اہل جرمن اسکو افلاطون سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر اقبال باعتبار تخیل کے ہیگل افلاطون سے یقیناً بڑا ہے +

ہیگل موجودات عالم کی ہستی محدود کی زندگانی اصول متناقض میں مضمر بتاتا ہے اور

کہتا ہے کہ کائنات کے تمام محدود وجود آپس میں کٹتے مرتے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہوئے ایک دن ہستی مطلق میں مل جاتے ہیں۔ جب تک ہستی میں ترکیب متناقض موجود ہے کش مکش لازمی ہے۔

اہل جرمنی ہیگل کے اس فلسفہ پر ناز سے کہتے ہیں۔ جو ضخیم کتابوں میں قلمبند کیا گیا ہے مگر ہندوستان میں اس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ ذوق مرحوم نے ایک شعر میں اسی کے قریب ایک مضمون لکھا تھا کہ اس جہان کو اختلاف سے زیب ہے مگر حضرت اکبر الہ آبادی نے تو ہیگل کے سارے سمندر کو اس طرح اس شعر میں بند کیا ہے جیسے انگریزی بیڑے نے جرمنی بیڑے کو نہر کیل میں کیل رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

جرمن والوں کو معلوم ہو کہ ہند میں ہمارا فلسفہ مفتوح ہو چکا ہے تو اُن کی حرص فتوحی شکست ہو جائے۔ حضرت اکبر کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو گا کہ جو شعر ان کے قلم سے بیساختہ نکلا ہے اُس پر جرمنی کی تمام ساخت پر داخت منحصر ہے اُنہوں نے اس شعر میں روح و مادہ اور ان کے تمام لوازمات کو کس آسانی سے ادا کر دیا ہے۔

ہندوؤں کے مہابھارت کے وقت سری کرشن جی نے جو فلسفیانہ لکچر ارجن کو سنایا تھا اور جو اب گیتا کے نام سے ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں شامل ہے۔ ہیگل کے اس فلسفہ سے کہیں زیادہ لطیف و پر معانی ہے۔

مسلمانوں کے فلسفہ تصوف کو دیکھا جائے تو اس کے جزئیات میں ہیگل کے گلیلے بکھرے ہوئے ملیں گے۔ تشبیہ و تنزیہ کے اشارات میں محدود پیکروں کو وجود مطلق کے جلوے علانیہ نظر آ جائیں گے۔

اس میں شک نہیں محدود ہستیوں کی باہمی کش مکش فطرت و نیچر کے حکم سے ہے

جہاں زہر پیدا ہوتا ہے وہیں تریاق بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ گرمی و سردی، خشکی و تری، نیکی و بدی، نور و ظلمت، جڑواں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت نے دنیا کو دار الامتحان بنایا ہے۔ جہاں سلیم الفطرت انسانوں کو آزمایش کے بعد منتخب کیا جاتا ہے۔ پس ہستی مطلق کے دربار میں مقبولیت ان ہی کی ہے جو نیچر کی مقررہ حد توازن سے آگے نہیں بڑھتے اور اس توازن کو تقدیر الٰہی سمجھکر مصائب پر صبر اور تعیش پر شکر کرتے ہیں۔ ان کا قدم ظلم و زیادتی کی جانب جنبش نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ہستی مطلق کے آداب و سامان کا عرفان رکھتے ہیں ۔

آرام کہاں ہے؟

نئی روشنی اور پرانی روشنی بحث کر رہی ہے کہ انسان کی آسایش و راحت خودی میں ہے یا بیخودی میں؟ ایک فریق کہتا ہے۔ خودی مٹانے کا عقیدہ عیش زندگانی کا دشمن ہے۔ دوسرا بیان کرتا ہے زندگی حقیقی کامرانی خودی میں میسر نہیں آسکتی ۔

یہ کیسی مشکل بات ہے یہ لوگ تو آپس میں علم کے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ اور بے علم جینے کے مزے کو کھڑے ترستے ہیں۔ ان کے لیے حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب مثال ارشاد فرمائی کہ نیند دن بھر کی محنت کے ذریعۂ آرام ہے۔ مگر اس آرام میں آدمی کی خودی باقی نہیں رہتی جب بے خود ہوتا ہے تو آرام پاتا ہے ۔

روح و اجل کے دامن

موت و حیات دیکھنے اور کہنے میں دو اور حقیقت میں ایک ذات ہیں۔ کیونکہ ذات واحد کی فرستادہ ہیں۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور حیات پر مرتے ہیں۔ اُن پر

چنگل مارتی اور حیات اُن سے دامن بچاتی ہے۔ اور جن کو خدا سے سروکار ہے جو خالق لیل و نہار ہے اُن کے لیے اجل کے دامنوں میں حیات بستر بچھاتی ہے اور جب وقت موعود آتا ہے روح رواں بستر اُٹھا کر روانہ ہو جاتی ہے اور اجل اپنے خالی دامن کو جھاڑتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو مرنے میں اذیت نہیں ہوتی۔ اور وہ اجل کے ضرر یورش سے محفوظ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے ؎

(اکبر)

برباد کیا اجل نے ہم کو کیا یہ کہیے ۔۔۔ روح رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

موج پر کائی نہیں جمتی

بند پانی اور بہتے دریا کی جنس ایک ہے۔ شکل ایک ہے۔ ظاہر ایک ہے۔ باطن ایک ہے مگر آب مقید پر کائی چھا جاتی ہے۔ اور موج رواں ہمیشہ سورج سے آنکھ لڑاتی ہے۔ اسی طرح جو آدمی کچھ کام نہیں کرتے تو اُن کی لیاقتیں دل کے دل ہی میں ارمانوں کو مسوس کر مر جاتی ہیں اور جو دین دُنیا کے مشاغل میں رواں دواں رہتے ہیں وہ اوج فلک پر سورج بنکر چمکتے ہیں +

میں نہیں ڈوبا

طوفان کشتیوں اور جہازوں کو ڈبوتا ڈبوتا مجھ تک آیا۔ میں ایک بلبلا تھا۔ اور پانی میں تیر رہا تھا۔ اُس نے چاہا مجھ پر حملہ کرے۔ اور وہ کف منہ میں لیکر میری جانب بڑھا۔ مگر میں اطمینان سے اُس کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ پانی نے میری خودی کی ہوا کو شکست دی۔ ہوا فرار ہوئی اور میں پانی ہو گیا۔ طوفان سر پر آیا تو مجھ کو نہ پایا۔ بہت گھبرایا۔ آخر کسی نے سُنایا خودی کے متوالے ڈوبتے ہیں

حباب بے خود ہو گیا۔ اب تو اُسکو کہاں پا سکتا ہے۔ دُنیا کے رہنے والے اس مثال کو سُنکر اپنے حریفوں سے مطمئن ہوتے۔ اور اُنہوں نے بھی اپنے اندر کی ہوائے نفسانی کو نکالنا شروع کر دیا۔ اُس وقت میں سمجھا کہ میں اخبار کے دریا میں غرق نہیں ہوا۔ لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا ⁂

کچی نیند کی آنکھیں

ان کی عمر جوانی کی تھی۔ یہ بیداری میں خام تھے۔ نیند کی غفلت میں پختگی کے سوا انکی ہر ادا کچی تھی۔ سوتے میں انہوں نے کیا پی لیا ہے۔ آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مگر نشہ سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ دیکھنا ڈیلوں کی سفیدی سُرخی کیسی نشیلی ہے اور پلکیں کیسی بے قابو ہو ہو کر لڑکھڑا رہی ہیں۔ پتلی کی بے قراری پردہ کے اندر کی چھپی باتوں کو رُک رُک کر کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان یاری نہیں دیتی ⁂

ذرا پوچھنا۔ تم کو عورتوں کی تعلیم و بے پردگی کی بھی کچھ خبر ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کو آزاد و بے باک بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کچی نیند کی آنکھیں خود صورت مثال اور زبان حال ہیں۔ مرد مکمل ہو جاتے۔ گویا نیند پوری ہو جاتی۔ اُس وقت عورتوں کو جگایا جاتا۔ وہ بے جاریاں پہلے ہی کچی ذات ہیں کچی نیند میں اُٹھائی جائیں گی تو خود بھی گرینگی دوسروں کو بھی گرائیں گی ⁂

عالمِ اسباب

یہ دُنیا عالمِ اسباب مشہور ہے۔ اس میں ہر چیز دوسری چیز کی ماتحت و محتاج بنائی گئی ہے ⁂

صرف انسانوں پر نظر کی جائے تو ہر فرد دوسرے کا دست نگر معلوم ہوگا۔ جس طرح

ایک مفلس و غریب آدمی دولتمندوں کا محتاج ہے۔ اسی طرح دولت والے غریبوں کی امداد کے ضرورت مند ہیں۔ خواہ کیسا ہی بڑا فاتح خود مختار شہنشاہ ہو اپنے نوکروں اور ماتحتوں کی مدد بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اس کی عزت اور نامدی گمناموں کے عمل پر منحصر ہے +

اس سلسلہ ضروریات کی باہم وابستگی اور ایک دوسرے کی احتیاط قدرت کا بہت بڑا راز ہے۔ یہ نہ ہو تو مخلوق میں خالق کی ہمسری و خودی پیدا ہو جائے۔ جب مغرور ہستیاں عالم اسباب کی مجبوریوں سے کمتر ہستیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں تو خودی و نخوت کے نشے ہرن ہو جاتے ہیں +

مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو شرکت ناپسند ہے۔ آثار نیچر میں بھی نظر آتا ہے کہ انسان و حیوان شرکت غیر سے گھبراتے ہیں۔ اس واسطے قدرت نے نہایت لطافت و باریکی سے ہر وجود کا سلسلہ دوسرے وجود کے ساتھ اس ترکیب سے ملایا ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر ہستی اپنے کام میں آزاد ہو جائے اور شرکت کی تکلیف میں مبتلا نہ رہے۔ پس اگرچہ کائنات میں اشیار باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں لیکن ادائے حقوق کے بعد ان کو آزادی ملنی لازمی ہے +
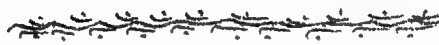
آخری دستخط

میرے مضامین کا پہلا حصّہ پُورا ہوگیا اور مجھ سے آخری دستخط مانگے جاتے ہیں اور میں یہ سطریں لکھکر دستخط کرتا ہوں*

چار برس سے زیادہ کا ذکر ہے، میرے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ایک جسمِ معطل تھا۔ اس کے سر پیر نہ تھے۔ آنکھیں کانوں کی جگہ اور کان ناک کے مقام پر، اور ناک زبان کے موقعہ پر چسپاں تھی، نہ کوئی ترتیب تھی، نہ موزوں قرینہ تھا کیونکہ اس مجموعہ کا مرتب کرنیوالا میں خود اور چند احباب تھے۔ کچھ ہماری ناقابلیت۔ کچھ مضامین کا ایک وقت میں نہ ملنا۔ اس خرابی کی وجہ سمجھنی چاہیئے۔ دوستوں کو جہاں کوئی کہیں مضمون ملا اُنہوں نے کاپی نویس کو دیدیا۔ تقدیم تاخیر، موزوں۔ غیر موزوں کا خیال نہ کیا۔ اسپر بھی صدہا مضامین رہ گئے اور وہ اخبار و رسایل نہ مل سکے جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے، خود میرے ہاں ایک بوری ایسے اخبارات و رسائل کی غلطی سے ردی میں چلی گئی جن میں میرے مضامین تھے اور اُن کو ترتیب مجموعہ کے خیال سے جمع کیا گیا تھا*

باوجود ایسی بے ترتیبی اور بے سلیقگی کے یہ مجموعہ لوگوں نے پسند کیا اور دو برس کے اندر (غالباً) دو ہزار جلدیں فروخت ہوگئیں اور مانگ باقی رہی لیکن اس طلب کا جواب موجود نہ رہا*

اسیوقت تھا کہ اخبار توحید کی ضبطی نے ہندوستان میں میرے مضامین کا شوق بڑھا دیا تھا، کیونکہ میں نے اخبارات و رسائل میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ خلقت کے مضطربانہ اشتیاق کو دیکھکر اخبار توحید کے مالک شیخ محمد احسان الحق قادری میرٹھی نے توحید کے پرچوں سے میرے مضامین اخذ کیے اور اُن کا ایک مجموعہ چھاپ دیا۔ یہ مجموعہ صرف توحید کی

مضامین کا تھا، تاہم ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اسکی ترتیب پبلک کو بہت پسند آئی۔
حقیقت میں انتخاب توحید کی ترتیب تھی بھی ایسی باقاعدہ کہ خواہ مخواہ اچھی معلوم ہوتی تھی، اس تجربہ سے بھیا احسان کو جرأت ہوئی اور اُنھوں نے اُسی وقت سے تمام اخبارات و رسائل سے میرے مضامین جمع کرنے شروع کیے اور اُن کی ترتیب سے ابواب مقرر کر دیے اسی اثنا میں ملک دکن کے محکمۂ تعلیم نے اسکول کے بچوں کے واسطے میرا پہلا مجموعہ منظور کیا اور اس کی خریداری کی باضابطہ اطلاع مجھ کو دی، لیکن میں اس کی تعمیل کیونکر کر سکتا میرے پاس تو ایک کتاب سے زیادہ دوسری نہ تھی ۔

یہ معلوم کر کے بھیا احسان نے جلدی مجموعۂ مضامین کا پہلا حصہ مرتب کر کے محمد انوار ہاشمی کے عصر جدید پریس میرٹھ میں چھپوا دیا اور مُلا محمد الواحدی کے درویش پریس میں اسکا ٹائیٹل چھپوا کر کتاب پوری کر دی ۔

اس مجموعہ میں انتخاب توحید اور سابقہ مجموعہ سے اقتباس کیا گیا۔ جو مضامین موجودہ جنگ کے سبب خلافِ مصلحت تھے اُن کو حذف کر دیا، اس کے بعد اخباروں اور رسالوں کے جدید مضامین بھی لیے۔ برادرم شیخ محمد احسان الحق صاحب نے اسکی ترتیب اور عزیز قلبی محمد انوار ہاشمی نے لکھائی، چھپائی اور تصحیح میں بہت محنت کی ہے اور محض اخلاص و محبت کی بنا پر مہینوں کی دردسری اُٹھائی ہے۔ اسکا میں شکریہ تو کیا ادا کروں، محبت کے کوچہ میں یہ رسم منع ہے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور خداتعالیٰ کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھ کو ایسے بے غرض مخلص دیے ۔

عزیزم مُلا محمد الواحدی اڈیٹر رسالہ نظام المشائخ و اخبار خطیب دہلی نے اس مجموعہ پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نئی طرز کا ریویو ہے، اُمید ہے کہ اس دیباچہ کو دلچسپی سے پڑھا جائیگا میں واحدی صاحب کا بھی احسانمند نہیں ہوں، اُنھوں نے بھی حقِ تعلق ادا کیا ۔

دوسرا دیباچہ ملک کے شہرۂ آفاق انشا پرداز اور اُردو ادب کے عملی خدمتگزار جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو اور افسر تحت محکمۂ تعلیمات دکن کا ہو

مولانا نے علم دوستی اور اُردو زبان کے ذوق سلیم کی بنا پر ان مضامین کی داد دی ہے خدا اُن کو داد دیگا کہ اُنہوں نے ترقی اُردو کے مقاصد کو ملحوظ رکھکر میری حوصلہ افزائی میں مبالغہ کیا ہے +

برادر طریقت مولوی سید غلام بھیک صاحب فقیر اللہ شاہ نظامی بی۔اے۔ وکیل انبالہ جو میر نیرنگ کے تخلص سے ادیبوں میں شہرت عام رکھتے ہیں سابقہ مجموعہ پر اُنہوں نے ایک دیباچہ لکھا تھا وہ بھی بھیّا احسان نے اس مجموعہ میں داخل کر دیا ہے +

اپنی رائے

دیباچہ نویسوں نے تو ان مضامین پر رائے زنی کر دی اب میں خود اپنی رائے کے دو لفظ لکھکر آخری دستخط کرتا ہوں +

دلی میں رہنے والے کا یہ کچھ کمال نہیں ہے کہ اُس نے اُردو زبان میں اپنے خیالات کو صفائی سے ادا کر دیا۔ اس واسطے میں ان مضامین کی زبان پر تعریفی الفاظ لکھنے نہیں چاہتا۔ البتہ اپنے ذہن اور تصور کی ستایش کرتا ہوں جس نے میرے قلم سے اُن تخیلات کو کاغذ پر نمایاں کرا دیا۔ اور یہ ستایش خودی کے ذہن اور تصور کی نہیں ہے بلکہ خالق ذہن و تصور کی تعریف ہے، وہ نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا اور میرا ذہن و تصور بھی نہ ہوتا۔ وہ تھا ہے۔ رہیگا۔ میرا وجود بھی ہوا اور اُس نے جذبات کو مجسّم کر کے دکھا دیا +

مَیں ذکر کرتا ہوں، خدا نے مجھے بڑی نعمت دی ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مجھ پر لازم گردانا ہے۔ ان مضامین میں بعض اشارہ رہ ہیں جن کو نہ خود میں سمجھا نہ اُمید ہے کہ آجکل کوئی سمجھ سکیگا۔ لیکن قلم نے کسی طاقت سے متاثر ہو کر ان کو لکھا ہے لہذا وقت آئیگا کہ ان کے سمجھنے والے پیدا ہوں وہ سمجھ لیں گے تو میری اپنی اس رائے کی قدر کرینگے اور ان آخری دستخطوں کا مطلب جان جائینگے جو مَیں نے خاص اپنی روش تحریر دکھانے کو اپنے قلم سے لکھے ہیں +

حسن نظامی

جکھ اشاعت

یہ مجموعہ مضامین پہلے ۲۰-۲۶ سایز پر شائع ہوا تھا۔ پھر دوسری بار
۲۰-۳۰ سایز پر چھپا۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ [illegible] میلا گیا
گویا تیسری اشاعت کے وقت سے اس کی یہی تقطیع ہوگئی جو موجودہ اشا
کی ہے +

گذشتہ اشاعت میں کاغذ بہت ہلکا تھا مگر اس دفعہ کاغذ اچھا لگا
گیا ہے +

دوسرا اضافہ یہ ہے کہ ٹائٹل رنگین تیار کیا ہے۔ اس کی موجودہ ضخامت
چار سو صفحہ کی ہے۔ گویا ۲۵ جز ہیں۔ اور خواجہ صاحب کی کتابیں دو آنے
کے حساب سے فروخت ہوتی ہیں۔ لہٰذا ۲۵ جز کی قیمت دو روپے دس آ
ہونی چاہیئے۔ مگر خواجہ صاحب اس کتاب کی قیمت زیادہ کرنے کی اجاز
نہیں دیتے کیونکہ یہ کتاب پنجاب کے اُردو آنرز کے امتحان میں شریک
ہے۔ زیادہ قیمت طلبہ برداشت نہ کرسکیں گے۔ اس واسطے قیمت کی
کمی کا نقصان ہم خود برداشت کرتے ہیں خریداروں کے ذمہ نہیں ڈالتے

راقم ابن عربی

کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی

یکم جنوری ۱۹۲۵ء

(اندر کی کتاب منشی قربان علی صاحب کے شاہجہانی پریس دہلی میں چھپی)